مقالاتِ حمیدُاللہؒ

اسلامی تاریخ و ثقافت پر ڈاکٹر حمیدُاللہ کے
پُر مغز مقالات کا مجموعہ

مرتبہ

زیبا افتخار

قرطاس

مقالاتِ حمید اللہ

(اسلامی تاریخ اور ثقافت پر ڈاکٹر حمید اللہ کے پُر مغز مقالات کا مجموعہ)

مرتبہ

زیبا افتخار

قرطاس

قرطاس
سلسلہ مطبوعات ۴۴
بار اول، جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ/ جولائی ۲۰۰۴ء

قیمت مجلد: -/۲۵۰ روپے
غیر مجلد: -/۲۲۰ روپے

زیر اہتمام

قرطاس

پوسٹ بکس نمبر 8453، کراچی یونیورسٹی،
کراچی-75270
فون/فیکس: 9243966
موبائل: 0300-9245853

ISBN :
969-8448-56-X

انتساب

ڈاکٹر حمید اللہ

کے نام

جنہوں نے اسلامی تاریخ کو اعتبار بخشا

زیبا افتخار

فالخیل و اللیل و البیداء تعرفنی
والسیف و الرمح و القرطاس و القلم

(المتنبی)

(اور گھوڑے اور رات اور صحرا مجھے جانتے ہیں
اور تلوار اور نیزہ اور کاغذ و قلم)

ترتیب مقالات

تفصیلات نقشہ جات:

مقدمہ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایسی ہمہ جہت شخصیت تھے جنہوں نے کئی علوم پر علمی سرمایہ چھوڑا ہے، ان کا اصل میدان تو قانون بین الممالک (International Law) تھا اور اسی پر انہوں نے تخصص (Specialization) حاصل کیا تھا۔ لہٰذا اسلامی قانون کی تاریخ پڑھنے والوں کے لئے ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیقات سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اسی طرح حدیث میں صحیفہ ہمام ابن منبہ کی تصحیح وتفسیر کا ایسا کام ہے کہ روائتی معنوں میں محدث نہ ہونے کے باوجود علمِ حدیث کی تاریخ مرتب کرنے والے اب آپ کے کام کو نظر انداز نہ کرسکیں گے۔ بعینہ سیرت اور اسلامی تاریخ پر آپ نے ایسا علمی سرمایہ چھوڑا ہے جس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا، خواہ البلاذری کی ''انساب الاشراف'' اور ابن اسحاق کی ''سیرۃ'' کی ایڈیٹنگ کا معاملہ ہو، یا ''عہد نبوی کی جنگیں'' اور ''اسلامی ریاست'' جیسی کتابوں کی تصنیف کا معاملہ ہو یا ''کتاب المحبر'' جیسی کتب کے تراجم کا معاملہ ہو، آپ کے قلم نے ایک سچے اور دیانت دار محقق ہونے کا حق ادا کیا ہے۔

مجھے ڈاکٹر حمید اللہ کی ان شاندار علمی فتوحات کا علم اس وقت ہوا جب میں نے جامعہ کراچی سے ایم۔فل/ پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ کی درخواست دی، ڈاکٹر حمید اللہ کا انتقال دسمبر ۲۰۰۲ء میں ہوا تھا اوران دنوں اخبارات ورسائل میں آئے دن ان پر کوئی نہ کوئی تحریر نظر آجاتی تھی۔ شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی میں بھی ان پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جہاں فاضل مقررین نے اس گنجائش کی طرف اشارا کیا تھا کہ ڈاکٹر حمید اللہ کے کثیرالجہتی (Multi dimentional) کام پر پی ایچ۔ڈی کی سطح کے ایک سے زائد تحقیقی مقالے تحریر کئے جاسکتے ہیں۔ چونکہ میں اسلامی تاریخ کی طالبہ ہوں لہٰذا میں نے ڈاکٹر حمید اللہ کی تاریخ نویسی پر کام کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس سلسلہ میں میں نے جتنا مواد اکٹھا کیا، اور جس قدر مطالعہ کرتی گئی، اسی قدر ان کی علمی فتوحات سے آگاہی حاصل ہوتی رہی ایک سال تک مسلسل انہیں پڑھنے کے بعد اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو علمی دنیا میں چار ایسے امتیازات حاصل تھے، جو ان کے بیشتر ہم عصروں کو حاصل نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا علمی قد اپنے دیگر معاصرین سے بلند تھا۔

ان کا ایک امتیاز تو ان کی زبان دانی تھی۔ اس سلسلے میں انہیں ع
زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم، جیسا کوئی عجز لاحق نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کم ازکم نو زبانوں کے ماہر تھے، مشرقی زبانوں میں سے، اردو تو ان کی مادری زبان تھی، اس کے علاوہ فارسی، عربی، روسی اور ترکی اور مغربی زبانوں میں سے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور اطالوی زبانوں پر آپ کو دست رس حاصل تھی، ان زبانوں میں آپ نے مقالات بھی تحریر کئے اور بہت سا مواد اردو یا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا، (ذاتی طور پر آپ انگریزی کو تاجروں کی غیر علمی زبان کہا کرتے تھے اس کے مقابلے میں فرانسیسی اور جرمنی کو علمی زبان تسلیم کرتے تھے)۔ وہ فرانسیسی زبان پر عبور رکھتے تھے اس زبان میں انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا اور سیرۃ طیبہ پر دو جلدوں میں کتاب بھی تحریر

کی اس کے علاوہ فرانسیسی زبان میں اسلام کو متعارف کرانے کا جو کام آپ نے کیا، اردو اور انگریزی دان طبقوں کو تو آپ کی ان علمی و تحقیقاتی کاوشوں سے ابھی پوری طرح آگاہی بھی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

اتنی زبانوں سے واقفیت کا جو راست فائدہ ڈاکٹر صاحب کو ملا وہ یہ کہ ان زبانوں میں موجود اسلامی علوم کا سرمایہ ان کی دسترس میں آ گیا۔ اور وہ اس علمی عجز کا شکار ہونے سے بچ گئے جس میں آج بیشتر اہل علم طبقہ گرفتار نظر آتا ہے۔

اس کا ایک اور بڑا فائدہ ڈاکٹر صاحب کو یہ پہنچا کہ آٹھ، نو زبانوں کے علمی ذخائر کو حاصل کرنے، جذب کرنے، اور تقابل کرنے میں آپ اس طرح مصروف ہو گئے کہ اختلافی مسائل کی طرف توجہ دینے کی آپ کے پاس فرصت ہی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ شیعہ، سنی، حنفی، مالکی یا بریلوی اور دیوبندی، کی غیر مفید بحث میں پڑنے سے بچ گئے۔ گویا ایک طرف تو وہ مسلمانوں کے مختلف مسالک و مذاہب کے مابین، نزاعی اور اختلافی معاملات میں الجھنے سے بچے دوسری طرف مسلم اور غیر مسلموں کے اختلافی مسائل میں بھی ان کا رویہ معتدل اور روادارانہ رہا، وہ اپنی وسعت علمی اور مطالعہ کے باوجود اپنے نظریات و خیالات کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، اسی لئے ان کا انداز مناظرانہ یا جارحانہ نہیں تھا، شائد اسی لئے ان کے ہاتھ پر فرانس کے تیس ہزار افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔

آپ کی اس زبان دانی کا تیسرا فائدہ اہل مغرب کو پہنچا، ڈاکٹر صاحب نے اہل مغرب کو اسلامی تعلیمات انہیں کی زبان میں پہنچائیں، انہی کی زبانوں میں مقالات تحریر کئے، انہی کی زبانوں میں، انہی کی جامعات میں توسیعی خطبات دیئے، اور اسلام کی حقیقی تصویر پیش کی۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اندازِ تحقیق روائتی نہیں تھا، ڈاکٹر صاحب نصف صدی سے زائد عرصہ یورپ کے قلب، پیرس میں بیٹھ کر ان علمی حملوں

کے بھرپور علمی جوابات دیتے رہے جو مختلف سطحوں اور مختلف اطراف سے اسلام، اسلامی تاریخ وثقافت پر ہوتے تھے، ایسے میں آپ کا انداز روائتی ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس سلسلہ میں آپ نے استدلال اور تقابلی تجزیہ سے بھرپور کام لیا، نہ تو اپنی تحریروں میں آپ مجھے مغرب سے مرعوب نظر آتے ہیں اور نہ ہی اپنی طرزِ تحقیق میں کسی کے مقلد، میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتی ہوں کہ ان کی فکر اور تحریر مغربی فکر وتحریر سے متاثر نہیں ہے۔ دوسری طرف ان کا انداز کسی دینی درسگاہ کے فاضل استاد جیسا بھی نہیں ہے جس میں اساسیات دین پر گہرا اعتقادی رنگ غالب ہوتا ہے۔

آپ کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ آپ کا کام یک جہتی (Uni dimen-tional) نہیں تھا بلکہ کثیر جہتی (Multi dimentional) تھا۔ تخصص (Speciali-zation) کے اس دور میں خواہ سائنس کا معاملہ ہو یا سماجی علوم کا، ماہرین علم وفن کا اپنا ایک مخصوص میدان (Field of Specialization) ہوتا ہے۔ جس میں مسلسل و متواتر تحقیق کر کے وہ اپنا لوہا منواتے ہیں، جبکہ ڈاکٹر صاحب نے انتہائی متنوع کام کر کے مختلف میدانوں میں اپنا لوہا منوایا ہے اسلامی علوم وفنون کا شائد ہی کوئی ایسا گوشہ رہا ہوگا جس میں ڈاکٹر صاحب نے انتہائی فاضلانہ، عالمانہ اور عمیق تحقیق کے نتائج دنیائے اسلام کے سامنے پیش نہ کئے ہوں۔ لہٰذا جو متنوع علمی و تحقیقی تصنیفات ڈاکٹر حمید اللہ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں، وہ کسی دوسرے عالم یا محقق کے یہاں نہیں ملتیں، وہ بیک وقت قرآن، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ، سیرت، ادب، تقابلِ ادیان اور قانون بین الممالک کے موضوعات پر متعدد تحقیقی کتب کے مصنف، مترجم، مرتب یا مصحح (ایڈیٹر) ہیں، ہر میدان میں آپ نے تحقیق کے ذریعہ گرانقدر اضافے کئے ہیں۔ بعض مروجہ شکوک کو رفع کیا ہے، اور بعض نئی دریافتوں کی بنیاد رکھی ہے۔

میرے نزدیک ان کی چوتھی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے عہد حاضر کے مسلمانوں کو پیغام دیا ہے کہ کام کس طرح کرنا چاہیے؟ خصوصاً

علمی لوگوں کو زندگی کس طرح گزارنی چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے نصف صدی سے زائد پیرس کو اپنا مستقر بنایا، جس چیز نے انہیں پیرس میں روکے رکھا وہ وہاں کی قومی لائبریری تھی، جہاں بقول ڈاکٹر صاحب اسلامیات پر مختلف زبانوں میں کتابوں کا ایسا شاندار ذخیرہ ہے، جو دنیا میں اور کہیں نہیں، اس وقت بین الاقوامی صورتِ حال یہ تھی کہ مراکش، الجزائر، اور تیونس کے مسلمان فرانس کے خلاف جنگِ آزادی لڑ رہے تھے اور اس سلسلہ میں لازوال قربانیاں پیش کر رہے تھے۔ فرانس کی بربریت اور ریاستی دہشت گردی کے اس تناظر میں، ڈاکٹر صاحب ہمہ تن اپنے کام جتے ہوئے تھے، فرانسیسی حکومت سے وظیفہ حاصل کرتے تھے، اپنی ذات پر کم سے کم اور انفاق فی سبیل اللہ کی مد میں زیادہ سے زیادہ خرچ کر دیتے تھے۔ تلوار کے مقابلے میں ان کا رشتہ قلم سے استوار تھا۔ ایک مسلمان مجاہد جب کسی کافر یا مشرک کو قتل کرتا ہے تو وہ (یعنی کافر یا مشرک) جہنم واصل ہوتا ہے اور مسلمان مجاہد گویا جنت کا حقدار بن جاتا ہے لیکن ایک مسلمان معلم جب اپنی کوشش سے کسی کافر یا مشرک کے قلب و روح کو مسخر کر کے مشرف بہ اسلام کرتا ہے تو دونوں ہی نجات کے راستے پر چل نکلتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مجاہد کی تلوار سے زیادہ مقدس معلم کا قلم ہے اور اس کے قلم کی سیاہی کو، مجاہد کے خون کے قطرے سے زیادہ تقدس حاصل ہے...... ڈاکٹر حمید اللہ نے علمی مشاغل میں مصروف لوگوں کو یہ منہاج دیا اور یہ انہیں کی خصوصیت ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے بارے میں ان گزارشات کے بعد اب جہاں تک زیرِ نظر مجموعہ مقالات کا تعلق ہے تو یہ ڈاکٹر صاحب کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو اسلامی تاریخ و ثقافت سے متعلق ہیں، اور ان میں سے بیشتر پاکستان میں شائع بھی نہیں ہوئے۔ یوں دیکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب کے سینکڑوں مقالات مختلف زبانوں

میں دنیا کے اہم علمی مجلات میں شائع شدہ صورت میں موجود ہیں۔ دیگر زبانوں سے قطع نظر اردو زبان میں لکھے گئے مقالات کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ اس طویل فہرست میں سے میں نے ان مقالات کو منتخب کیا ہے۔ جن کا موضوع اسلامی تاریخ و ثقافت ہو اور جو پاکستان سے شائع نہ ہوئے ہوں۔ ان میں سے کئی وہ مقالات بھی ہیں جو معارف، اعظم گڑھ سے شائع ہوئے۔ یا بعض ان کی مختصر کتب ہیں۔ جنہیں مقالات کی شکل میں شامل کیا جا رہا ہے۔ مثلاً ''عہد نبوی کی جنگیں''، یا ''روزہ کیوں؟'' مجھے امید ہے علمی حلقوں میں میری کوشش کی پذیرائی ہوگی۔ اور میری کوتاہیوں سے مجھے آگاہ کرنے کی زحمت اٹھائی جائے گی۔

ناچیز

زیبا افتخار

۲ جولائی ۲۰۰۴ء

اظہارِ تشکر:

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر میں ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، صدر شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی کا شکریہ ادا نہ کروں، ان کی حوصلہ افزائی اور معاونت نے میرے اس کام کو ممکن بنایا۔ میں بیدل لائبریری، شرف آباد کے لائبریرین محمد زبیر صاحب کے تعاون کے لئے بھی شکر گزار ہوں...... اور یقیناً میرے بچے اور رفیق سفر (سید افتخار احمد) بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جن کی پرخلوص رفاقت نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

زیبا

شہری مملکتِ مکہ
(۱)

"ہر زمانہ اور ہر ملک میں قدیم مصر سے لے کر جدید امریکہ تک، انسانی ذہنیت کی عظیم ترین ترقی، جدت پسندی اور کارگزاری شہری زندگی بسر کرنے والوں ہی میں نظر آتی رہی ہیں۔ جب تک لوگ چرواہوں یا کسانوں کے پیشوں پر اکتفا کرتے رہے اس وقت تک معاشی فرائض کی تقسیم کے لئے کوئی خاص ترغیب نہیں پائی جاتی تھی، اور لوگوں کی توانائیاں تمامتر غذا حاصل کرنے کی کوشش میں صرف ہوجایا کرتی تھی، جب سے "شہر" وجود میں آیا تقسیم کار بھی ہونے لگا۔ معاشی بچت کے امکانات بھی پیدا ہوگئے اور یہیں سے دولت، فرصت، تعلیم، ذہنی ترقی اور علوم و فنون کی توسیع ہونے لگی"۔[۱]

اس مقالہ [۲] کا منشاء صرف یہ ہے کہ علمی دنیا کو ایک ایسی زرخیز زمین کی تحقیق کے لئے متوجہ کیا جائے جسے اب تک بالکل ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، اسلام نے جس حیرت انگیز تیزی سے توسیع حاصل کی اور اس کے آغاز ہی میں شہری مملکت مکہ کے غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ باشندوں سے جتنے کثیر غیر معمولی طور سے قابل مدبر پیدا ہوئے وہ ایسے حقائق ہیں جن کا کچھ نہ کچھ پس منظر ہونا ناگزیر ہے، نپولین (ناپولیون) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ عرب مسلمانوں کی بہادری کا راز غالباً اس واقعہ

میں پوشیدہ تھا کہ اسلام سے پہلے ان میں بڑے طویل عرصہ سے خانہ جنگیاں ہوتی رہی تھیں، جنہوں نے ان میں بعض اوصاف پختہ کردیئے ہوں گے[۳] ۱۹۳۵ء میں سوربون (پیرس) میں ایک پبلک لکچر دیتے ہوئے میں نے یہ چیز واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ آغازِ اسلام کے وقت پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی وفاق قائم ہوچکا تھا، جس کا باعث وہاں کے سالانہ میلے اور وہاں کے کاروانوں کا نہایت ترقی یافتہ نظام خفارہ (بدرقہ) تھے، بہ ظاہر یہ معاشی وفاق نیز یہ واقعہ کہ پورے ملک میں ایک ہی بولی بولی جاتی تھی، ایک ہی طرح سے وہ فال دیکھا کرتے تھے، مختلف بتوں یا دیویاؤں کو وہ مشترکہ طور سے مانتے تھے، اور بڑی حد تک ان کے رسم و رواج بھی یکساں تھے، اس لئے ان چیزوں نے سیاسی اتحاد کے لئے بہت کچھ زمین ہموار کردی، اور جب اسلام آیا تو اس نے جزیرہ نما عرب کے مزاج میں بڑی تیزی سے ایک مرکزیت پیدا کردی۔ اب میں ایک دوسرا نظریہ اضافہ کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شہر مکہ کے باشندوں نے اپنی شہری مملکت کے لئے ایک ترقی کناں دستور، اسلام سے خاصا عرصہ قبل بنالیا تھا جس کے ذریعہ سے ان کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی کہ آئندہ اسلامی دور میں عربی شہنشاہیت کے نظم ونسق کو چلاسکیں، یہ شہنشائیت بیس ہی سال کے عرصہ میں مدینہ کی چھوٹی سی شہری مملکت سے پھیلتے ہوئے رومی ایرانی اور دیگر حکومتوں پر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں میں چھا گئی تھی، یورپ کے سلسلے میں یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۲۷ھ مطابق ۶۴۷ء میں خلیفہ سوم حضرت عثمان کے زمانہ میں اسلامی فوجیں اسپین میں گھس چکی تھیں اور کئی نسلوں کے بعد طارق کے آنے اور فتح کو مکمل کرنے تک وہیں قابض ومقیم تھیں۔[۴]

عرب کی شہری مملکتوں کا مطالعہ اور ابھی کچھ سنجیدہ طور سے شروع نہیں کیا گیا ہے، اس غرض کے لئے میں مکہ کے سوا کسی اور شہر کا بھی انتخاب کرسکتا تھا۔ مثلاً طائف، دومتہ الجندل، تیماء، سبا، عدن، صحار، وغیرہ لیکن مکہ کے انتخاب کے ایک سے

زیادہ وجوہ ہیں، مثلاً مکہ کے متعلق ہمارے معلومات دیگر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ یقینی اور زیادہ کثیر ہیں۔ مکہ اسلام کا گہوارہ تھا۔ یہیں آنحضرت ﷺ پیدا اور بڑے ہوئے تھے، یہیں آپ کی تبلیغی زندگی کا بڑا حصہ صرف ہوا تھا، اور اولین اسلامی شہنشاہیت کی قریب قریب تمام نمایاں ہستیاں اسی شہر میں پیدا ہوئیں، اور یہیں تربیت پائی تھی، مزید براں یہی وہ شہر تھا جس پر قبضہ کے لئے تین ہمعصر شہنشاہیتوں میں رقابت چلی آرہی تھی، رومی، ایرانی، اور حبشی تینوں اس پر قبضہ کے خواہشمند تھے اگر کتاب التیجان کے مؤلف ابن ہشام کی بات پر یقین کیا جائے تو سکندر ذوالقرنین [۵] نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد یعنی کعبہ کی زیارت کرے۔[٦]

ابھی بیان ہوا کہ رومی، ایرانی اور حبشی تینوں سلطنتیں مکہ پر قبضہ کی خواہشمند تھیں، چنانچہ رومیوں کے سلسلہ میں یہ ایک واقعہ ہے کہ ایلیوس گالوس کے زمانہ سے نیرو کے زمانہ تک ہر رومی شہنشاہ کی یہ تمنا رہی کہ اپنا اثر و نفوذ کسی طرح مکہ تک پھیلا دے، چنانچہ اس کے لئے متعدد کوششیں عمل میں لائی جاتی رہیں۔[۷] ابن قتیبہ کی بات پر اگر اعتبار کیا جائے تو قیصر روم نے خود قصّی کو مدد دی تھی کہ مکہ پر وہ قبضہ کرلے [۸] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قصّی نے خود مختاری برتنی شروع کردی اور رومی مفادات نظر انداز کرنے شروع کردیئے، چنانچہ چند نسلوں بعد جب مکہ کے عثمان بن الحویرث الاسدی نے عیسائیت قبول کی تو قیصر روم نے اسے ایک تاج شہریاری سے سرفراز کیا اور ایک فرمان دے کر مکہ روانہ کیا جس میں حکم تھا کہ مکہ والے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں، عثمان کے لئے بڑے اچھے مواقع حاصل تھے، کیونکہ مکہ والے غلہ اور دیگر ضروریات اور نیز اپنے تجارتی کاروانوں کے لئے مصر، فلسطین، اور شام کے رومی صوبوں کے دست نگر تھے اور وہ آسانی سے فرمان قیصری کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، لیکن عین لمحہء آخر میں عثمان ہی کے ایک رشتہ دار نے جلسہ میں اٹھ کر اعتراض کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ مکہ کے آزاد باشندے بادشاہت اور امرائیت کی بدعتوں کو کیسے

قبول کر سکتے ہیں اور اس خیال کا خوب ہی مضحکہ اڑایا اور دم کے دم میں جلسہ کی رائے بدل گئی۔ عثمان بیزار ہو کر شام واپس چلا گیا اور قیصر روم نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ اپنی قلمرو مکہ والوں کے لئے بند کر دی اور ان کے جو تاجر اس وقت وہاں تھے ان کو قید کر لیا۔[۹] (یہ واقعہ غالباً اس کے بعد پیش آیا ہوگا جب قیصر نے آنحضرت ﷺ کے پردادا ہاشم کو اس بات کا منشور عطا کیا تھا کہ وہ تجارت کے لئے شام آیا کریں، نیز ایک سفارشی خط نجاشی حبش کے نام دیا تھا کہ وہ بھی مکہ والے کاروانوں کو اپنے ملک میں آنے دیا کرے)[۱۰] قیصر اس وقت اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکا کیونکہ ایران سے جنگ چھڑ گئی۔ الواحدی نے کتاب اسباب النزول[۱۱] میں بیان کیا ہے کہ مدینہ کا ابو عامر راہب وہاں والوں کو یہ کہہ کر دھمکایا کرتا تھا کہ میں قیصر کی فوجیں بلوالوں گا۔

دیکھئے نقشہ نمبرا

ایرانیوں کے سلسلہ میں تاریخیں بتاتی ہیں کہ یمن کی فتح کے بعد وہ خیال کرنے لگے تھے کہ مکہ خود بخود ان کے اقتدار میں آچکا ہے، چنانچہ خسرو ایران نے ایک مرتبہ گورنر یمن کے نام حکم لکھ بھیجا تھا کہ جناب رسالت مآب ﷺ کو ایران جا کر شہنشاہ سے ملنے کی ہدایت کرے اور اگر رسولِ عربیؐ اس سے انکار کریں تو آپ کو گرفتار کر کے مدائن روانہ کرے۔[۱۲]

حبشیوں کے سلسلہ میں یہ مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے مکہ پر ایک چڑھائی کی تھی،[۱۳] جس میں ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی محمود[۱۴] کے ساتھ کمان کر رہا تھا۔

اس قسم کے بے شمار تذکرے عرب مولفین کے ہاں ملتے ہیں کہ مکہ کے اور دیگر اقطاع عرب کے معززین قیصر روم، کسرٰے ایران، نجاشی حبش وغیرہ بیرونی حکمرانوں کے ہاں باریاب ہوا کرتے تھے، ان واقعات سے بھی اس بات کا ثبوت مل سکتا ہے کہ یہ حکمراں جزیرہ نما عرب کے اندرونی حصہ میں مسالمانہ ذرائع سے اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

قریش کا رحلۃ الشتاء والصیف

کاروانی راستے

نقشہ شہر مکہ

پہاڑ

پہاڑ

راستہ نجد و طائف براہ منیٰ

جبل قُعیقعاں

مولد النبی

پہاڑ

پہاڑ

مسفلہ

قلعہ
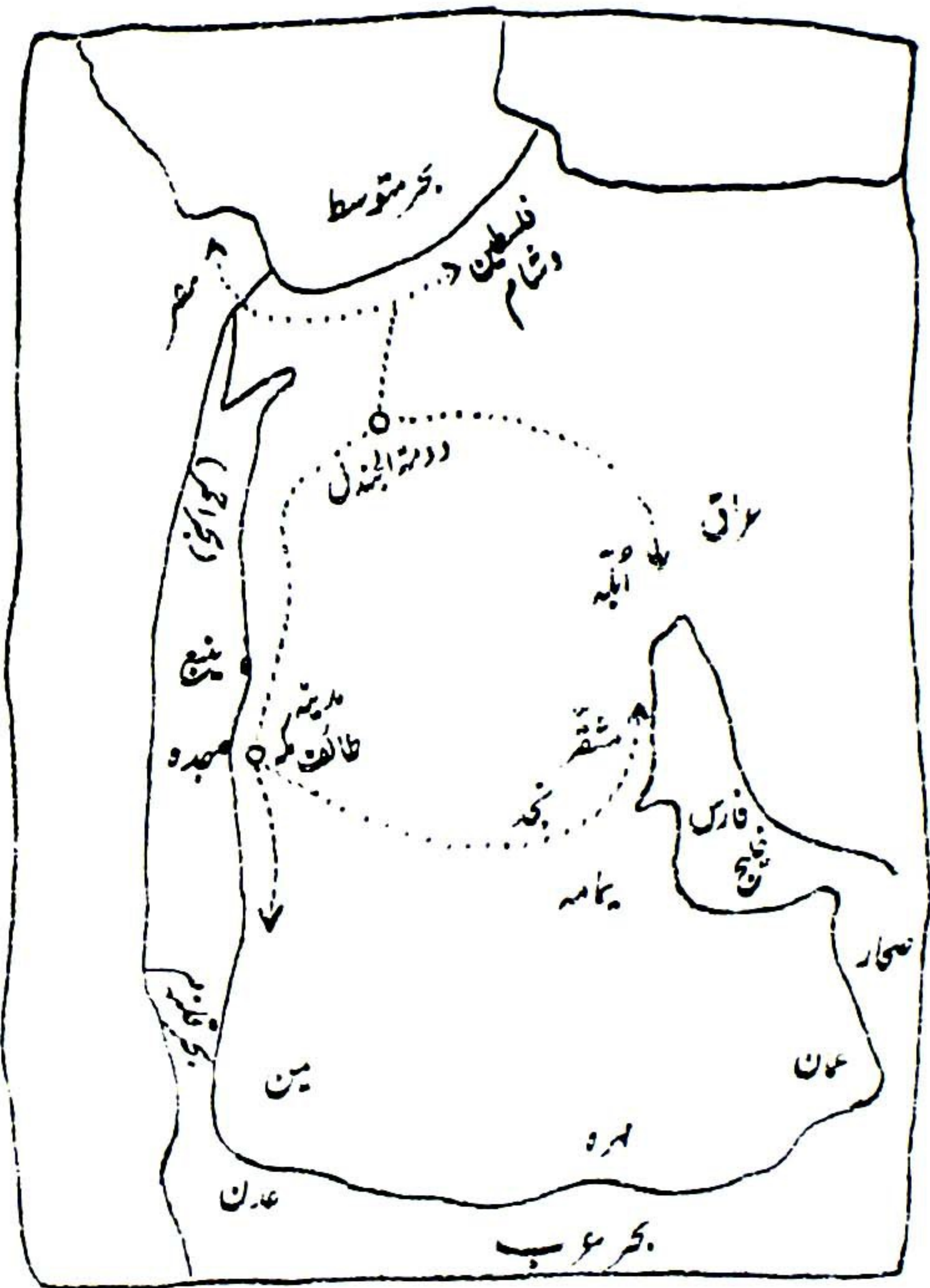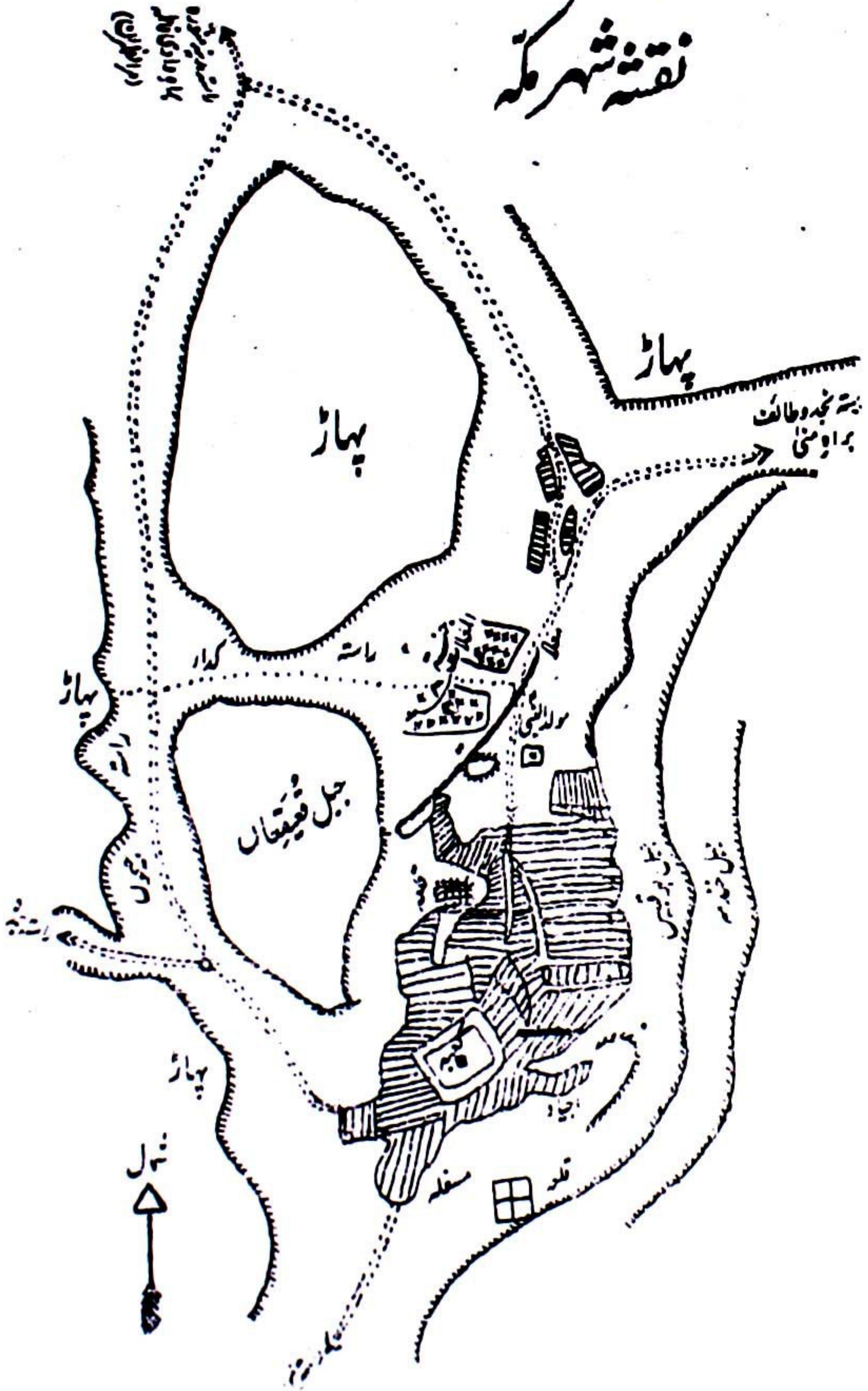
شمال

جغرافیہ شہر:

جزیرہ نمائے عرب کا شمالی اور مغربی حصہ زیادہ تر بنجر اور صحرا ہے، ایک چھوٹا سا نخلستان اور چشمہ بھی ہو تو لوگوں کو وہاں آ کر بس جانے کے لئے کافی ہوتا ہے اور اگر کسی تجارتی راستہ پر ایسے قدرتی انتظامات پائے جائیں تو وہاں کسی بستی کے بس جانے کے لئے اور بھی زیادہ سہولت ہوتی ہے، مکہ، کاروانی راستوں پر ایک اہم اسٹیشن تھا اور کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں یہ ایک آباد شہر تھا جہاں وہ آیا جایا کرتے تھے، عرب مولف [۱۵] ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس زمانہ میں گھنے جنگل اور اچھی چراگاہیں اسی وادی میں پائی جاتی تھیں جہاں مکہ بسا ہوا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے جد اعلیٰ قصّی نے جنگل کا بڑا حصہ صاف کر دیا [۱۶] تاکہ اپنے اور اپنے قبیلہ والوں کے گھروں کے لئے معبد کعبہ کے اطراف جگہ فراہم کی جائے، بعد کے زمانوں کے متعلق بھی ہمیں اسی طرح کے ثبوت ملتے ہیں۔ [۱۷] خود آج بھی بوا ہیر کی رباط مکہ معظمہ میں اتنی شاندار ہے کہ وہ وادی غیر ذی زرع [۱۸] کے کسی مکان کی جگہ بمبئی کی ملیبار ہل کے کسی قصر سے مشابہ ہے، مکہ تجارت کے لئے شام، یمن اور طائف و نجد جانے والے کاروانوں کا جنکشن تھا اور چشمہ زمزم کے قریب آباد ہوا تھا، اور ہر طرف بلند اور ناقابل تسخیر پہاڑیوں نے اسے جنگی نقطہ نظر سے بھی محفوظ بنا دیا تھا، اس کی ابتدائی تاریخ بہت دھندلی ہے، وہاں کی سیاسی زندگی سے آئندہ باب میں بحث ہوگی، جس مقام پر اور جس طور سے شہر بسا تھا اس کی کچھ تفصیلیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

قدیم یونانی شہروں کے دو حصے ہوتے تھے ''پولس'' اور ''استو'' یعنی بلند اور پست حصہ ہائے شہر، نامعلوم زمانہ سے مکہ بھی دو حصوں میں بٹا ہوا ہے معلّات اور مسفلہ، اور یہ تقسیم آج تک پائی جاتی ہے۔ کسی قدیم تر زمانہ میں ان دونوں حصوں کا نام بکہ اور مکہ رہا ہوگا، چنانچہ ازرقی [۱۹] نے اپنی تاریخ مکہ میں بیان کیا ہے کہ بکہ وہ مقام ہے جہاں معبد تعمیر ہوا ہے اور مکہ پوری بستی کا نام ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس

کی تائید ہوتی نظر آتی ہے، چنانچہ ایک آیت میں ہے ''وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے (بغرض عبادت) بنایا گیا وہ وہ ہے جو بکہ میں ہے'' [۲۰] اور ایک دوسری آیت میں ہے ''یہ وہی تھا جس نے ان کو تم پر حملہ کرنے سے اور تم کو ان پر حملہ کرنے سے وادی مکہ میں روک دیا تھا'' [۲۱] مکتین [۲۲] (دو مکے) کی اصطلاح، قریتین [۲۳] (دو شہر) کے معنوں میں ابن ہشام نے استعمال کی ہے جس سے مکہ اور طائف کی دو ہمشیر بستیاں مراد لی گئی ہیں، اس سے بھی اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ معززین معلاۃ میں رہتے تھے اور شہر کی عبادت گاہ اور قبرستان بھی وہیں آباد تھے۔ تاریخ ہمیں یقین دلاتی ہے [۲۴] کہ جب قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو اپنے تمام رشتہ داروں کو ظواہر یعنی مضافاتِ شہر سے بطحاء یعنی مرکز شہر میں منتقل کر دیا تھا اور عبادت گاہ یعنی کعبہ کے سامنے ہی دار البلد تعمیر کیا جس کا نام دار الندوہ یعنی مشورہ گاہ رکھا گیا [۲۵]۔ مکہ کی عبادت گاہ (یعنی کعبہ) دیوتاؤں کا ایک آماجگاہ (دیوستھان **Pantheon**) بن گیا تھا جہاں (۳۶۰) [۲۶] بت تھے، جو مختلف قبائل [۲۷] کے معبودوں کی نمائندگی کرتے تھے، لات اور عزیٰ [۲۸] اصل میں علی الترتیب طائف اور نخلہ کے لوگوں کی دیویاں تھیں اور کعبہ کے احاطہ میں بھی انکے مثنی (**Duplicate**) پائے جاتے تھے اور مکہ والوں کے نزدیک بھی ان دیویوں کا بڑا احترام تھا [۲۹]۔

یونانی شہروں ہی کی طرح [۳۰] مکہ کے اطراف بھی ایک ماتحت سرزمین تھی جسے حرم کہتے تھے اور جو تخمیناً سوا سو مربع میل پر مشتمل تھی [۳۱]، اسلام نے حدودِ حرم میں مزید توسیع کر دی، اور شہر کی وہ سرحدیں قرار دیں جو اب ''میقات'' کہلاتی ہیں اور جہاں سے حاجیوں کو اپنا معمولی لباس اتار کر احرام پہننا پڑتا ہے۔

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانہ میں مکہ میں کوئی بازی گاہ، گھوڑ دوڑ کا میدان، کسی مہم پر روانہ ہونے کے لیے فوج کا اجتماع گاہ اور محصورہ و محفوظ چراگاہیں (حمیٰ)

تھیں یا نہیں، مدینہ وغیرہ دوسرے شہروں کی حد تک البتہ ان چیزوں کا کافی پتہ چلتا ہے۔ مکہ کے ایک محلّہ کا نام ''اجیاد'' ہے جس کے معنی اچھی نسل کے گھوڑوں کے ہیں، اگرچہ یاقوت وغیرہ اس کی وجہ تسمیہ کچھ اور بتاتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ اس کو گھوڑ دوڑ سے بھی کچھ تعلق رہا ہو۔

پروفیسر ہیالیڈے نے یونانی شہری مملکتوں پر اپنے دلچسپ مضمون میں لکھا ہے کہ:

''جب وہ پرآشوب دور ختم ہوگیا جس میں ترکِ وطن کے عظیم الشان سلسلے جاری تھے تو بجائے اس کے کہ جنگ ایک عادتی حالت سمجھی جائے، ہمہ گیر امن کا دور دورہ ہوگیا اور خانہ بدوشی کی جگہ بستیوں میں توطن اختیار کیا جانے لگا۔ لیکن یہ شہر کس طرح وجود میں آئے؟ قدیم ترین بستیاں بے شبہ گاؤں میں ہوئی ہوں گی ...... بہرحال عام طور پر چند دیہات کے مجموعہ نے اس چیز کو مناسب پایا ہوگا کہ کسی پہاڑ یا خود میدان میں اچھی طرح مدافعت کیے جانے کے قابل مقام کو قلعہ بنا کر مستحکم کرلے تاکہ اگر کسی موسم گرما کی لوٹ کے لیے نکلی ہوئی ہمسایوں کی ٹکڑی ان پر ٹوٹ پڑے تو اپنے بیوی بچوں اور جانوروں کو وہاں حفاظت کے لیے بھیج سکیں ...... اس قلعہ میں دیوتا کا مندر اور بادشاہ کا محل بھی عموماً ہوا کرتے تھے، اس کے بعد ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا کہ عوام اپنے دیہات کو چھوڑ کر پناہ لینے کے لیے شہر کے قریب رہنے لگیں اور وہاں سے روزانہ اپنی کھیتیوں کو جانے لگیں، معززین کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ بادشاہ کے آس پاس اور حکومت کے مرکز میں رہیں، اس طریقہ سے بلند حصہ شہر یا قلعہ کے اطراف ایک پست حصہ شہر آباد ہونے لگا، اور رفتہ رفتہ پست حصہ شہر کے اطراف ایک شہر پناہ یا فصیل بھی تعمیر ہونے لگی'' [۳۲]۔

قریب قریب یہی صورتِ حال حجاز کی بھی تھی۔

مکہ جس مقام پر آباد ہے وہاں ایک گہری وادی ہے جس کے چاروں طرف اونچے اور ناقابل عبور پہاڑ ہیں، شہر میں صرف ایک شاہراہ ہے جو ایک طرف سے

داخل ہو کر دوسری طرف نکل جاتی ہے، ذیلی راہیں شہر میں آنے جانے کے لیے صرف دو ہیں[۳۳]۔ یہاں کے باشندوں کو اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ کوئی فصیل بھی تعمیر کریں، اس کے باوجود ہمیں قطب الدین کی تاریخ مکہ میں حسب ذیل ذکر ملتا ہے:

''قدیم زمانوں میں مکہ میں بھی شہر پناہ کی دیواریں پائی جاتی تھیں، چنانچہ معلات کے رخ جبل عبداللہ بن عمر اور اس کے سامنے کے پہاڑ کے مابین ایک وسیع دیوار پائی جاتی تھی اس میں ایک دروازہ تھا جس پر لوہے کے پتر جڑے ہوئے تھے، یہ ہندوستان کے ایک بادشاہ نے امیر مکہ کے پاس بطور تحفہ روانہ کیا تھا...... ایک اور دیوار سفلہ کے رخ میں بھی درب الیمن نامی محلہ میں تعمیر کی گئی تھی...... تقی الفاسی نے بیان کیا ہے کہ 'معلات میں مذکورہ بالا دیوار کے علاوہ ایک اور دیوار بھی تھی...... لیکن مجھے معلوم نہیں کہ مکہ کی یہ دیواریں کب تعمیر ہوئی تھیں نہ یہ کہ ان کو کس نے تعمیر کیا تھا اور نہ یہ ہی کہ ان کی مرمت کس نے کی تھی' میں نے بعض تاریخوں میں دیکھا ہے کہ عباسی خلیفہ المقتدر کے زمانہ میں ایک دیوار پائی جاتی تھی''۔[۳۴]

یہ دیواریں غالباً اسلام سے پہلے کی انہی بھدی دیواروں کی جگہ نئے سرے سے تعمیر کی گئی ہوں گی، وادی مکہ مین سب سے کشادہ اور مسطح مقام شروع ہی سے قومی عبادت گاہ کے لیے محفوظ رہا، عرب مولف [۳۵] ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس وادی کے پرانے باشندے اتنے وہمی تھے کہ بیت اللہ (کعبہ) کے قریب اپنے رہنے کے لیے کوئی عمارت تعمیر کرنی روا نہیں رکھتے تھے، مکانات انہوں نے مضافاتِ شہر میں بنوائے اور کعبہ کے قریب صرف خیمے لگائے جاتے تھے، مورخین کا یہ بھی بیان ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے عبادت گاہ کے اطراف گھر تعمیر کئے وہ قصی تھا، اس جدت یا بدعت پر عوام کو آمادہ کرنے کے لیے اس نے یہ استدلال کیا کہ ''اگر تم عبادت گاہ کے اطراف رہنے لگو تو لوگ تم سے ڈرا کریں گے اور لوٹ مار کے لیے تم پر حملہ کرنے سے

باز آجائیں گے"۔

یہ کہہ کر قصّی نے سب سے پہلے خود ہی اپنے لیے مکان تعمیر کیا جس میں قومی مشورہ گاہ یعنی دارالندہ بھی تھا، یہ کعبہ کے شمال رخ تعمیر ہوا......اور کہتے ہیں کہ وہ اس جگہ تھا جہاں آجکل حنفی مصلی بنا ہوا ہے[۳۶]۔ مکہ کی اس عبادت گاہ کے باقی تین طرف جو زمین تھی وہ قصّی نے قریشی قبائل میں بانٹ دی جہاں انہوں نے اپنے رہنے کے گھر تعمیر کر لئے[۳۷]۔

سیاسی نظام:

مکہ پر جُرہمیوں کی حکومت تھی، قصّی نے ان کے سردار کی بیٹی سے شادی کی اور جب وہ مرگیا تو قصّی سرداری کی وراثت کا دعویدار بن گیا، قصّی کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا چنانچہ اس خانہ جنگی میں قبیلہ قضاعہ نے قصّی کی مدد کی، اور اگر ابن قتیبہ کی بات پر یقین کیا جائے تو خود قیصر روم نے بھی قصّی [۳۸] کو مدد دی، جس کا منشا بہ ظاہر یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ ہونے والی تجارت کے گذرگاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے۔

سرداری حاصل کرنے کے بعد قصّی [۳۹] کو وہاں متعدد سیاسی ادارے موجود ملے ہوں گے، مثلاً معبد کعبہ کی تولیت کا عہدہ وغیرہ، کوئی تعجب نہیں جو اس ذہین شخص نے خود بھی چند نئے ادارے قائم کیے ہوں تاکہ اپنے اقتدار کو محفوظ و مستحکم کرے، لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہوگا کہ قصّی کے زمانہ میں جن دس [۴۰] سرکاری عہدوں کا مکہ میں پتہ چلتا ہے ان میں سے کتنے قصّی کے قائم کردہ تھے اور کتنے قدیم ادارے ہی تھے، شہر میں ایک دارالندوہ[۴۱] بنانا اور رفادہ [۴۲] کے نام سے ایک سالانہ محصول باشندگانِ شہر پر عائد کرنا صراحت کے ساتھ قصّی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ نسی، اجازہ، اور افاضہ کے ادارے قدیم خانوادوں

ہی کے ہاتھ میں رہنے دیئے گئے تھے[۴۳]، بہرحال عام طور پر قصی کے ہاتھ میں چھ عہدوں[۴۴] کا ہونا بیان کیا جاتا ہے، یہی عہدے اہم تر بھی تھے اور آمدنی کا ذریعہ بھی اُن ہی سے تھا۔

ابن عبدربہؒ [۴۵] اور دیگر مولف بیان کرتے ہیں کہ مکہ میں دس ہی سرکاری عہدے تھے، جن کو دس قبائل کے سردار موروثی طور سے انجام دیا کرتے تھے، ممکن ہے کہ یہ عہدے ابتداء میں دس ہی رہے ہوں جیسا کہ وینس اور پالمیرا میں تھا چنانچہ شابو[۴۶] کے حوالے سے لانس [۴۷] نے بیان کیا ہے کہ:

''دس ارکان کی ایک مجلس ہوتی تھی جو دس بڑے خانوادوں کے سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی، کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پالمیرا میں اس طرح کی ایک مجلس موجود اور کارفرما تھی جس کے علاوہ ایک مجلس عام یا سینیٹ بھی تھی جس کا اپنا صدر اور اپنا معتمد ہوا کرتا تھا مجلس دہگانہ اور سینٹ قانون بناتے، قوانین مالی کے نفاذ کی نگرانی کرتے اور ضرورت پر سزاؤں کے احکام دیتے......''۔

جس کے بعد لانس نے بیان کیا ہے کہ:

''یہ لاحاصل کوشش ہوگی کہ اس کے مماثل کسی ادارے کی تلاش ہم مکہ کے نظام میں کریں''۔

حقیقت میں ہمیں دس سے بہت زیادہ اداروں کا پتہ چلتا ہے جن کی تفصیل عرب مولفوں کی کتابوں کی ورق گردانی پر معلوم ہوسکتی ہے، خود ابن عبدربہؒ نے اگرچہ صراحت سے بیان کیا ہے کہ مکہ میں سردار دس ہی تھے لیکن خود اسی مولف نے سترہ عہدوں کے نام گنائے ہیں اور بعض سرداروں کو ایک سے زیادہ عہدوں پر مامور بتایا ہے۔ان سترہ عہدوں پر ہم موجودہ مواد سے چار پانچ اور عہدوں کا بڑی آسانی سے اضافہ کرسکتے ہیں، چنانچہ ان کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) ندوہ (۲) مشورہ (۳) قیادہ (۴) سدانہ (۵) حجابہ (۶) سقایہ (۷) عمارۃ البیت

(۸) افاضہ (۹) اجازہ (۱۰) نسی (۱۱) قُبہ (۱۲) اعنہ (۱۳) رفادہ (۱۴) اموال محجرہ (۱۵) ایسار (۱۶) آشناق (۱۷) حکومہ (۱۸) سفارہ (۱۹) عقاب (۲۰) لواء (۲۱) حلوان النفر

مجلس دہگانہ کے الجھے ہوئے مسئلہ کو نظر انداز کر کے میں چاہتا ہوں کہ شہری مملکت مکہ کے دستور کی ساخت اور کارکردگی کو اپنے طور پر واضح کروں۔

چنانچہ اولاً آبادی یا شہریوں کو ''جماعہ'' [۴۸] کا نام دیا جاتا تھا، یہ لفظ جناب رسالت مآب ﷺ نے بھی برقرار رکھا اور اس سے مراد آپ کے زمانہ میں آپ کے متبعین کی پوری جماعت ہوتی تھی، جو باقی دنیا سے ممتاز ایک وحدت تھی اور بحرین کے حکمران کے نام جو مکتوبِ نبوی گیا [۴۹]، اس میں بھی اسے دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس ''جماعت'' میں شریک ہو جائے، ''ملت'' [۵۰] کا لفظ سیاسی سے زیادہ مذہبی مفہوم رکھتا تھا۔ قرآن مجید میں ''قوم'' [۵۱] کا لفظ ایک وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور اس میں نہ صرف عام رائے دہندگانِ شہر بلکہ ایک حد تک جملہ ساکنین ملک شامل معلوم ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو حق رائے حاصل ہوتا تھا اور وہ شورائے عمومی میں حصہ لینے کے مجاز ہوتے تھے اُن کو قرآن میں ہمیشہ ''ملأ'' [۵۲] کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور یہ ''ملأ'' کی ''تراضی'' یعنی رضامندی ہی ہوتی تھی جس کے مطابق مقامی حکمراں فیصلہ کرتا، چنانچہ قرآن مجید میں بھی لفظ تراضی استعمال ہوا ہے [۵۳]۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں فرعون کی ''ملأ'' کا ذکر ہے اس سے بنی اسرائیل خارج نظر آتے ہیں جن کو کوئی شہری حقوق حاصل نہ تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں جو عزیز مصر تھا اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں جو ملکہ سبا تھی ان کے ہاں بھی قرآن مجید [۵۴] کے مطابق جو مجلس شوریٰ تھی اس کا نام ''ملأ'' ہی تھا، اس مجلس میں ''اولو قوۃ'' یا اہل حل و عقد ہی ہوا کرتے تھے، اور اگر کوئی چیز نامناسب پیش آئی تو یہ مداخلت بھی کیا کرتے [۵۵]۔ پالمیرا میں جو مجلس شوریٰ تھی اس کے متعلق

بھی ایسا ہی مواد ملتا ہے[٥٦]۔

مکہ میں جو دارالندوہ تھا اس میں صرف معمر اہل مکہ شریک ہو سکتے تھے، چنانچہ ازرقی [٥٧] اور ابن دُرید[٥٨] نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم ازکم چالیس سال کی ہو، صرف حکمرانِ شہر قصّی کے بیٹوں کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ عمر کی اس شرط سے مستثنیٰ تھے،[٥٩] غالبًا اسی حق رائے کی عمر چہل سالگی ہی کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید نے "حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً"[٦٠] کے الفاظ میں بیان کیا ہے، یہ قصّی کے زمانہ کا ذکر تھا، بعد کے زمانوں میں مختلف نرمیاں برتی جاتی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوجہل[٦١] کو تیس ہی سال کی عمر میں اس کی عمدہ رائے (لجودرایہ) کے باعث دارالندوہ کے اجلاس میں شریک کیا جاتا تھا اور حکیم بن حزام[٦٢] کو تو بیس یا پندرہ ہی سال کی عمر میں یہ عزت حاصل ہوگئی تھی، یونان کے شہر اسپارٹا میں تو مجلس شوریٰ واقعی مجلس معمرین تھی، چنانچہ ساٹھ سال سے کم عمر[٦٣] کا کوئی شخص وہاں کی مقامی مجلس شوریٰ (Gerousia) میں شریک ہی نہیں ہوسکتا تھا[٦٤]۔

قصّی سے پہلے مکہ والے یا تو کسی کھلے مقام پر مشورے کے لیے جمع ہوا کرتے ہوں گے یا اپنے سردار کے خیمے میں اس غرض کے لیے ایک مستقل عمارت بنانا قصّی کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ قصّی ہی نے اسے دارالندوہ نام دیا تھا، اور جناب رسالت مآب ﷺ کے ملک الشعراء حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس نام کی یاد اپنے اشعار میں باقی رکھی ہے[٦٥]۔ یہ مشورہ گاہ کعبہ کے شمال میں تعمیر ہوئی تھی، لیکن زمانہ اسلام میں اُسے منہدم کر کے کعبہ کے اطراف جو مسجد حرم بنی اس کی توسیع کے کام میں لایا گیا، یہ ظاہر ہے کہ اس مجلس کا انعقاد معینہ اوقات پر نہیں ہوتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً جب بھی ضرورت پیش آئے ہوتا[٦٦]۔
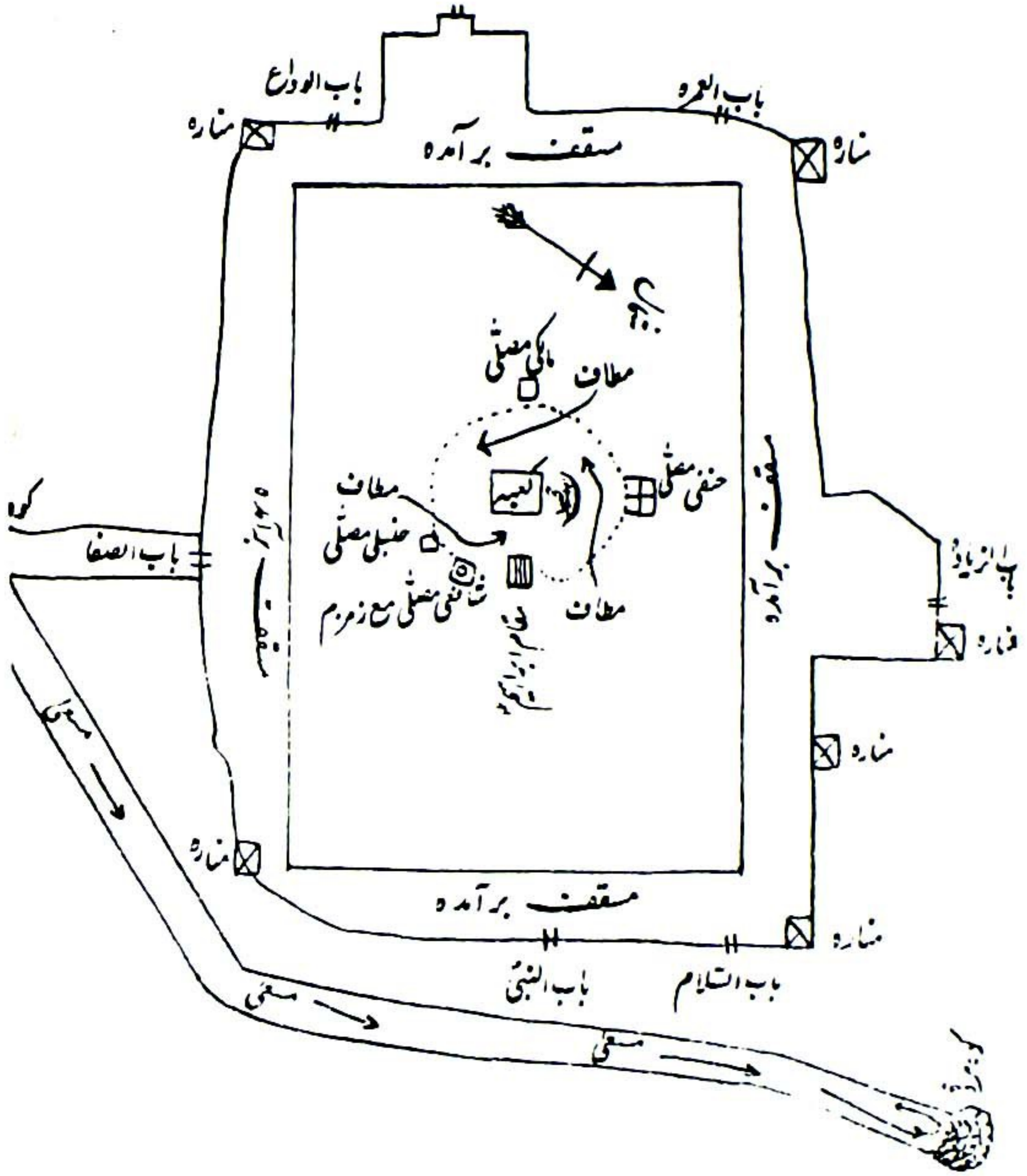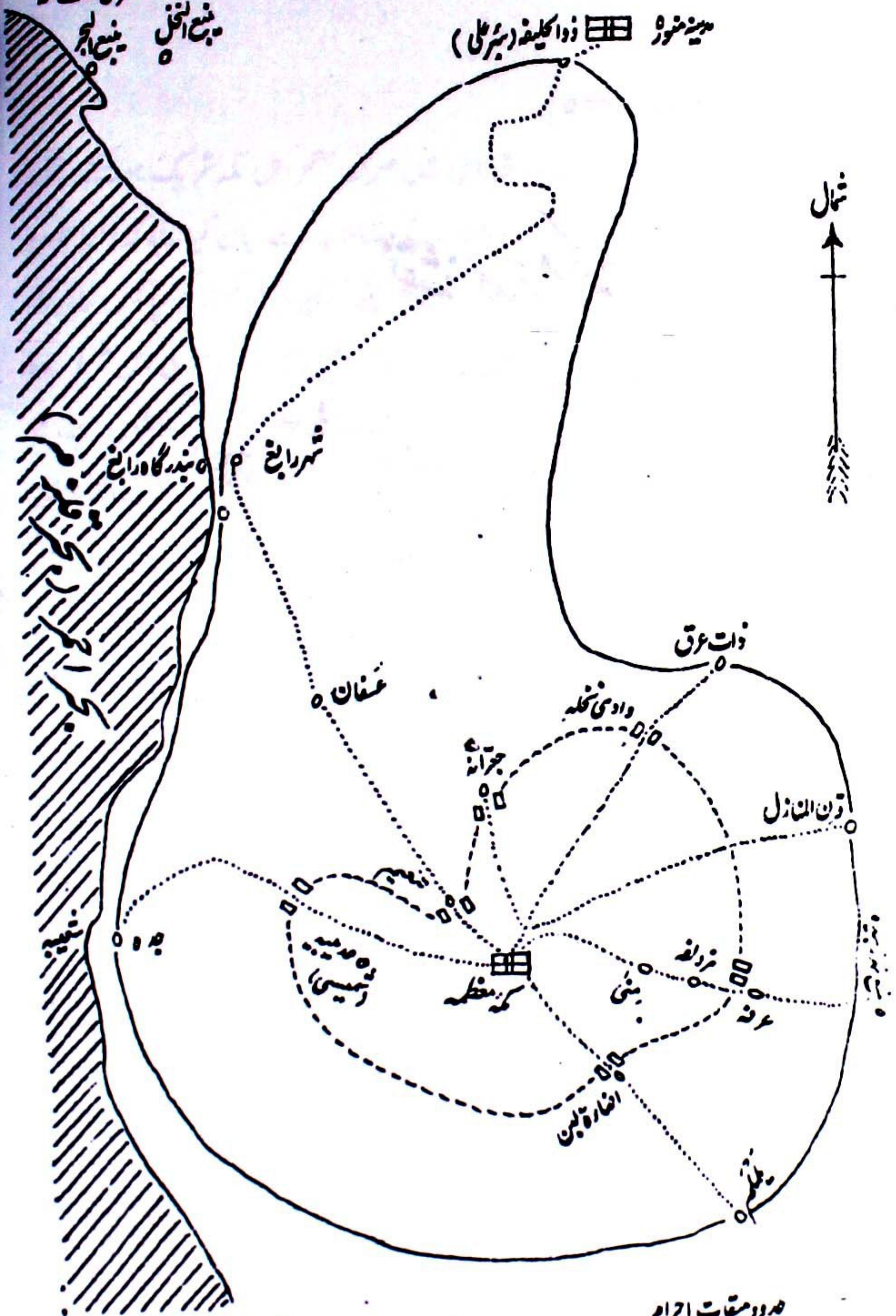
نقشہ حدود حرم مکہ

اسی دارالندوہ میں مشورے ہوا کرتے، جنگوں کا اعلان کیا جاتا یا مدافعتی تدبیروں پر بحث و غور ہوتا[۶۷]، یہیں شادیاں بھی رچائی جاتیں، اور تجارتی معاہدے طے ہوتے[۶۸]۔ بیرونی مہمان آتے تو ان کی ضیافت بھی یہیں ہوتی[۶۹]۔ انیلگری کے قدیم باشندوں کی طرح[۷۰] زمانہ قبل اسلام کے مکہ والے بھی ایک رسم کرتے جو لڑکی کے سن بلوغ کو پہنچنے پر انجام دی جاتی اور اسے ایک نئی اور پوری قمیص (درع) پہنائی جاتی اور وہ بے نقاب آتی اور بے نقاب ہی جاتی گھر پہنچنے کے بعد اس پر پابندیاں عائد ہو جاتیں، اس رسم کا منشاء یہ تھا کہ لڑکی کے قابلِ نکاح ہونے کا اعلان کیا جائے اور خواہشمند آگاہ ہو کر رونمائی کے لیے آسکیں۔ یہ رسم بھی دارالندوہ ہی میں انجام پاتی[۷۱]۔

دارالندوہ شہر مکہ کا مرکزی دارالبلد تھا اُس کے علاوہ شہر میں جتنے محلے یعنی قبائلی آبادیاں تھیں اتنے ہی مجالس محلہ بھی تھے، ان کو "مادی" [۷۲] کہا جاتا تھا، جیسا کہ شہر مدینہ میں محلہ دار مجالس کو سقیفہ یعنی مسقّف سائبان کا نام دیا گیا تھا، نادی اور دارالندوہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، چنانچہ مشہور محدث و لغت نویس ابو عبید[۷۳] نے نادی اور ندوہ دونوں کا مادہ "ندا" ہونا بتایا ہے۔ قرآن مجید نے لفظ نادی کو حیاتِ جاوید عطا کر دی ہے اور فَلْيَدْعُ نَادِيَه" [۷۴] اور "تَاتُونَ فِي نَادِيْكُمُ الْمُنْكَر" [۷۵]، دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے اور ماضی مضارع کے صیغے بھی ان کے علاوہ مستعمل ہوئے ہیں[۷۶]، ان نادیوں یا قبائلی مجالس محلہ میں اجنبیوں کو معاہدے کے ذریعہ سے مولا یعنی فرد خاندان بنانے کی رسم بھی انجام دی جاتی تھی[۷۷] اور کسی فرد خاندان کو بے راہ روی وغیرہ پر جات باہر ("طرد" یا "خلع") کرنے کا اعلان بھی وہیں کیا جاتا تھا[۷۸]، محلہ والے اور بعض وقت دیگر محلوں کے دوست بھی چاندنی راتوں میں یہاں جمع ہو کر سامرہ یعنی شبانہ قصہ گوئی کیا کرتے تھے[۷۹]، تجارتی معاملات اور کاروانوں کی آمد یا روانگی بھی ان ہی قبائلی نادیوں سے ہوا کرتی تھی۔

اتھنس (اثینا) کے متعلق جاوٹ (Jowett) نے اپنی کتاب Thuc ydides [۸۰] میں لکھا ہے:۔

''قرقروپ (Cercrops) اور ابتدائی بادشاہوں کے زمانے میں حتیٰ کہ تیسیوس (Theseus) کے زمانے تک شہر اثینا مختلف محلوں میں منقسم تھا جن میں سے ہر ایک کے اپنے مجالس محلہ اور مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے۔ بجز اس کے کہ کوئی خطرہ درپیش ہو، پورے شہر کی آبادی کا اجلاس جو بادشاہ کی صدارت میں ہوتا نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ لوگ اپنے معاملات کا انتظام اپنے مجالس محلہ ہی میں آپس کے مشورے سے طے کرلیا کرتے تھے۔

مکے میں نقیب کا عہدہ بھی پایا جاتا ہے جسے منادی اور مؤذن کہتے تھے (مؤذن اپنے ان ابتدائی معنوں میں اب تک شامی بدویوں میں مستعمل [۸۱] ہے) جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مجالس کے انعقاد کا ڈھنڈورا پیٹے [۸۲]۔ ہر قبیلے کے سردار کے پاس اس کے اپنے خصوصی ایک یا زاید منادی بھی ہوا کرتے تھے [۸۳]۔ یہ منادی نہ صرف غیر معمولی انعقاد مجالس کی اطلاع مشتہر کرتے تھے بلکہ کسی تقریب یا دعوت میں دعوتیں پہنچانا اور کسی فرد خاندان کے جات باہر کئے جانے کی اطلاع اور محلوں میں بھی کرنا انھیں سے متعلق تھا۔ غیر معمولی صورتوں میں منادی کے علاوہ دیگر عام لوگ بلکہ اجنبی اشخاص بھی مجالس بلدیہ کے انعقاد کی اطلاع کے مجاز تھے۔ ایسی صورتوں میں اجنبی لوگ اپنے تمام کپڑے اتار دیتے اور کسی اونچے مقام پر بالکل برہنہ ہوکر دہائی دیا کرتے۔ عربی داں ''النذیر العریاں'' کی اصطلاح سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ بدر میں قریش کے کارواں پر آنحضرتؐ کے حملے کے خطرے کی اطلاع مکے میں ابوسفیان کے قاصد نے اسی طرح دی تھی۔

مورخین کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصی پورے شہر کا ایک واقعی مطلق العنان اور با اقتدار بادشاہ تھا، جس کا ہر لفظ قانون کا حکم رکھتا تھا [۸۴]۔ بعد کی نسلوں

نے شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ اس کی یاد باقی رکھی۔اور اسے ''مجمع'' کا خطاب [۸۵] عطا کر دیا تھا کیونکہ اسی نے جملہ قریشی قبائل کو جمع اور متحد کر کے شہر میں انھیں دیگر آبادی میں ایک اعزازی حیثیت عطا کر دی تھی۔قصی کی وفات کے بعد ایک اعیانیت قائم ہو گئی کیونکہ خود قصی نے مختلف انتظامی عہدے اپنے مختلف بیٹوں میں بانٹ دیئے تھے [۸۶]۔اور غالباً مشہور مجلس دہگانہ [۸۷] کا آغاز اسی طور سے ہوتا ہے جو زمانہ اسلام تک باقی نظر آتی ہے،اس سے ہمیں انکار نہیں کہ قصی کو مطلق العنان اختیارات حاصل رہے ہوں گے اور اس کا کوئی حریف و مدمقابل نہ ہوگا کیونکہ اس نے اپنی قوم کے لیے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے،لیکن بعد کے زمانوں میں سیدالناس [۸۸] وغیرہ کے القاب سے کہیں ہم یہ نہ خیال کریں کہ مکے میں بھی مثلاً وے نیس (وینس) کی طرح کوئی دوجے یا قائد و سردار ہوا کرتا تھا۔شہر مکے کے عہدوں میں ایک قیادہ [۸۹] بھی بیان کیا جاتا ہے،لیکن اس کا منشا کیا تھا پوری طرح معلوم نہیں ہوتا۔ ولہاوزن بھی اپنے عالمانہ اوردلچسپ مقالے Geminwesen ohne obr jgkeit (یعنی ایک سیاسی اجتماعیت بغیر سرداری کے) میں اسی نتیجے پر پہنچا ہے کہ شہر مکہ میں کوئی فردی حکومت نہ تھی۔اس میں شک نہیں کہ عرب کے مختلف حصوں میں فردیت یا بادشاہت کی طرف رغبت پیدا ہو چلی تھی، چنانچہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عثمان بن الحویرث [۹۰] نے مکے میں بادشاہ بننے کی کوشش کی تھی۔مدینے میں عبداللہ اُبی بن سلول کے لئے تو تاجِ شہریاری [۹۱] کی تیاری تک کاریگروں کے سپرد ہو چکی تھی کہ اتنے میں جناب رسالت مآب ﷺ کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور پھر اس کے ساتھیوں کے لیے اس کا موقع نہ رہا کہ کسی کو بادشاہ بنانے کی تجویز کر سکیں، اسپرنگر کو یقین تھا کہ ''یہ لوگ یعنی عرب کے بدوی اپنی بدویانہ زندگی کے باوجود فردیت یعنی بادشاہت کی طرف میلان رکھنے لگ گئے تھے'' [۹۲]۔

(مطبوعہ: معارف نمبر ا، جلد ۴۹، اعظم گڑھ)

حواشی:

[۱] انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنس تحت عنوان سٹی City (شہر) از ولیم سنرو۔

[۲] مقالہ جو دسمبر ۱۹۳۷ء میں ٹریونڈرم میں اورینٹل کانفرنس میں سنایا گیا۔

[۳] ناپولیون کی نوشتہ فرانسیسی یادداشت جزیرہ سینٹ ہیلینا جلد ۳، ص ۱۸۳

[۴] تاریخ طبری ۱۹۲۷ء ص ۲۸۱۷ نیز دیکھئے گبن کی انگریزی تاریخ انحطاط و زوال روما جلد ۵ ص ۵۵۵ مطبوعہ اکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

[۵] میرے خیال میں ''ذوالقرنین'' (یعنی دوسینگوں والا) کا لقب سکندر اعظم کو عربوں کی طرف سے دیئے جانے کا اصلی باعث یہ تھا کہ مقدونیہ والے ایک ٹوپی پہنا کرتے تھے جس پر دوسینگیں ہوتی تھیں ان کا یہ قومی لباس اب تک باقی ہے، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب یوگوسلافیا کے بادشاہ الگزنڈر کو مارسیلز میں قتل کردیا گیا تو اس کی لاش کے بازو اس کے تمام شاہی زیوروں وغیرہ کے ساتھ اس کی دوسینگوں والی ٹوپی بھی رکھی گئی تھی (''الروم ذات القرون'' کی اصطلاح کے لیے دیکھئے بلاذری کی فتوح البلدان طبع مصر ص ۵۱)۔

[۶] نیز دیکھئے عینی شرح بخاری ۳۶۵/۷ اور ازرقی کی اخبار مکہ برموقع،

[۷] لامنس فرانسیسی کتاب مکہ ہجرت سے پہلے، صفحہ ۲۳۹، ۲۴۳۔

[۸] معارف ابن قیتبہ، طبع یورپ میں ص ۳۱۳۔

[۹] الفاسی طبع یورپ، ص ۱۴۴، سہیلی کی الروض الانف ۱۴۶/۱، لامنس کی مذکورہ بالا کتاب مکہ ص ۲۶۷، اسپرنگر کی جرمن سیرۃ و تعلیمات محمدی جلد ا ص ۸۹ تا ۹۰۔

[۱۰] تاریخ یعقوبی ۲۸۰/ا تاریخ طبری ص ۱۰۸۹، طبقات ابن سعد جلد ا حصہ اول ص ۴۳ و ۴۵، لسان العرب تحت کلمہ ''ایلاف'' لامنس کی مذکورہ کتاب مکہ ص ۱۲۸ وغیرہ، تفسیر طبری وغیرہ میں سورہ ایلاف کی تشریح۔

[۱۱] اسباب النزول ص ۱۹۵۔ [۱۲] تاریخ طبری ص ۱۵۷۲ و مابعد۔

[۱۳] دیکھئے کسی تفسیر میں سورہ فیل نیز فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۹۱۱ء ص ۵ تا ۳۶، اور

ایطالوی رسالہ R.S.O جلد ۹ ص ۳۷۸ و مابعد میں کونتی روسینی کے مضامین عرب میں حبشیوں کی خانہ جنگیوں کے متعلق، نیز لامنس کی کتاب مکہ ص ۲۸۰ و مابعد۔

[۱۴] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹ و مابعد، معلوم نہیں کہ حبشیوں نے محمود کا عربی نام کیوں رکھا تھا، شاید یہ لفظ Mammoth کا معرب ہو، جو ایک گرانڈیل قسم کے ہاتھی کو کہتے ہیں۔

[۱۵] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷ نیز کتاب الاغانی ۱۳/۱۰۸۔

[۱۶] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰، تاریخ طبری ص ۱۰۹۷، قطب الدین کی الاعلام باعلام بلد اللہ الحرام ص ۳۴۔

[۱۷] جُرہمی دَور کے لیے دیکھئے ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷۔

[۱۸] قرآن مجید ۳۷/۱۴ میں مکہ کے جائے وقوع کو یہ نام دیا گیا ہے، کیونکہ وہاں کوئی زراعت نہیں ہوتی، اگرچہ عالیہ زمانوں میں نہر زبیدہ کے باعث شہر میں سرسبزی نظر آنے لگی یہ اور سعودی دَور میں باغات بھی ترقی کرنے لگے ہیں۔

[۱۹] اخبار مکہ ص ۹۶ سطر ۱۲ ''مکتبہ موضع البیت و مکہ القریۃ''۔

[۲۰] قرآن مجید ۳۔۹۶

[۲۱] ایضاً ۲۴۔۴۸

[۲۲] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۲۱ و ۵۱۹

[۲۳] قرآن مجید ۳۰۔۴۳ نیز کامل الہبر و ص ۲۹۱، بلاذری کی کتاب (انساب الاشراف؟ بحوالہ لامنس (صفحہ ۳۴ و ۳۷

[۲۴] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰،

[۲۵] قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۳۴

[۲۶] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۷۵ تا ۷۶، ابونعیم کی المنتقی مخطوطہ بزم ادب، حیدرآباد دکن ورق نمبر ۲۰۵ تا ۲۰۶

[۲۷] دیورڑے کی فرانسیسی کتاب عرب ص ۱۰۱ عمود اول

[۲۸] یہ بت بہت چھوٹے ہوں گے، چنانچہ تاریخ طبری ص ۱۳۹۵، اور کتاب الاغانی ۱۴/۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ احد کے دن ابوسفیان ان کو اٹھائے لئے جارہا تھا۔

[۲۹] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۵ کلبی کی کتاب الاصنام برموقع

[۳۰] فلپسن کی انگریزی کتاب ''قدیم یونان اور روما میں بین المما لک قانون اور رواج'' جلد ۱

ص ۲۸ وارڈ فاولر انگریزی کتاب ''شہری مملکت'' برموقع ، ہیالیڈے کی ہسٹری آف دی ورلڈ شائع کردہ ہیامرٹن، باب یونانی شہری مملکتیں ص ۱۱۰۷۔

[۳۱] حدود حرم کا جوذکر ازرقی ص ۳۶۰ تا ۶۱، اور احمد ابن محمد الخضر اوی کی العقد الثمین فی فضائل البلد الامین (مطبوعہ قاہرہ ۱۲۹۰ء) ص ۱۳ میں ہے اس سے یہ اندازہ کیا گیا۔

[۳۲] ہسٹری آف دی ورلڈ، ص ۱۱۰

[۳۳] مراۃ الحرمین ۱/۱۷۸ نیز دیکھئے کوئی نقشہ شہر مکہ۔

[۳۴] قطب الدین کی کتاب مذکورۂ بالا، ص ۷

[۳۵] تاریخ طبری، ص ۱۰۹۷، نیز قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۳۴

[۳۶] قطب الدین کی کتاب مذکورہ، ص ۳۴ [۳۷] ایضاً

[۳۸] معارف ابن قتیبہ، ص ۳۱۳ (مطبوعہ یورپ)

[۳۹] قصی کے حالات کے لئے دیکھئے مارٹن ہارٹ مان کا مضمون جرمن رسالہ اشوریات Z.F. Assyriologie) جلد ۲۸ ص ۴۳ تا ۴۹

[۴۰] ابن عبدربہ کی العقد الفرید، جلد ۲، ص ۴۵ تا ۴۶، اور زبیر بن بکار کی انساب قریش مخطوطہ استنبول جس کا حوالہ الامنس نے اپنی فرانسیسی کتاب مجلس سہ گانہ (Friumvirat) ص ۱۱۴ میں دیا ہے۔

[۴۱] ابن ہشام، ص ۸۰، ۸۳ طبری، ص ۱۰۹۹، ابن سعد جلد اول حصہ اول، ص ۴۹ اور اخبار مکہ مطبوعہ یورپ مولفہ ازرقی ص ۶۵

[۴۲] سیرۃ ابن ہشام، ص ۸۳، تاریخ طبری، ص ۱۰۹۹، طبقات ابن سعد جلد حصہ اول، ص ۴۱، جغرافیہ۔

[۴۳] تاریخ طبری ص ۱۱۳۴، سیرۃ ابن ہشام، ص ۶۷، ۷۶، ۷۷، ۷۸

[۴۴] ازرقی، ص ۶۶ (اموربستہ) [۴۵] العقد الفرید جلد ۲، ص ۴۵ تا ۴۶

[۴۶] شابود (Chabot) کی فرانسیسی کتاب پالمیرا کے کتبوں کا انتخاب ص ۲۴، وغیرہ

[۴۷] لامنس کی کتاب مکہ، ص ۶۹ [۴۸] مغازی واقدی، ص ۵۹ سطر ۳

[۴۹] طبقات ابن سعد جلد ۲ حصہ اول ص ۲۷ حمید اللہ کی فرانسیسی کتاب ''اسلامی سیاست خارجہ بہ عہد نبویؐ وخلافت راشدہ''، ص ۴۷ نیز الوثائق السیاسیہ بر موقع

[۵۰] دیکھئے قرآن مجید ۲/۱۳۰، ۳/۴۵، ۴/۱۲۵ وغیرہ

[۵۱] قرآن مجید ۶۰، ۶۶، ۱۰۹، ۷/۱۲۷، ۲۷، ۳۷/۱۱، ۲۴، ۳۳/۲۳ وغیرہ

[۵۲] قرآن مجید ۲/۲۴۶، ۲۰/۲۸ [۵۳] قرآن مجید ۲/۲۳۳، ۲۹/۴

[۵۴] قرآن مجید ۱۲/۴۳، ۲۹، ۳۲/۲۷ [۵۵] الفاسی کی اخبار مکہ، ص ۱۰۹

[۵۶] لامنس کی کتاب مکہ، ص ۷۹ [۵۷] ازرقی کی اخبار مکہ، ص ۶۴، ۶۵، ۶۵، ۴۶۵

[۵۸] کتاب الاشتقاق، ص ۹۷ [۵۹] ازرقی، ص ۶۴، ۶۵، ۴۶۵

[۶۰] قرآن مجید ۱۵/۴۶

[۶۱] ابن درید کی کتاب الاشتقاق، ص ۹۷ سطر (۶)

[۶۲] ابن عساکر کی تاریخ دمشق جلد (۴) ص ۴۱۹ سطر (۲)

[۶۳] اس کے مماثل ہندوستانی کہاوت ''ساٹھا پاٹھا'' کی طرف توجہ منعطف کرائی جاسکتی ہے

[۶۴] پلوٹارک کی سوانح عمریاں دیکھئے لائیکرگس کے حالات، نیز وارڈ فاؤلر کی انگریزی کتاب ''شہری مملکت''، ص ۷۱ تعلیق نمبر ۲

[۶۵] دیوان حسان بن ثابت مطبوعہ یورپ نظم نمبر ۱۴۵، ۱۸۳

[۶۶] کتاب الاشتقاق مؤلفہ ابن درید، ص ۹۷

[۶۷] چنانچہ مثال کے طور پر ہجرت سے قبل رسول کریم ﷺ پر قاتلانہ حملہ کرنے کی پخت و پز بھی یہیں ہوئی تھی۔ [۶۸] لامنس کی کتاب مکہ ص ۷۲۔

[۶۹] مغازی واقدی شائع کردہ فون کریمر ص ۲۳

[۷۰] کتاب نیلگری مؤلفہ حمید اللہ شائع کردہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد، دکن

[۷۱] سیرۃ ابن ہشام، ص ۸۰

[۷۲] تفصیلات کے لئے دیکھئے لامنس کی کتاب مکہ ص ۸۸ و مابعد

[۷۳] غریب الحدیث ورق نمبر ۱۹۱ (بحوالہ مکہ مولفہ لامنس ص ۷۳)

[۷۴] قرآن مجید ۹۶/۱۷ [۷۵] قرآن مجید ۲۹/۲۹

[۷۶] قرآن مجید میں نادیٰ، نادوا، نادتیم، نادینا، نادت، ینادی، ینادون، نودی، تنادوا، ندا، ندیاً، منادی، تناد کے لفظ بھی بار بار آئے ہیں۔

[۷۷] سیرۃ ابن ہشام، ص ۲۴۳، ۲۴۶، کتاب الاغانی ۱۴/۹۹

[۷۸] اغانی ۵۲، ۸/۵۳

[۷۹] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۳۷۶، اغانی ۱۳/۱۱۲ اور لانس کی کتاب مکہ ص ۸۸ و مابعد تعلیق ۸

[۸۰] دیکھئے جلد اول ص ۱۰۴ (بحوالہ وارذ فاؤلر ص ۴۸ تا ۴۹)

[۸۱] دیکھئے لامنس کی کتاب مکہ ص ۱۶۰ تعلیق ۳ نیز قرآن ۱۲/۷۰، ۴۳/۷

[۸۲] ابوعبیدہ کی کتاب الاموال ص ۴۵۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ۹ ھ تک بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔

[۸۳] تاریخ یعقوبی جلد (۱) سطر ۱۴ نیز ص ۲۹۰، ۲۹۲، لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۴، ۶۵ اسی مولف کی فرانسیسی کتاب "گھوارہ اسلام جلد (۱) ص ۲۲۹، کتاب الاخانی جلد (۱۱) ص ۶۵ سطر ۵، ابن ورید کی کتاب الاشتقاق ص ۹۴ مفضویات مطبوعہ یورپ ۲/۳

[۸۴] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۴ [۸۵] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰، تاریخ طبری ۱۰۹۵

[۸۶] مسعودی کی التنبیہ والاشراف ص ۲۹۳

[۸۷] ابن عبدربہ کی العقد الفرید جل ۲ ص ۴۵ اور مسعودی کی مروج الذہب ۱۹۹ تا ۳/۱۲۰، ۴/۱۲۱

[۸۸] ازرقی کی اخبار مکہ ۶۴ ...... لامنس کی کتاب مکہ ۶۹

[۸۹] ازرقی ص ۶۴ [۹۰] روض الانف ۱/۱۴۶

[۹۱] (لیتوجوہ) صحیح بخاری ۹/۲۰، ۷، تاریخ طبری ص ۱۵۱۱ و مابعد، سیرۃ ابن ہشام ص ۷۲۷، نیز قرآن مجید ۸/۶۳ کی تشریح کسی تفسیر میں

[۹۲] اسپرنگر کی جرمن سیرۃ و تعلیمات محمدیہ ۱/۲۴۹

شہری مملکت مکہ
(۲)

مذہبی نظام:

اس قدیم زمانہ میں جب ہر شخص اپنی آپ حفاظت کرنے پر مجبور ہوا کرتا تھا، کسی ملک کا سب سے اہم کشوری انتظام وہاں کے معبد کا انتظام ہوا کرتا تھا۔ سدانہ، حجابہ، سقایہ اور عمارۃ البیت اسی سے متعلق تھے، ان کے علاوہ ایسار اور ازلام کے چرچے بھی ہم سنتے ہیں، جن سے ڈیلفی وغیرہ کے یونانی مندرون کی دیوبانی Oracles کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اسی طرح وہاں ایسے بھی افراد پائے جاتے تھے جو مافوق الفطرت طاقتوں کے مالک ہونے کا زعم کرتے تھے، جیسے عائف، کاہن، عراف، خریت، منجم بلکہ خود ان لوگوں کی بھی خاصی تعداد جو شاعر کہلاتے تھے، اور ان لوگوں کی مزعومہ قابلیتوں سے وقت بوقت زود یقین اہل ملک فائدہ اٹھایا کرتے تھے، وہاں کے لوگوں کا ہاتف پر بھی اعتقاد تھا جو ایک نظر نہ آنے والے مگر آواز سے باتیں سنانے والے کا نام تھا، بھینٹ بھی چڑھائی جایا کرتی تھی، جسے قربان کا نام دیا گیا تھا، ملک کے دیگر عام اوہام کا تفصیلی ذکر شاید یہاں غیر ضروری ہوگا۔

سدانہ سے مراد معبد کی رکھوالی اور حجابہ سے مراد معبد کی دربانی ہوتی تھی، اور دروازے کی چاپی پاس ہونے سے جس کو چاہے معبد کے اندر جانے دیا جا سکتا تھا اور

اس سلسلہ میں دربان کو خاصی آمدنی بھی ہو جاتی تھی، یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ قصی نے کعبہ کی دربانی کا عہدہ ایک مشک بھر شراب کے عوض خرید لیا تھا۔[۱] اور یہ بھی ایک مشہور واقعہ ہے کہ کس طرح جناب رسالت مآب ﷺ نے فتح مکہ کے بعد دروازہ کعبہ کی چابی وہاں کے قدیم موروثی دربان ہی کو واپس کر دینی مناسب خیال فرمائی تھی[۲] یہ اب تک اسی خاندان میں چلی آ رہی ہے اور سعودی دور نے بھی تبدیلی نہ کی۔

سقایہ سے مراد کعبے کی زیارت کے لئے حج یا عمرے کے زمانہ میں آنے والوں کو پانی پلانا، اور عمارۃ البیت سے مراد حرم کعبہ کا عام انتظام کرنا تھا، ان دونوں چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے[۳] حجاج کو پانی پلانا مکہ میں بھی ایک منفعت بخش فریضہ ہوگا، کیونکہ وہاں پانی کی عام قلت ہے اور زمزم کے کنویں کا مقدس پانی ہر حاجی کو بھی درکار رہتا ہوگا، پالمیرا میں ایک مماثل فریضے کی انجام دہی سے سالانہ آٹھ سو طلائی اشرفیوں کی معقول آمدنی ہو جایا کرتی تھی[۴] غالباً مکہ کے باشندے خود اس سلسلہ میں کوئی فیس ادا کرنے سے مستثنیٰ رہتے ہوں گے، ابن عبدربہ نے بیان کیا ہے کہ عمارۃ البیت کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ افسر متعلقہ وقت بوقت حرمِ کعبہ میں گھوم پھر کر نگرانی کیا کرے، اور دیکھے کہ کوئی شخص جھگڑے، گالی گلوچ، یا بلند شور اور پکار سے اس کے تقدس کو توڑ تو نہیں رہا ہے، اور یہ کہ ایک زمانہ میں یہ فریضہ جناب رسالت مآب ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ انجام دیا کرتے تھے۔[۵]

مجھے معلوم نہیں کہ اسلام سے پہلے جو حج ہوا کرتا تھا، وہ بھی اتنے ہی ارکان و مراسم پر مشتمل ہوا کرتا تھا جتنا اب ہے، یا یہ کہ اس کی بعض چیزیں زمانہ اسلام کا اضافہ ہیں اور وہ چیزیں اسلام سے پہلے حج سے الگ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہوں، اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں طوافِ کعبہ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی دونوں کے لئے ایک لفظ تطوف یعنی طواف استعمال کیا گیا ہے (چنانچہ صفا و مروہ کے سلسلہ میں یطوف بھما وارد ہوا ہے[۶] تو طوافِ کعبہ کے لئے

لیطوفوا بالبیت العتیق [۷] کے الفاظ آئے ہیں) اس کے باوجود صفا و مروہ کا طواف نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے مابین سات مرتبہ آنا جانا پڑتا ہے، یہ چیز بھی قابلِ ذکر ہے، کہ صفا و مروہ کے سلسلہ میں قرآن مجید نے **لاجناح علیه ان یطوف بهما** یعنی ''کوئی حرج نہیں کہ ان دونوں کا طواف کیا جائے'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں، شاید پہلے ان کا بھی طواف ہوا کرتا تھا، جس طرح کعبہ کا لیکن اب قرآن مجید کے اس حکم کی تعمیل سنت نبوی کی روشنی میں طواف کی جگہ سعی سے کی جاتی ہے حج کے سلسلہ میں افاضہ و اجازہ بھی [۸] دو عہدے تھے، اور ان کو یہ اہمیت حاصل تھی، کہ عہدہ داران متعلقہ اور ان کے قبیلہ والے سب سے پہلے روانہ ہو سکتے تھے، جب کہ بھیڑ بھاڑ کم ہوتی تھی، لیکن مجھے نسی کے عہدے پر زیادہ تفصیل سے کچھ عرض کرنا چاہیے۔ [۹]

اسلام سے پہلے مکہ والوں کا تمدن جس قدر افتادہ حالت میں تھا، اس کے باوجود انہیں، شمسی اور قمری سالوں کا فرق محسوس ہو چکا تھا، چنانچہ ایک سرسری اندازے کے مطابق وہ ہر تیسرے سال ایک تیرہواں مہینہ بھی قائم کر لیا کرتے تھے، جو محرم اور صفر کے مابین ہوا کرتا تھا، کبیسہ بنانے کا یہ کام مختلف مراسم کے ساتھ انجام پاتا تھا، اور اس کا اعلان جس افسر کے فرائض میں داخل تھا، وہ قبیلہ بنی فقیم سے تعلق رکھا کرتا، اور قلمش [۱۰] یا قلنبس [۱۱] کہلاتا تھا، شاید یہ لفظ **Calendus** (یعنی کیلنڈر والا) کا بگڑا ہوا ہے۔

کبیسہ بنانے کے سلسلہ میں ہمیں اشہر حرم یعنی حرام اور مقدس مہینوں کا بھی کچھ ذکر کرنا چاہیے دنیا کے دیگر ممالک کی طرح معبد کعبہ کی زیارت کے لئے جو مذہبی حج ہر سال ایک معینہ زمانہ میں کیا جاتا، وہ ساتھ ہی ایک تجارتی میلہ کی بھی حیثیت اختیار کر لیتا، کیونکہ کچھ تو حج کے لئے آنے والے نو وارد ون کی ضروریات خور دِ نوش کے لئے درآمد کی بھی ضرورت ہوتی اور فروخت گاہوں کی بھی اور خود نو وارد حجاج بھی اپنے ساتھ تجارتی سامان لے کر حج کے ساتھ خانگی کاروبار بھی انجام دے لیتے، قرآن

مجید نے بھی اس قدیم طرز عمل کو جاری رہنے دیا، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی اور قرار دیا کہ [۱۲] لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم یعنی ''کوئی حرج نہیں، کہ تم اپنے رب کا فضل حاصل کرنے کی کوشش کرو'' اور تجارتی کاروبار کے نفع کو خدا کا فضل قرار دیا، اس طرح ہر سال جو میلہ لگا کرتا اس سے میلہ لگنے کے مقام کے سردار کو جملہ تجارتی درآمد کا عشر یعنی دسواں حصہ محصول درآمد میں مل کر خوب آمدنی ہوجایا کرتی تھی، اس لئے وہ ہر ممکنہ ذریعہ سے اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ بیرونی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں آنے کی بڑی سے بڑی ترغیب ہو، بدرقہ یا خفارہ کا نہایت منظم اور ترقی یافتہ ادارہ بھی جس میں قریش مکہ کو کافی دخل تھا، اس بارہ میں خاصا مددگار ثابت ہوتا تھا، حرام مہینوں کا ادارہ بھی اسی غرض کے لئے وجود میں آیا تھا، کہ اس زمانہ میں لوٹ مار کو مذہبی نقطہ نظر سے ممنوع قرار دینے کے باعث اجنبیوں اور تاجروں کو اس میلہ میں آنے کی ترغیب ہو، امن کا سب سے طویل زمانہ جو تاریخ نے محفوظ کر رکھا ہے، وہ حج کعبہ کے سلسلے میں مسلسل تین مہینوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا، [۱۳] دیگر معبدون کے حج نسبتاً کم مدت تک امن و امان قائم کراسکتے تھے، اس سے لامنس [۱۴] اور اس کے ہم خیالوں کے مسلسل اور پر اصرار انکار کے باوجود یہ بات صاف طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ، حج کعبہ کو کس طرح غیر معمولی اور امتیازی اہمیت حاصل تھی، اور وہاں نہ صرف پورے جزیرہ نمائے عرب بلکہ شام اور مصر تک [۱۵] سے حجاج آیا کرتے تھے، ضمناً یہ بھی بیان کردیا جاسکتا ہے کہ قریش کے چند ممتاز خاندانوں کو مسلسل آٹھ مہینوں تک ''اشہر حرم'' حاصل رہتے تھے، اور تاریخ نے اس کو بسل کے نام سے یاد رکھا ہے [۱۶] غالباً یہ خانوادے طویل تجارتی سفر کے لئے قافلے لایا اور لے جایا کرتے ہوں گے، اور جن علاقوں سے گزرتے تھے، وہاں والوں کا سامان بھی کوئی معاوضہ و کمیشن لئے بغیر کاروبار تجارت کے لئے لایا اور لیجایا کرتے ہوں گے، جس کے باعث اہل قبائل بھی ان کے چھیڑنے سے باز رہتے ہوں گے،

کمیشن کے بغیر قریش کا بعض قبائل کے سامان تجارت کو لانا اور لے جانا ایک تاریخی واقعہ ہے [۱۷] بہرحال ان تمام چیزوں سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملک میں امن و مسالمت کی جانب ایک بین رجحان پایا جاتا تھا، نہ کہ ہر شخص کا باقی تمام دنیا سے اپنے کو برسرپیکار خیال کرنا۔

یہ واقعی ایک بدبختی کی بات تھی گو عمداً اس کا ارادہ نہیں کیا گیا ہوگا، کہ ہر تیسرے سال جب قلمس حج کے مہینہ ذی الحجہ میں اعلان کرتا تھا کہ آئندہ مہینہ محرام الحرام نہیں ہوگا، بلکہ ایک معمولی اور غیر حرام مہینہ ہوگا جس کے دوران میں بدویوں کے لئے لوٹ مار سے باز رہنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اس طرح تین حرام مہینوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور نتیجتاً ان لوگوں کو دشواریاں پیش آتیں جو جلد رخصت ہونا چاہتے۔

مکہ والے تین مسلسل اور چوتھے ایک علیحدہ مہینہ کو مقدس تسلیم کرتے تھے، چنانچہ ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم عرفات کے حج اکبر [۱۸] کے لئے اور رجب حج اصغر یا عمرے [۱۹] کے زمانہ میں جب کہ لوگ کعبہ کی زیارت کو آتے، قریشی اثر سے ان مقدس مہینوں کا قریب قریب پورے عرب میں احترام کیا جاتا۔ دیگر مقامات کے حج اور میلہ کے سلسلہ میں بھی حرام مہینے ہوتے تھے۔ اور اسی لئے جناب رسالت مآب ﷺ کے خطبہ حجتہ الوداع میں ''رجب مضر'' کا محاورہ برتا گیا ہے [۲۰] تاکہ اس کو ''رجب ربیعہ'' سے ممتاز کیا جائے، یہ غیر قریشی حرام مہینے نسبتاً کم سختی سے ملحوظ رکھے جاتے تھے، جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا قریشی حرام مہینوں کو عام طور پر ملحوظ رکھا جاتا تھا بجز اس کے کہ طے اور خشعم کے دو ضرب المثل لٹیرے قبائل اس حرمت و امتناع کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ [۲۱] عام عربوں کے برخلاف یہ دونوں قبیلے چونکہ عیسائیت بڑی حد تک قبول کر چکے تھے، اس لئے بدوی اوہام درواجات کی وہ پروا نہیں کرتے ہوں گے، لیکن عیسائیت اور لوٹ مار کا میل کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، قریشی مہینوں کا

احترام بے شبہ اس لئے تھا کہ قریشی کاروبار اور تجارتی تعلقات بہت پھیلے ہوئے تھے اور ان کی حلیفوں کا جال بھی خوب وسیع تھا، اس سلسلہ میں محمد بن حبیب کی کتاب المجر کا ایک اقتباس دلچسپی کا باعث ہوگا:

''ہر تاجر جو یمن یا حجاز سے (شمالی عرب کے میلے دومتہ الجندل کو) جانا چاہتا، تو وہ جب تک مضری قبائل کی سرزمین سے گزرتا رہتا تو قریشی بدرقے حاصل کرتا، کیونکہ کوئی مضری قبیلہ نہ تو کسی قریشی تاجر کو ستاتا اور نہ کسی مضریوں کے حلیف کو چنانچہ قبیلہ کلب والے کسی ایسے شخص کو نہیں ٹوکتے، کیونکہ وہ قبیلہ بنی الجشم کے حلیف تھے، اسی طرح قبیلہ طے والے بھی ان کو نہیں ستاتے، کیونکہ ان کی بنی اسد والوں سے حلیفی تھی۔''

یہ چیز دوبارہ یاد دلائی جاسکتی ہے، کہ طے اور خثعم [۲۲] والے عرب کے حرام مہینوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے، مگر قریشیوں کو اس حلیفی کے باعث سال بھر ہی ان سے امن رہتا، محمد بن حبیب نے مزید برآن بیان کیا ہے۔

''اگر مسافر بنی عمرو بن مرثد کا خفارہ حاصل کر لیتے، تو اس پورے علاقے میں جہاں قبائل ربیعہ بستے تھے، انہیں حفاظت حاصل تھی،...... اگر بحرین کے سوق مشقر جانا ہوتا تو قریشی خفارہ ہی حاصل کیا جاتا،...... اگر جنوبی عرب کے سوق مہرہ کو جانا ہوتا تو بنی محارب کا بدرقہ حاصل کیا جاتا،...... حضرموت کے سوق رابیہ کو جانے کے لئے قریش قبیلہ بنی آکل المرار کا خفارہ حاصل کرتے، اور دیگر لوگ کندہ کے آلِ مسروق کا اس طرح ان دونوں ہی قبائل کو عزت حاصل تھی، لیکن قریشی سرپرستی کے باعث آکل المرار کو اپنے حریفوں پر فوقیت حاصل ہوگئی [۲۳] ...... عکاظ عرب کا سب سے بڑا میلہ ہوا کرتا تھا اور وہاں قریش، ہوازن، غطفان، عضل، ولیش، جبا، مصطلق، احابیش اور دیگر قبائل آیا کرتے تھے''۔ [۲۴]

اگر چہ قبہ یعنی منڈپ یا شامیانہ اور اعنہ یعنی گھوڑے کی لگاموں کے اداروں

کا منشاء عرب مولفوں [۲۵] نے یہ بیان کیا ہے کہ اول الذکر کا مطلب ایک ڈیرہ لگا کر کسی عام قومی ضرورت کے لئے چندہ جمع کرنا ہوتا، اور آخر الذکر سے مراد سوارہ فوج کی افسری ہوتا، لیکن غالباً لامنس کا خیال [۲۶] درست ہے کہ اصل میں قبہ سے مطلب وہ شامیانہ ہوتا ہوگا، جو جنگ یا عید کے موقع پر قابلِ حمل ونقل بتوں کے اوپر سایہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا، اور اعنہ سے مراد وہ امتیاز تھا کہ کسی بت کو گھوڑے پر رکھ کر جلوس سے لیجائیں تو اس گھوڑے کی لگام پکڑے چلیں۔

مقدس شامیانے کا ذکر عرب ادبیات میں کچھ شاذ و نادر نہیں ہے، یہ باور کرنا کافی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ مکی سماج جس پست اور ابتدائی حالت میں تھا، اس کے باوجود وہاں سپہ سالارِ فوج اور سوار فوج کا افسر دو الگ الگ عہدے پائے جاتے ہوں، [۲۷] اسلام آنے کے بعد جب زمانہ جاہلیت کی بہت سی رسمیں مٹ گئیں اور چند صدی بعد جو مولف پیدا ہوئے انہیں ان چیزوں کا کوئی علم نہ ہو سکا تو ذہانت سے کام لے کر انہوں نے اکثر قدیم اصطلاحات کا منشاء ان کے لغوی معنوں کو سامنے رکھ کر واضح کرنے کی کوشش کی، اور چونکہ انہیں ان اصطلاحات کا پس منظر معلوم نہ تھا، اس لئے بعض وقت وہ غلطی کر جاتے تھے، بہر حال ہمارے مولف بیان کرتے ہیں کہ عنہ کا عہدہ زمانہ جاہلیت میں خالد بن الولید کو وراثت میں ملا تھا، یہ استنباط غالباً اس واقعہ کی بنا پر ہے کہ احد کی لڑائی میں خالد بن الولید ہی نے مکہ والوں کے رسالہ کی قیادت کی تھی، [۲۸] لیکن احد کو چھوڑ کر بدر یا خندق یا کسی اور لڑائی میں قریش کے ساتھ گھوڑے کبھی اتنی تعداد میں نہ تھے، کہ ان کا ذکر کیا جا سکے، عرب میں گھوڑے عام طور پر ایک تعیش ہی کی چیز سمجھے جا سکتے ہیں، یوں بھی قبہ اور عنہ دونوں عہدے عرب مولفین کے بیان کے مطابق ہمیشہ ایک ہی شخص کو حاصل ہوا کرتے تھے، [۲۹] اور ظاہر ہے کہ کسی شخص کا افسر رسالہ اور افسر چندہ دونوں ہونا کوئی ایسا ضروری امر نہیں، کیونکہ یہ چیزیں لازم وملزوم نہیں ہیں۔

نظامِ مالیہ:

کسی مملکت کے نظم ونسق میں مالیہ کی اہمیت قدیم ہی سے رہی ہے، ذہانت کے پتلے قصّی [۳۰] نے، کہتے ہیں کہ مکہ والوں پر ایک سالانہ محصول لگانے کا بہت اچھا بہانہ ڈھونڈ لیا تھا کہ حج کے زمانہ میں جو غریب حجاج آئیں، ان کی خبر گیری اور بلدیہ کی طرف سے حجاج کی عام ''ضیعہ'' یعنی ضیافت جس کا عرب کے دیگر حصوں میں بھی وہاں کے سرداروں کی طرف سے عام رواج تھا مصارف [۳۱] میں سب مل کر حصہ لیں، جو بچت ہوتی ہوگی، اس سے یقیناً سردار کا خزانہ معمور ہوتا جاتا ہوگا۔ قصّی کا یہ عہدہ خاندانِ نوفل [۳۲] میں متوارث ہونے لگا تھا۔ اور شاید بی بی خدیجہ کی ضرب المثل دولت بھی اسی خاندانی اندوختہ کا نتیجہ ہوگی، یعقوبی [۳۳] نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ قصّی نے جب بعض بدعتیں اختیار کیں، اور حرم کعبہ کے قریب رہنے کے لئے عمارتیں تعمیر کرلیں، تو باہر سے آنے والے حجاج کی ناراضی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس نے بلدی ضیافت کی تجویز پیش کی تھی، بہرحال جب یہ رواج پڑ گیا تو قصّی اور اس کے جانشین اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، یہ محصول رفادہ کہلاتا تھا۔

قصّی کو مال لاوارث کا بھی مستحق تسلیم کر لیا گیا تھا اور جو اجنبی مکہ میں لاوارث مرجاتے ان کا مال قصّی ہی کو مل جاتا [۳۴] شہر مملکتوں اور خاص کر میلہ کے زمانہ میں جو عشر یا محصول درآمد لیا جاتا وہ بھی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا، کہتے ہیں کہ مکہ میں زمانہ ماقبل تاریخ کے عمالقہ [۳۵] بھی عشر لیا کرتے تھے، جرہم اور قطورا کے دو قبیلوں نے مکہ میں مشترکہ یا وفاقی حکومت قائم کی تو بھی انہوں نے شہر کے دو حصے کر کے آپس میں بانٹ لئے تھے اور جس حصہ سے جو تاجر آتا، اس کا عشر اسی حصہ والے قبیلہ [۳۶] کو حاصل ہوتا، قصّی کے زمانہ میں اس تقسیم کی ضرورت نہ تھی، اور پورے شہر کا وہ اکیلا سردار تھا [۳۷] ۔ ظاہر ہے کہ خود شہر مکہ کے باشندے محصول درآمد سے مستثنیٰ تھے [۳۸] محصولِ درآمد لینے کا یہ رواج عام طور پر عرب کے دوسرے شہروں

میں بھی نظر آتا ہے، اور وہ عموماً سامان کی مالیت کا ۱۰/۱ ہوا کرتا تھا[۳۹] ایک مرتبہ مکہ میں سامان بلا محصول درآمد کرنے کا ایک دلچسپ واقعہ ازرقی نے بیان کیا ہے[۴۰] کہ جب ایک مرتبہ کعبہ میں آتشزدگی ہوئی، اور پھر طغیانی نے اس کو بالکل منہدم کر دیا تو مکہ والوں نے شعیبہ (جدہ) کی بندرگاہ پر طوفان میں آ کر ٹوٹنے والے ایک جہاز کو خرید لیا تھا۔ اور جہازیوں کو اجازت دی تھی کہ اپنا بچا کھچا مال مکہ لا کر بیچیں اور ان سے کوئی عشر نہ لیا جائے۔

قومی معبد پر جو چڑھاوے ہوتے، ان کی حفاظت کے لئے بھی ظاہر ہے کہ ایک افسر کی ضرورت ہوتی[۴۱] چنانچہ یہ عہدہ جو"اموال مجرہ" کہلاتا تھا، موروثی طور پر قبیلہ بنی سہم میں چلا آتا تھا۔

آمدنی کا ایک اور ذریعہ جو اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی تھا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کہ کوئی اجنبی شخص کعبہ کی زیارت کو آتا، تو اسے یا تو کسی مکہ والے کا لباس حاصل کر کے اس میں طواف کرنا پڑتا، ورنہ اپنے غیر مقدس اور گناہ آلود لباس کی جگہ کامل برہنگی کی حالت میں یہ رسم انجام دینی پڑتی، چاہے مرد ہو کہ عورت[۴۲] اور ظاہر ہے کہ مکہ والے اپنا لباس مفت نہیں دیا کرتے تھے مکہ والوں نے بیرونی حجاج کے قیام و طعام کے لئے بھی مصارف دہندہ مہمانوں کا طریقہ رائج کر لیا تھا، اور ان کے مہمان انہیں کپڑوں کا جوڑا قربانی کا جانور یا کوئی اور چیز اس کے معاوضہ میں دیتے تو اسے حریم[۴۳] کا نام دیا جاتا تھا۔

نظام عدل گستری:

مجلس حکومت (یا مجلس شورائے عمومی) اور عدالت میں باہم فرق کرنے کی ضرورت ہے آخر الذکر کا مقصد صرف جرائم کی ذمہ داری اور دعووں میں حقوق کا تعین ہوا کرتا تھا اور بس، دیگر ممالک کی طرح عرب میں بھی پنچائیت اور حکومت دونوں کے

لئے ایک ہی لفظ پایا جاتا تھا، چنانچہ لفظ حکم کے معنی حکومت کرنے اور مقدمہ کا فیصلہ کرنے، دونوں کے ہیں[۴۴]۔ ہر قبیلہ کا سردار اس کا پنچ بھی ہوا کرتا تھا[۴۵] لیکن بین القبائل جھگڑوں میں بہر حال اس کی ضرورت ہوتی تھی کہ کسی دو قبیلوں کے لئے اجنبی ثالث سے رجوع کریں۔ چنانچہ مختلف معبدون کی دیو بانی یا مشہور پنچون کے پاس لوگ اپنے مقدمے پیش کرتے، عرب میں کاہن، ہاتف، عائف، ازلام اور ایسار[۴۶] کے جو تذکرے ملتے ہیں، ان سے ہمیں ڈیلفی وغیرہ یونانی مندروں کی دیوبانی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ قصی کے بعد پورے شہر مکہ کے لئے کوئی واحد حاکم عدالت نہیں ہوسکا۔ جس کا باعث مختلف قبائل کی رقابتیں اور جھگڑے تھے، انہیں کے سبب سے وہ مشہور رضا کاروں کی جماعت قائم ہوئی جس کا نام حلفِ الفضول تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر اس مظلوم کی مدد کی جائے جو شہر مکہ کے حدود میں پایا جائے، چاہے ہو وہیں کا باشندہ ہو یا کوئی اجنبی، [۴۷] یہ ممکن تھا کہ حلفِ الفضول کا ادارہ ترقی کر کے ایک مستقل نظام کی حیثیت اختیار کرلیتا، لیکن جلدی ہی اسلام کا زمانہ آگیا، جس کے باعث یہ ادارہ غیر ضروری ہوگیا، کیونکہ اسلامی حکومت نے ایک نہایت منظم مرکزی نظام عدالت قائم کردیا، اور خود عہد نبوی میں پورا جزیرہ نما عرب اور جنوبی فلسطین اب مرکزی نظامِ عدالت کے تحت آچکے تھے۔[۴۸]

اسی سلسلہ میں عہدہ اشناق کا ذکر کیا جاسکتا ہے، کہتے ہیں کہ یہ موروثی طور پر حضرت ابو بکرؓ کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔[۴۹] اس کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے [۵۰] کہ جو کوئی ایسے جرم یا قابل ضمان فعل کا ارتکاب کرے جو قابلِ راضی نامہ ہوتو عہدہ دار اشناق اس بات کا تعین کرتا کہ کس پر اور کتنی مالی ذمہ داری عائد کی جائے اور پورا شہر اس کے تصفیہ کو مان لیتا، اور ملزم کا خاندان اس ہرجانہ کی ادائی کے لئے چندہ کرتا، یہ رواج اور مقامون پر بھی تھا، چنانچہ ہجرت کے بعد ہی شہری مملکت مدینہ کا جو تحریری دستور جناب رسالت مآب ﷺ نے مرتب اور نافذ فرمایا...... اور جس کا متن

ایک طویل دستاویز کی صورت میں لفظ بہ لفظ ہم تک پہنچا ہے [۵۱] اس میں بھی اس طریقہ کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مجھے معلوم نہیں کہ لامنس [۵۲] نے یہ مضحکہ خیز رائے کس ماخذ کی بناء پر قائم کی ہے، کہ عہدہ دار اشناق وہ ہرجانہ یا خون بہا اپنی جیب سے دیا کرتا تھا۔

نظام سفارت:

مکہ کے کشوری نظم ونسق میں ایک آخری لیکن خاصا اہم عہدہ ''سفیر و منافر'' کا ہوا کرتا تھا [۵۳]۔ کہتے ہیں کہ یہ عہدہ موروثی طور پر بنی عدی یعنی حضرت عمرؓ کے خاندان میں چلا آ رہا تھا، ابن عبدربہ نے مختصر اور جامع اور مانع الفاظ میں اس کی یوں تشریح کی ہے:

''جب کبھی کوئی جنگ چھڑتی تو وہ عمر کو اپنا سفیر مختار بنا کر بھیجتے، اور جب کبھی کوئی بیرونی قبیلہ قریش کی اولیت کو چیلنج دیتا، تو اس وقت بھی عمر ہی کو بطور ''منافر'' بھیجا جاتا تاکہ قریش کی طرف سے جواب دیا جائے اور اس جوابدہی میں جو کچھ کہا جاتا، اس کو قریش مان لیتے''۔ [۵۴]

نظامِ فوج:

جنگ اور فوج کے سلسلہ میں ہمارے ماخذ مختلف موروثی عہدوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ''شامیانہ'' اور ''لگام'' کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ان کے علاوہ عقاب لواء اور حلو:ن لنفر کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

عہدہ دار عقاب کا مطلب جھنڈا لے جانے والے سے تھا، اور کہتے ہیں کہ یہ عہدہ بنی [۵۵] امیہ میں متوارث تھا۔ بظاہر یہ وہ عہدہ دار تھا جو حالتِ امن میں قومی جھنڈے کا متولی ونگہبان ہوا کرتا تھا، اور ضرورت کے وقت اس کو اپنی نگرانی میں لہراتا

تا کہ فوجی اجتماع عمل میں آسکے، ورنہ کسی مہم اور عین معرکہ کارزار میں علم برداری کے فرائض کسی اور کے بھی سپرد کیے جاسکتے تھے[۵۶]۔

ہمارے مولف [۵۷] عقاب اور لواء میں فرق کرتے ہیں، اگر چہ دنوں کے معنی جھنڈے ہی کے ہیں، لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ ہر ایک ایک علیحدہ قبیلہ میں موروثی طور سے چلا آتا تھا۔ ممکن ہے عقاب سے مراد جنگی قومی جھنڈا ہو، اور لواء قبائلی جھنڈا ہو جس کا استعمال اس وقت ہوتا ہو، جب کہ قریش کے ساتھ دیگر حلیف قبائل بھی مہم میں شریک ہوں۔

ابن عبدربہ نے اپنے اس تذکرہ کو ایک عجیب و قریب عہدہ پر ختم کیا ہے، جس کا بیان ہمیں کسی دوسرے مولف کے ہاں نہیں ملتا:

''حلوان النفر (فوجی اجتماع کا معاوضہ) چونکہ (مکہ کے) عربوں پر زمانہ جاہلیت میں کوئی منفرد بادشاہ حکمرانی نہیں کرتا تھا، اس لئے جب کبھی کوئی جنگ ہوتی تو وہاں والے اپنے قبائلی سراروں میں قرعہ ڈالے اور کسی ایک کا انتخاب کرتے، چاہے وہ کمسن ہو یا بڑی عمر کا، چنانچہ یوم فجار کی لڑائی کے موقع پر بنی ہاشم کی باری تھی، اور قرعہ میں حضرت عباس نکلے جو اس وقت بچہ تھے۔ چنانچہ لوگوں نے ان کو ایک ڈھال پر بٹھایا اور اٹھا لے گئے''۔[۵۸]

مگر یہ توضیح کچھ دل کو نہیں لگتی۔ میرا خیال ہے کہ حلوان النفر سے مراد یہ فریضہ تھا، کہ اگر کسی مہم کے موقع پر کوئی شہری لڑائی میں حصہ لینے سے قاصر رہتا ہو، تو اس کو اجازت تھی کہ اپنا بدل کسی اور شخص کو روانہ کرے۔[۵۹] ممکن ہے کہ اس اجازت اور بدل کا انتخاب اور اس کا معاوضہ اور ہتھیار اور سامانِ سفر کی فراہمی کی نگرانی حلوان النفر کے عہدہ دار کے فرائض میں داخل ہو، ورنہ اجتماع کے معاوضہ اور بادشاہ اور فوج کی سپہ سالاری میں کوئی ربط نظر نہیں آتا۔

یہاں اس بات کا موقع نہیں ہے کہ قریش کے فوجی نظام [۶۰] اور قانونِ

جنگ و ناطرفداری کے اصول و نظائر کی تفصیل دی جائے۔ یہاں صرف ایک سرسری اشارہ چند چیزوں کی طرف کیا جاتا ہے۔ ''مرباع'' سے مراد مالِ غنیمت کا چوتھا حصہ ہوتا تھا، جو مہم کے سردار کو ملتا، باقی تین چوتھائی عام سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ ''فضول'' سے مراد ناقابل تقسیم کسرات ہوتے تھے۔ ''نشیط'' سے مراد وہ مالِ غنیمت تھا، جو دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے حاصل ہو، اور ''صفی'' سے مراد وہ منتخب چیز مثلاً کوئی تلوار وغیرہ ہوتی تھی، جو مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے مہم کا سردار اپنے لئے چن لینے کا مجاز ہوتا تھا، اور مرباع، فضول، نشیطہ اور صفی وہ امتیازت تھے جو کسی قبائلی لوٹ مار کی مہم کے قائد کو حاصل ہوتے تھے۔ [٦١] راس الحجر الخشنی، القعقاع التمیمی، اور زرار بن الخطاب الفہری کا ذکر ابن درید [٦٢] نے ان لوگوں کی فہرست میں کیا ہے جنہیں زمانہ جاہلیت میں مرباع لینے کا حق حاصل ہوتا تھا۔

یہاں لامنس [٦٣] کے ان تمام دلائل کی نقل کی جانی ممکن نہیں جو اس نے اپنے اس دلچسپ دعوی کی تائید میں پیش کئے ہیں کہ مکہ والوں نے حبشی غلاموں اور تنخواہ یاب نوکروں کی ایک مستقل فوج قائم کر رکھی تھی۔ اس کے مقالے میں کافی حوالے دیئے گئے ہیں لیکن اس قابل مگر بدقسمتی سے بے حد متعصب اور غیر ہمدرد یسوعی (Jesuite) پادری کا منشاء اس پوری کاوش سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ قریش ایک نہایت بزدل قوم تھی جو لڑائی سے جی چراتی تھی، لیکن چونکہ اس کے تجارتی مفادات بہت پھیلے ہوئے تھے، اس لئے اپنے مواصلات کی حفاظت کے لئے انہیں قوت کی ضرورت تھی، اس لئے انہوں نے غلاموں اور تنخواہ یاب لوگوں کی ایک فوج قائمہ مکہ میں تیار کرلی تھی۔ نپولین جیسے فاتح کو ابتدائی مسلمانانِ مکہ کی عظیم الشان فوجی فتوحات [٦٤] پر رشک آتا تھا۔ [٦٥] تو محض ایک متعصب یسوعی پادری کا خالد بن الولید، سعد بن ابی وقاص اور ابوعبیدہ جیسے مکہ والوں تک میں کسی بہادری کا نظر نہ آنا شپرہ چشمی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

سماجی نظام:

یونان والے اجنبیوں کو ''بار بار'' یعنی بر بریت پسند کہتے تھے، اور یونانی زبان میں دشمن کے لئے جو لفظ پایا جاتا ہے۔ اس کے لئے لغوی معنی بھی اجنبی ہی کے ہیں[٦٦] اس کے برخلاف عرب اجنبیوں کا ذکر کرنا چاہتے تو ''عجمی'' کی بے ضرر اصطلاح استعمال کرتے جس کے لغوی معنی ہیں ''گونگا'' تاکہ اجنبیوں سے اپنے آپ کو ممتاز کرلیں، چنانچہ لفظ عرب کے معنی فصیح اور من چلا، اس کے باوجود عرب میں بھی اور یونان میں بھی ہر جگہ اجنبی آتے رہتے، بلکہ بستے بھی رہتے۔

یونان میں وہ اجنبی جو وہاں آکر مقیم ہوجاتے تھے، شہریوں اور غلاموں کے بین بین ایک خاص طبقہ قائم کرتے تھے۔ ان کو اصطلاحاً میٹک **Matic** کہا جاتا تھا۔ [٦٧] یہ لوگ اور ان کے خاندان ان تمام حقوق سے مستفید ہوتے تھے، جو شہریوں کو حاصل تھے، البتہ انہیں نہ تو کوئی سرکاری عہدہ مل سکتا اور نہ وہ شہری انتخابات میں کوئی رائے دے سکتے، اور نہ کسی اراضی کے مالک ہی ہوسکتے، ان میں سے ہر ایک کے لئے یہ ضروری ہوتا کہ کسی شہری کو اپنا سرپرست بنائیں جو ان کے چال چلن کی ذمہ داری لے، ان کو سالانہ فی کس براہِ راست بارہ درہم مرد کے لئے اور چھ درہم غیر شادی شدہ عورت کے لئے محصول بھی دینا پڑتا۔ ان چیزوں کو چھوڑ کر اور باتوں میں انہیں شہریوں کی برابری حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی مسکونہ شہری مملکت کی فوج میں شریک ہوکر جنگ کرسکتے تھے اور اس کی تمام مذہبی پبلک تقریبوں میں حصہ لے سکتے تھے۔ [٦٨] عرب میں جو اجنبی آکر سکوت گزین ہوجاتے ان کو ''مولا'' کا نادیا جاتا تھا، عرب اور خاص کر مکہ والوں کے موالی کے ساتھ یونان کے مقابلہ میں کم سختی کا سلوک ہوتا تھا۔ چنانچہ ان پر کوئی خصوصی محصول عائد نہیں کئے جاتے تھے۔ ان کو اور ان کے سرپرستوں کو جملہ شہری حقوق حاصل رہتے تھے۔ مساوات کی حد یہ تھی کہ اجنبی اور اس کے سرپرست دونوں کے لئے ایک ہی لفظ مولا استعمال کیا جاتا تھا۔ البتہ یہ

تحدید بداہتہً پائی جاتی تھی۔ کہ کوئی اجنبی متوطن کسی اور نئے اجنبی کو اپنا مولا بنانے کا اور اپنی سرپرستی میں لینے کا مجاز نہ تھا۔ اس پابندی سے قطع نظر ہر اجنبی متوطن اپنے سرپرست کے خاندان کا ایک رکن بن جاتا۔ اور اسے وہ سب حقوق حاصل رہتے جو کسی اصلی شہری کو حاصل تھے۔ البتہ کسی نئے اجنبی کو اپنی پناہ میں لینے سے پہلے اسے خود اپنے سرپرست کی اجازت ضروری ہوتی۔[۶۹] اصل میں عرب یہ چاہتے تھے کہ اوروں کو اپنالیں، اور عرب بنا ڈالیں[۷۰]۔ اس کے برخلاف یونانیوں کو ان کے فلاسفہ نے کہہ رکھا تھا کہ قدرت ہی کا یہ منشاء ہے کہ اجنبی یونانیوں کے غلام بنیں[۷۱]

مزید براں یونان میں:

''کسی سیاسی وحدت کے ارکان میں اتحاد ابتداً اس لئے ہوتا تھا، کہ وہ ہم جد ہوتے تھے، اور ہم مذہب ہوتے تھے، وہاں کا سماج برادریوں میں بٹا ہوا تھا، یعنی رشتہ دار خاندانوں کے گروہ الگ الگ وحدت بناتے تھے، اور یہ تمام برادریاں ایک مزعومہ ہم نسبی کے باعث ایک بزرگ تر اتحاد میں شامل ہوجاتی تھیں جسے قبیلہ کہا جاتا تھا، خون کا رشتہ مذہبی رشتہ کے باعث مستحکم تر ہوجاتا تھا۔[۷۲]

مکہ کا اندرونی نظام اس سے بہت زیادہ پیچیدہ تھا۔ کیونکہ وہاں حسب ونسب کو غیر معمولی سماجی اہمیت حاصل تھی۔ ہر قبیلہ میں ہر دس دس آدمیوں پر ایک ''عریف'' ہوا کرتا (جس طرح روما میں Decurion) اور کہتے ہیں کہ ہر سو کا سردار قائد کہلاتا تھا۔ (جس کا مماثل روما میں Conturion ہوسکتا ہے) وہاں قبیلہ، بطن، فخذ، شعب[۷۳] وغیرہ کی شاخ در شاخ تنظیم وتقسیم پائی جاتی تھی۔ جن کی تفصیل عرب مولفین کے حوالہ سے وستن فیلڈ نے اپنی جرمن کتاب ''جدولہا سے نسب عرب کے'' اشاریہ کے دیباچہ میں بھی دی ہے۔

اسلام سے پہلے مکہ والوں میں مذہبی وحدت نہیں پائی جاتی تھی۔ اسی طرح وہاں کوئی مقدس کتاب یعنی تحریری قانون بھی نہیں پایا جاتا۔ جس کی تعمیل سب کریں۔

چنانچہ مکہ والوں میں بت پرست، مشرک، ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننے والے، خدا کو نہ ماننے والے، بلکہ خود لا مذہب اور دہریے بھی پائے جاتے تھے، ان کے علاوہ مجوسی، یہودی یا عیسائی مذہب بھی مختلف لوگوں نے اختیار کرلیا تھا، بہرحال وہاں کے عوام تمدن کے اس درجہ تک ضرور پہنچ چکے تھے، کہ ایک مشترک اور سب سے بڑے خدا کو بھی مانیں، جو چھوٹے چھوٹے قبائلی دیوتاؤں سے بھی بزرگ و برتر ہو، اور اس کو وہ اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔

سیاسی شعور بھی اس حد تک ترقی کرگیا تھا کہ ہر شخص مملکتی مفاد کو شخصی مفاد پر ترجیح دینا ضروری سمجھتا تھا، چنانچہ جب غیر متوقع طور پر مکہ والوں کو غزوۂ بدر میں شکست ہوئی تو انہوں نے اس قافلہ کا پورا منافع (جو عین اسی زمانہ میں شام سے ابوسفیان کی سرکردگی میں واپس آیا تھا، اور جس میں شہر میں بسنے والے تقریباً ہر قبیلے کا سرمایہ لگا ہوا تھا) جنگی تیاریوں کے چندے میں دے دینا منظور کرلیا۔[۴۷]

مکہ والے اپنے نوزائیدہ بچوں کو کسی صحرا میں بدویوں کے ہاں بھیج دیا کرتے تھے جہاں وہ بدویوں کے ہاتھوں پرورش پاتے تھے، صحرا کی پاک و صاف اور سادہ زندگی میں پلتے تو ان میں بدویوں کی بہت سی خوبیاں آجاتیں اور شہریوں کی مخلوط آبادی کی بہت سی برائیوں سے وہ بچپن کی تاثر پذیر عمر میں محفوظ رہتے۔ خود آنحضرت ﷺ نے بھی اپنی ابتدائی زندگی کے چند سال اسی طرح گزارے تھے، یہاں مماثلت کے لئے ان قوانین کی یاد تازہ کرائی جاسکتی ہے۔ جو مثلاً لائیکرگس نے یونان کے شہر اسپارٹا میں نافذ کئے تھے، اور جو اگرچہ انتہائی وحشیانہ تھے، مگر ان کا منشاء بھی نئی نسلوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت ہوتا تھا۔

کہتے ہیں کہ یونانی طبیعت کی امتیازی خصوصیت علم کی محبت تھی، جس طرح کہ فینیقیہ اور مصر والوں کا امتیازی خاصہ دولت کی محبت تھا۔ (ہندوستان میں بھی لکشمی یعنی روپے کی اب بھی باقاعدہ پوجا ہوتی ہے) اس کے برخلاف قریش یعنی باشندگانِ

مکہ کی امتیازی خصوصیت فنونِ لطیفہ اور ادبیات کی محبت معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہی فن نوازی تھی، کہ عتبہ بن ربیعہ ابن عبد شمس نے مکہ میں ایک دارالقواریر (شیش محل Crystal Palace) تعمیر کیا تھا۔ [۷۵] شعروشاعری ان کا اوڑھنا بچھونا ہو چلا تھا۔ چنانچہ بیت، مصرع، اسباب، اوتاد، فواصل کسی ڈیرے اور اس کے مختلف اجزاء کے بھی نام تھے۔ اور بیت اس کے مختلف حصوں کے بھی۔

زندگی کا مقصد یونانی فلسفیوں کی نظر میں دنیاوی آرام تھا۔ [۷۶] یہاں شاید قرآنی آیتوں کا حوالہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا جس میں اسلام سے پہلے کے عربوں کا مقصدِ زندگی اور خود اسلامی تصور حیات اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے:

''ان میں سے چند ایسے ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس دنیا میں بھلائی عطا کر، ان کو آخرت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا لیکن ان میں سے بعض اور ایسے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اس دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی اور ہم کو آتش دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ، ان کو ان کی کمائی کا حصہ ملے گا۔ خدا حساب و کتاب لینے میں بہت تیز ہے''۔ [۷۷]

حواشی:

[۱] تاریخ طبری ص ۱۰۹۴

[۲] دیکھئے سیرۃ نبوی کی کسی بھی کتاب میں فتح مکہ کے حالات

[۳] قرآن مجید ۹/۱۹

[۴] پالمیرا کے کتبوں پر شابو کی فرانسیسی کتاب ص ۳۰ بحوالہ مکہ مولفہ لامنس

[۵] العقد الفرید ۲/۴۶

[۶] قرآن مجید ۲/ ۱۵۸

[۷] قرآن مجید ۲۲/ ۲۹

[۸] سیرۃ ابن ہشام ص ۶، و مابعد

[۹] نسی یعنی قمری مہینوں کو کبیسہ کر کے شمسی بنانا عہد نبوی کی تاریخ پر جو اہم عملی اثرات ڈالتا ہے

اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد میں میرا انگریزی مضمون ''اسلام کے سیاسی تعلقات ایران میں'' اس موضوع پر عام معلومات کے لیے دیکھئے محمود آفندی کا (جو بعد میں محمود پاشا فلکی کے نام سے مشہور ہوئے) تحقیقی مقالہ فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۸۸۵ء ص ۱۰۹ تا ۹۲ بعنوان ''عربی کیلنڈر پر ایک یادداشت'' یہ مقالہ عربی میں بھی چھپا ہے، موبرگ کا جرمن زبان میں جامعہ لونڈ واقع سویڈن میں چھپا ہوا مقالہ بعنوان ''نسی اسلامی روایت میں'' حوالوں اور اس موضوع پر شائع شدہ مقالوں و کتابوں کی تفصیل کے لیے مفید ہے۔

[۱۰] عام طور سے قلمش اس شخص کا لقب سمجھا جاتا ہے جس نے عرب میں کبیسہ سال رائج کیا لیکن محمد بن حبیب نے کتاب المحبر (مخطوطہ برٹش میوزیم) میں قلامسہ بصیغہ جمع بھی استعمال کیا ہے۔

[۱۱] یہ قلمس کا مترادف ہے دیکھئے لسان العرب تحت کلمہ قلمس [۱۲] قرآن مجید ۲/ ۱۹۸

[۱۳] دیکھئے قرآن مجید ۹/ ۳۶ کی تشریح کسی تفسیر وغیرہ میں

[۱۴] دیکھئے لامنس کا مضمون ''مکہ کا فوجی نظام'' فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۹۱۶ء

[۱۵] ازرقی کی اخبار، مکہ ص ۱۰۷، سیرۃ ابن ہشام ص ۲۸۲، طبقات ابن سعد ۱/ ۱، ص ۱۴۵

[۱۶] سیرۃ ابن ہشام ص ٦٦، قاموس فیروز آبادی تحت کلمہ ''البسل''

[۱۷] طبقات ابن سعد ۱/ ۲، ص ۴۹

[۱۸] جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے گورنر عمرو بن حزم کو جو ہدایت نامہ دیا تھا (متن کے لیے دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۹٦۱ نیز قرآن مجید ۹/ ۳ کی تشریح تفسیر طبری میں) اس میں حج اصغر اور حج اکبر کی تشریح کی گئی ہے۔ [۱۹] ایضاً

[۲۰] خطبہ الوداع کے لیے دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۹٦۸ تا ۷۰، تاریخ طبری ص ۱۱۵۳ تا ۵۵، تاریخ یعقوبی ۲/ ۱۲۲ تا ۲۳، جاحظ کی البیان والتبیین ۲/ ۲۴ تا ۲٦، ابن عبدربہ کی العقد الفرید باب خطب وغیرہ۔

[۲۱] تاریخ یعقوبی ۱/ ۳۱۳ تا ۱۴، مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/ ۱٦٦

[۲۲] کوئی حیرت نہ ہو کہ ایک خثعمی ہی نے اس بات پر رضا مندی ظاہر کی تھی کہ ابرہہ نے اصحاب الفیل کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کرنی چاہی تو یہ اس کی رہنمائی کرے۔ دیکھئے ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۷۸

[۲۳] اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو Clinder کی کتاب The Kings of Kinda of the family of Akilal marar مطبوعہ جامعہ لونڈ واقع سویڈن ۱۹۲۷ء۔

[۲۴] ابن حبیب کی کتاب المحبر باب اسواق العرب مخطوطہ برٹش میوزیم

[۲۵] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۵۔

[۲۶] لامنس کا مضمون ''بت خانے اور مذہبی جلوس زمانہ جاہلیت کے عربوں میں'' جو اس کی فرانسیسی کتاب ''مغربی عرب'' میں بھی چھپا ہے۔

[۲۷] بہرحال یونان کے شہر اثینہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ''وہاں دس سالاران فوج ہیں، ہر ایک ایک قبیلہ کے لیے ......، اور ہر ایک اپنے قبیلہ والوں کی سالاری کرتا ہے اور ان کی پلٹنوں کے افسر مقرر کرتا ہے، اسی طرح وہاں دو سالاران رسالہ پائے جاتے ہیں جن کا انتخاب تمام شہری مل کر کرتے ہیں اور جو سوار فوج کی سالاری کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک کے تحت پانچ پانچ قبائل (کے سوار) ہوتے ہیں'' دیکھئے ارسطو کا دستور اثینہ ترجمہ انگریزی ۱۱۲ تا ۱۱۳۔

[۲۸] حقیقت میں دائیں جانب کے رسالہ کی قیادت خالد بن ولید نے کی تھی اور بائیں جانب کی رسالہ کے عکرمہ بن ابی جہل نے، دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۵۶۱

[۲۹] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۲۷۔

[۳۰] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۳، تاریخ طبری ص ۱۰۹۹، طبقات ابن سعد ۱/۱ ص ۴۱، جغرافیہ یاقوت تحت کلمہ مکہ۔

[۳۱] محمد بن حبیب کی کتاب المحبر باب اسواق العرب، مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/ ۱۶۱ تا ۶۶۔

[۳۲] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۵۔ [۳۳] تاریخ یعقوبی ۱/ ۲۷۵ تا ۲۷۶۔

[۳۴] بلاذری کی انساب الاشراف بحوالہ مکہ مؤلفہ لامنس ص ۴۴۔

[۳۵] دیکھئے منائح الکرم بحوالہ مراۃ الحرمین ۱/ ۶۹

[۳۶] سیرۃ ابن ہشام ص ۷۲، ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷، کتاب الاغانی ۱۳/ ۱۰۸۔

[۳۷] طبقات ابن سعد ۱/ اص ۳۹ [۳۸] ایضاً

[۳۹] محمد بن حبیب اور مرزوقی کی مذکورہ بالا کتابوں میں باب اسواق العرب

[۴۰] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۱۰۶ تا ۷ [۴۱] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۶

[۴۲] قرآن مجید ۷/ ۳۱ کی تشریح کسی تفسیر میں خاص کر تفسیر طبری ۷/ ۱۲۰

[۴۳] ابن دُرید کی کتاب الاشتقاق ص ۱۷ تا ۲۷

[۴۴] تفصیلات کے لیے دیکھئے مجلّہ عثمانیہ جلد (۱۱) میں مضمون ''عدل گستری ابتدائے اسلام میں''

[۴۵] دیکھئے تاریخ یعقوبی ۱/ ۳۰۰

[۴۶] محمد بن حبیب نے کتاب المحبر میں ایک پورا باب عربی و یونانی کے طریقہ کی تفصیل پر دیا ہے

[۴۷] سیرۃ ابن ہشام ص ۶۵ تا ۶۶ سہیلی کی الروض الانف ۱/ ۹۰ تا ۹۴، طبقات ابن سعد ۱/ اص ۴۲، مسند ابن حنبل ۱/ ۱۹۰۔

[۴۸] تفصیل کے لیے دیکھئے مجلّہ عثمانیہ جلد (۱۱) یا اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۷ء میں مضمون 'عدل گستری ابتدائے اسلام میں'' اول الذکر زیادہ مفصل ہے۔

[۴۹] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۵۔ [۵۰] ایضاً

[۵۱] متن کے لیے دیکھئے سیرۃ ابن ہشام ص ۳۴۱ تا ۴۴، ابوعبید کی کتاب الاموال ص ۵۱۷، ابن کثیر کی البدایہ والنہار ۳/ ۲۲۴ تا ۲۶ وغیرہ اور عام تحلیل کے لیے مجلّہ طیلسانین جولائی ۱۹۳۹ء میں مضمون ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور''۔

[۵۲] لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۷ تا ۶۸ [۵۳] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۵

[۵۴] ایضاً [۵۵] ایضاً [۵۶] ایضاً [۵۷] ایضاً

[۵۸] ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۶

[۵۹] سیرۃ ابن ہشام وغیرہ میں جنگ بدر کے سلسلہ میں ابولہب کا اپنی جگہ کسی اور کو بھیجنا اور دیگر

مواقع پر دیگر تفائر کا پیش آنا مروی ہے۔

[۶۰] اس نظام کی چند تفصیلوں کے لیے دیکھئے مسعودی کی التنبیہ والاشراف ص ۲۷۵ تا ۱۸۰

[۶۱] مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/۲۳۰ [۶۲] کتاب الاشتقاق ص ۶۴، ۱۴۵، ۳۱۸

[۶۳] لامنس کا مضمون ''احابیش اور مکہ کا فوجی نظام قرن ہجرت کے وقت'' فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۹۱۶ء نیز اسی مولف کی فرانسیسی کتاب ''مغربی عرب'' ص ۲۳۷ تا ۹۳ میں۔

[۶۴] دیکھئے اوپر اس مضمون کی تمہید میں۔

[۶۵] دیکھئے نپولین کی نوشتہ فرانسیسی یادداشت، جزیرہ سینٹ ہیلینیا ۳/۱۸۳۔

[۶۶] انسائیکلوپیڈا آف سوشل سائنس کی جلد اول کا دیباچہ نیز F.Roth کا جرمن مضمون لفظ بار بار کا مفہوم اور استعمال مطبوعہ نورمبرگ ۱۸۱۴ء۔

[۶۷] ہیالیڈے کی مذکورہ بالا کتاب ص ۱۱۲۴۔

[۶۸] انسائیکلوپیڈا آف سوشل سائنس جلد اول کا دیباچہ فصل ''شہری مملکت کا تسلط''

[۶۹] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۵۱، تاریخ طبری ص ۱۲۰۳۔

[۷۰] تفصیلات کے لیے دیکھئے حمید اللہ کی فرانسیسی کتاب ''اسلامی سیاست خارجہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں'' ۱/۷۴۔

[۷۱] ارسطو کی کتاب سیاسیات ۱/۶۱۲ جس کا حوالہ لارنس نے اپنی انگریزی کتاب ''قانون بین الممالک کے اصول'' میں بھی دیا ہے۔

[۷۲] ہیالیڈے کی مذکورہ بالا کتاب ص ۱۱۰۸ تا ۹۔

[۷۳] یہ اصطلاحات جسم انسانی کے مختلف اعضاء کے بھی نام ہیں اور شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''بنی آدم اعضاے یکدیگر نہ''۔

[۷۴] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۵۵، طبقات ابن سعد ۲/۱، ص ۲۵، و مابعد

[۷۵] بلاذری کی فتوح البلدان مطبوعہ مصر، ص ۶۳۔۶۴،

[۷۶] ارسطو کی کتاب ''سیاسیات'' ۱/۳۱۲۔ [۷۷] قرآن مجید ۲۰۰ تا ۲/۲۰۳

ہجرت

جلاوطنی، توطن، تبادلہ آبادی اور مماثل مفہوم رکھنے والی اصطلاحیں آج کل نہ صرف بین الاقوام اور بین الممالک سیاست میں روز افزوں اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہیں بلکہ ایک جماعت کے سیاسی خیالات کے باعث یہ مسئلہ اب خود ہمارے گھروں میں منڈلانے لگا ہے، حضرت موسیٰ کے زمانے میں بنی اسرائیل نے اجتماعی طور سے مصر سے ترک وطن اور بعد میں فلسطین والوں کو نکال کر ان کے ملک میں خود توطن اختیار کیا تھا۔ پھر بخت نصر کے زمانے میں انھیں فلسطین کے اس نئے وطن سے دیس نکالا ملاتو اس کی صداہائے بازگشت مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں آتی رہیں۔ اس تاریخ کا جدید ترین اعادہ یہودیوں کے فلسطین میں قومی وطن بنانے اور نانسی جرمنی سے ان کے نکالے جانے کی صورت میں ہویدا ہوا ہے۔

یہودیوں سے قطع نظر حالیہ سالوں میں ترکوں نے پچاس لاکھ سے زائد انسانوں کا ہمسایہ ممالک سے تبادلہ کیا ہے، جنوبی تیرول سے کئی لاکھ جرمن درہ برنیز کے اس پار چلے جانے پر حال میں اٹلی کی طرف سے مجبور کئے گئے جن کی جائداد غیر منقولہ کی قیمت کا اندازہ پانچ تا بارہ ارب لیرا کیا گیااور ساڑھے سات ارب پر تو سب متفق ہیں۔ ۲۰ نومبر ۳۹ء کے لندن ٹائمز کے مطابق پولینڈ میں لبلن کے اطراف جرمنی، آسٹریا، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کے کوئی ڈیڑھ کڑوڑ یہودی یکجا کئے جارہے

ہیں۔ اسی طرح بالٹک ممالک سے کئی لاکھ جرمن مشرقی جرمنی میں منتقل کئے گئے ہیں۔
۱۴ فروری ۴۰ء کے لندن ٹائمز کے مطابق بارہ دن میں چھ لاکھ روسیوں کو جرمن مفتوحہ علاقے سے روس منتقل کرنے کے انتظامات کئے گئے ہیں، فرانسیسی مستشرق خاص کر حالیہ زمانوں میں قدیم عرب نو آباد کاری کا مطالعہ کرنے لگے ہیں کیونکہ عربوں سے بڑھ کر کوئی نو آباد کار قوم نہیں گزری ہے جس نے جذب اور قلب ماہیت کے شام، مصر، عراق، شمالی افریقہ وغیرہ میں عجیب اور حیرت انگیز واقعات ثبت تاریخ کئے ہیں۔ عربوں کی کاروائی جو زیادہ تر حضرت عمر کے زمانے میں عمل میں آئی، دراصل عہد نبوی ہی کی تعلیم اور عمل پر مبنی ہے۔ تاریخ کے اس اہم گوشے پر بہت کم کبھی کسی نے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ کم از کم میرے مطالعے میں کسی زبان میں ایسی کوئی چیز پڑھنے میں نہیں آئی۔[۱] پانچ چھ سال سے میں اس موضوع پر مواد جمع کرتا رہا ہوں۔ اب اس جمع شدہ مواد سے ایک سرسری خاکہ کھینچ کر اہل علم کی خدمت میں بغرض تنقید د اصلاح اور بغرض توسیع وامداد پیش کرنے کی جرائت کرتا ہوں۔

"لغتی تحقیق":

لفظ "ہجرت" سامی زبانوں میں ایک دلچسپ تاریخ رکھتا ہے۔ یہ لفظ "ہجر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی حبشی اور بعض دیگر سامی زبانوں بلکہ خود قدیم عربی میں "شہر" کے ہیں۔ چنانچہ مشہور بیس جلدوں والی بڑی عربی لغت "لسان العرب" میں ایک قدیم لغت نویس الازہری کے حوالے سے لکھا ہے:۔

قال الازھری:۔ واصل "الھجرۃ" عند العرب خروج البدوی من بادیتہ الی المدن یقال "ھاجر الرجل" اذافعل ذلک۔ الازہری کا بیان ہے کہ عربوں کے نزدیک اصل میں "ہجرت" کے معنے یہ ہیں کہ کوئی خانہ بدوش صحرا نشین (بدوی) اپنے صحرا کو چھوڑ کر کسی شہر میں جا بسے۔

(لسان العرب تحت کلمہ" ھجر" نیز دیکھو تحت کلمہ "عرب")

ظاہر ہے کہ جب "ہجر" کے معنے شہر کے ہیں تو ہجرت کے معنے ابتداءً صرف یہی ہو سکتے تھے کہ کسی بستی، کسی شہر میں جا کر آباد ہو جانا اور خانہ بدوشی کی جگہ حضری زندگی اختیار کر لینا. اس سلسلے میں یہ بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ عرب میں خود "ہجر" نام کا ایک بڑا مشہور شہر گزرا ہے. یہ سلطنت بحرین کا پایہ تخت تھا اور حالیہ صوبہ "الحسا" میں (جو عرب میں خلیج فارس پر واقع ہے) آباد ہوا تھا کسی شہر کو "شہر" کا نام دنیا سچ پوچھئے تو نیا نہیں بلکہ قدیم سے ہر قوم اپنے پایۂ تخت کو شہر ہی کہتی رہی ہے. "مدینے" کے معنے بھی شہر کے ہیں. مکے کا قدیم نام "بکہ" بھی یہی معنے رکھتا ہے، چنانچہ بت بعل کا شہر بعلبک کہلاتا ہے۔ قرآن میں بکے کو "ھذا البدالا مین" کا بھی نام دیا گیا ہے۔ اور "بلد" کے معنے بھی شہر کے ہیں حضرت ابراہیم کے زمانے میں ان کے ملک کے صدر مقام کا نام "اُور" تھا. اور "اُور" کے معنی بھی شہر کے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ہندوستان بھی یہ لفظ پہنچ کر زیادہ تر دکن میں بنگلور، میسور، ناگور، متوّر وغیرہ ناموں میں بطور لاحصہ موجود ہے۔ رومی بھی اپنے شہر "روم" کو عام طور سے اُربس کہتے تھے۔ اس کے معنے بھی شہر کے ہیں (انگریزی لفظ اربن (Urban) بمعنی شہری، اسی سے ماخوذ ہے) بلدہ حیدر آباد اور مصر القاہرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

غرض ہجرت کے لغوی معنے شہر میں جا بسنے کے تھے، [۲] اور آسان ہے کہ کوئی صحرا کی تکلیف وہ زندگی کو چھوڑ کر کسی نخلستان کی سرسبز بستی میں جا بسے تو لفظ "ہجرت" کو بعد میں یہ معنے دیئے جائیں کہ کسی نعم البدل کو حاصل کرنا، کسی خراب جگہ کو چھوڑ کر اچھی جگہ رہنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسول کریم کے ترک وطن کر کے مدینہ جا رہنے کو اسی آخر الذکر مفہوم میں بلحاظ ادب "ہجرت" کے نام سے موسوم کیا گیا، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، سیرت نبوی اور خلافت راشدہ کے سلسلے میں ہجرت کے معنے صرف ہجرت مدینہ ہی کے نہ تھے بلکہ نو مسلموں کا اسلامی علاقے میں آ کر اکٹھا ہونا اور

مفتوحہ علاقوں میں مسلم نو آباد کاروں کا لے جاکر بسانا اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔

۱۔عہد نبوی میں ہجرت کا تاریخی مفہوم:

مکے میں تبلیغ اسلام کی رکاوٹوں سے مجبور اور دل برداشتہ ہونے کے بعد حضرت رسول کریم نے اپنے ساتھیوں کو ابتداًء حبشہ ہجرت کر جانے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ کئی سو آدمی چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں بحری راسے سے نجاشی کے ملک میں جا رہے۔ ایک ٹکڑی کی سرگزشت طبری نے لکھی ہے کہ یہ لوگ مکے سے چل کر شعیبہ کی بندرگاہ پہنچے جو حالیہ جدہ کے قریب تھی۔ وہاں ایک جہاز لنگر اٹھانے کو تیار تھا اور ان لوگوں نے نصف دینار یعنی پانچ درہم کرایہ پیش کیا اور حبش جا اترے معلوم نہیں یہ کرایہ فی کس تھا یا جملہ جماعت کا۔ کچھ دنوں کے بعد ''غرانیق'' [۳] کے مشہور واقعے کے سلسلے میں چند لوگ مکہ واپس آ گئے مگر بہت جلد وہ اور ان کے علاوہ بعض دیگر مسلمان دوبارہ حبش چلے گئے۔ یہ دونوں واقعے ہجرت حبشہ کے نام سے مشہور ہیں۔

آنحضرت کو جب مربی و با اثر چچا اور شفیق بیوی کی وفات کے بعد آپ کے نئے بزرگ خاندان (ابولہب) نے ذات باہر کر دیا تو آپ اپنے ایک غلام کے ساتھ طائف تشریف لے گئے اور ارادہ فرمایا کہ اگر وہاں تبلیغ میں کوئی کامیابی کی صورت ہو تو وہیں بس جائیں۔لیکن وہاں مکے سے زیادہ تکلیف ہونے پر آپ واپس چلے آئے۔ مگر تاریخ نے اسے ہجرت کی اصطلاح سے یاد نہیں کیا ہے۔

قدیم عرب بھی حج کیا کرتے تھے چنانچہ حج کے موسم میں جب مختلف اقطاع عرب کے حاجی آکر منیٰ (قریب مکہ) کے میدان میں جمع ہوتے تھے اور میلہ لگتا تھا تو اس اجتماع سے فائدہ اٹھا کر آنحضرت مختلف قبائل کے پڑاؤوں میں جاتے اور انھیں اسلام کی دعوت دے کر کہتے کہ مجھے اپنے ملک لے چلو۔ اگر تم میری بات مانو تو قیصر و کسری کی دولتیں تم پر نچھاور ہونے کو تیار ہیں۔ تاریخ نے اس خواہش ترک وطن کو بھی ہجرت کا نام

عام طور سے نہیں دیا گو بعض وقت ''ہجرت کا ارادہ'' اسے ضرور سمجھا گیا ہے۔

آخر مدینے والوں سے بیعت عقبہ ہوئی اور انھوں نے اقرار کیا کہ آنحضرت اور دیگر مکی مسلمانوں کے مدینہ آنے پر وہ ویسی ہی حفاظت کریں گے جیسی اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی۔ اور چند سو مسلمان جو مکے میں تھے مدینہ چلے گئے یہ وہ ہجرت ہے جس کی طرف منسوب ہو کر سنہ ہجری بھی رائج ہے اور لفظ ہجرت سے اب عام طور پر دماغ فوراً اسی واقعے کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

۲۔ نومسلموں کو اسلامی علاقے میں آ رہنے کا حکم دینا:

لفظ ہجرت کے اس دوسرے مفہوم کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو وہی جو آج کل ''ملکی بننا'' (نیچرالی زیشن) کہلاتا ہے، یعنی جب ایک قومیت والا دوسری قومیت اختیار کرنا چاہئے تو آخرالذکر کے ملک میں جا کر مقیم ہو جائے اور حتی الامکان اسی کا تمدن اور تخیل بھی اختیار کرے۔ چونکہ اسلام ایک خاص قسم کی اور مستقل قومیت ہے جو دیگر جغرافی، نسلی، لسانی اور رنگی قومیتوں سے جدا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اسلام اپنے گھر میں اپنے مخصوص اصولوں پر عمل چاہے گا۔ جو شخص اسلامی قومیت اختیار کرنا چاہے تو اس کے رنگ، اس کی نسل اور اس کی زبان سے بحث نہیں ہوگی۔ اسے صرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قائل ہونا اور قرآن پر چلنے کا اقرار کرنا ہوگا۔ اسی لئے نہ تو ایسے شخص کو بارہ سالہ قیام کی ضرورت ہوتی ہے، نہ مقامی زبان اچھی طرح جاننے کا صداقت نامہ پیش کرنا ہوتا ہے اور نہ کسی خاص جگہ رہنے کی پابندی ہوتی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس پر وہ سب ذمہ داریاں فوراً عائد ہو جاتی ہیں جو عام مسلمانوں پر عاید ہیں اور وہ سب حقوق بھی حاصل ہو جاتے ہیں جو عام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ آج کل تو یہ ضروری نہیں رہا ہے کہ کوئی شخص جو اسلام قبول کرنا چاہے وہ اسلامی ملک میں بھی آ رہے اور، عہد نبوی میں بھی فتح مکہ کے بعد کوئی ایسی پابندی نہیں تھی۔ لیکن ہجرت مدینہ

کے بعد ابتدائی چند سالوں میں ہر مسلمان ہونے والے شخص کو اسلامی سرزمین میں آکر مقیم ہونا پڑتا تھا جیسا کہ نیچے مزید تفصیل آئے گی۔

اس مفہوم کا دوسرا پہلو وہ پالیسی ہے کہ مسلمان اسلامی علاقے میں رہیں اور مرکز سے بچھڑے رہنے کے باعث نقصان نہ تو خود اٹھائیں اور نہ دیگر مسلمانوں کو پہنچائیں۔ اسلامی علاقے میں آرہنے سے ایک تو ''افتتان'' سے بچنا ممکن ہے، ورنہ غیر مذہب والے ہمسایہ بہلا پھسلا کر، ڈرا دھمکا کر، خانگی یا اجتماعی یا سرکاری دباؤ ڈال کر فتنے میں مبتلا کر سکتے ہیں، چنانچہ خود عہد نبوی میں مہاجرین حبشہ میں سے کم از کم دو اشخاص باوجود نجاشی کی غیر متعصبانہ حکومت کے اس عیسائی ماحول میں عیسائی بن گئے تھے۔ ایک بی بی سودہ کا شوہر سکران، دوسرا بی ام حبیبہ کا شوہر عبیداللہ بن جحش۔ اس آخر الذکر نے بقول طبری اپنی بیوی کو بھی عیسائی بننے کے لئے دباؤ ڈالا مگر وہ ثابت قدم رہیں۔ دوسرے اسلام کے جملہ اصول کا سیکھنا اسلامی تہذیب اور اسلامی ماحول کا حاصل کرنا غیر اسلامی ملک میں بڑی حد تک ناممکن ہے۔ جرمنی اور انگلستان میں چھوٹے چھوٹے دیہات میں بھی میں نے نومسلم دیکھے ہیں اور ان کو سب سے بڑی تکلیف یہ محسوس ہوتی تھی کہ ان کے بچوں کی تعلیم عام مقامی مدارس کے غیر اسلامی ماحول میں کما حقہ، نہیں ہوسکتی۔ تیسرے اگر مسلمان چوطرف بٹے رہیں تو ہر ٹکڑی کمزور ہوگی اور ہر کسی طاقت والے کا شکار بن جائے گی۔ اس لئے مسلمانوں کا عہد نبوی میں فریضہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ نہ صرف اسلام قبول کر کے اسلامی احکام پر چلیں بلکہ اسلامی علاقے میں بھی اگر آباد ہو جائیں۔ اس طرح مسلمانوں کی اجتماعی قوت زیادہ ہوگی اور وہ اپنے حریفوں کا نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں گے، غرض ''اولاً استحکام پھر توسیع'' کا اصول کارفرما رہا۔

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی قبیلے کا وفد مدینہ آکر اسلام قبول کرنے کا اظہار کرتا تو آنحضرتؐ ان لوگوں کو مدینہ آبسنے کی ہدایت فرماتے۔ اسی طرح جب کبھی دورہ

کرنے والے مبلغ بھیجے جاتے تو انھیں سمجھا دیا جاتا کہ نومسلموں سے کہہ دیں کہ وہ مدینہ جارہیں جہاں ان کے لئے روزگار کا انتظام کیا جائے گا یہ لوگ زیادہ تر قابل کاشت افتادہ زمینوں، بعض صورتوں میں معدنیات کی کانوں میں کام کرتے اور اپنی گزر بسر کا انتظام کرلیتے تھے۔

سات سال تک اس اصول کی پابندی ہوتی رہی اور جب مکہ فتح ہوگیا اور اسلام کا پورے عرب میں بول بالا ہوگیا تو پھر اعلان نبوی شائع ہوا کہ **لاھجرۃ بعد الفتح** (فتح کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں) اس مشہور ومعروف حدیث شریف کا ایک تو یہ مفہوم ہوسکتا ہے کہ اہل حجاز کو ہجرت کی ضرورت نہیں کیونکہ اب ان کا پورا علاقہ اسلامی سرزمین بن چکا ہے اور اسلامی قلمرو میں داخل ہوگیا ہے یا اس کا مفہوم ایک عام حکم ہے کہ جب کسی علاقے پر اسلامی مملکت قایم ہوجائے تو پھر اس علاقے کے اندر مسلمان کا جبری تبادلہ آبادی غیر ضروری ہے کیونکہ اس سرزمین کے ہر گوشے میں اسلامی حکومت ہوگی، اسلامی ماحول ہوگا اور اسلامی تعلیم وعبادت کی سہولت ہوگی۔

عہد نبوی میں فتح مکہ سے پہلے چند قبائل کو اس قاعدے سے مستثنٰی بھی کیا گیا تھا۔ طبقات ابن سعد وغیرہ میں تلاش پر مجھے ایسی دو ہی چار نظیریں مل سکی ہیں۔ ان پر غور کرنے سے سیاست نبوی کی دور رس مصلحتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی کسی قبیلے کا اکا دکا آدمی مسلمان ہوتا تو اسے اپنے سابقہ وطن میں رہنے نہیں دیا جاتا تھا بلکہ اسے لازمی طور سے مدینے آرہنے کی تاکید کی جاتی۔ اور وہ (مع بیوی بچوں کے اگر کوئی ہوں) اسلامی علاقے میں آکر بس جاتا اس کے برخلاف اگر کوئی پورے کا پورا قبیلہ مسلمان ہوتا تو یہ دیکھا جاتا کہ وہ کس جگہ پر رہتے ہیں۔ اگر ان کا علاقہ اسلامی سر زمین سے متصل یا بہت قریب ہوتا اور اس قبیلے کی قوت بھی کافی ہوتی تو اسے وہیں اس کے سابق وطن ہی میں رہنے دیا جاتا۔ کیونکہ اس کے معنے دراصل اسلامی مملکت کی سرحد کی توسیع اور نئے علاقے کا الحاق تھا۔ قبیلہ مزینہ اس کی اچھی نظیر ہے جس کے

حالات ابن سعد نے لکھے ہیں ۵ھ میں یہ قبیلہ مسلمان ہوا۔ اس قبیلے کے وفد ہی میں کئی سو آدمی تھے۔ ان کا علاقہ مدینے سے صرف بیس میل پر واقع تھا آنحضرت نے ان سب کو انکے سابقہ مسکن ہی میں رہنے کا حکم دیا۔ البتہ تعلیم و تربیت وغیرہ کا مناسب بندوبست کر دیا گیا۔ اس توسیع کی پالیسی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دشمن کو گھیر لیا جائے چنانچہ مکے کے چاروں طرف اسلامی قبائل آباد رہنے دیئے گئے۔ قبیلہ اسلم خاص طور پر اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ اس قبیلہ کے لوگوں کو آنحضرت نے فرمایا تھا کہ تم لوگ اپنے ملک ہی میں رہو اور تمھیں وہی حقوق اور وہی ثواب حاصل ہوگا جو مہاجرین کو حاصل ہوتا ہے۔ اس جگہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت نے ہجرت کا حکم دے کر اس کو مذہبی رنگ بھی عطا کر دیا کہ ہجرت کرنا ایک ثواب کا کام ہے اور کسی مذہبی آدمی کے لئے یہ بات کافی ہے۔ مزید برآں مہاجرین کے لئے چند حقوق بھی تھے مثلاً اسلامی مملکت کی آمدنی اسلامی سرزمین ہی پر خرچ ہوتی تھی اور روز ینے، تنخواہیں، انعام و اکرام وغیرہ بھی وہیں کے باشندوں کو حاصل ہو سکتے تھے۔

قبیلہ اسلم اصل میں قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ تھی، خزاعہ مکے کے جنوب میں رہتے تھے اور غالباً اسلم بھی وہیں رہتے ہوں گے جب دشمن کے چاروں طرف اس طرح اسلامی بستیوں کا سلسلہ قائم ہو کر جال بن گیا تو زبردست دشمن کو بغیر خونریزی مطیع کرنے کا عام اسلامی اصول بہ آسانی رو بہ عمل آ سکا۔ اور زبردست دشمن کے مطیع اور مسلمان ہو جانے سے اس کی پوری قوت اسلام کے کام آ سکتی ہے۔ اس کے محض تباہ کر دینے کے معنے ایک ممکنہ قوت و مدد سے محروم ہونا ہے۔

بہر حال اس طرح کی اجازت دینے میں اس کی سختی سے جانچ پڑتال ہوتی تھی کہ آیا وہ لوگ اپنی ضرورتیں خود مہیا کرتے ہیں، ان کے پاس کافی ذرائع معیشت مثلاً جانور اور زمین وغیرہ ہیں یا نہیں اور یہ کہ حریف ان پر معاشی دباؤ ڈال کر انھیں مرتد تو نہیں کر سکتا ہے؟ ان سب کے علاوہ ایک اور صورت بھی ممکن تھی اور اس کی بہ

کثرت نظیریں ابن سعد وغیرہ نے محفوظ کی ہیں، وہ یہ کہ اگر کسی قبیلے کے چند خاندان مسلمان ہوجائیں اور یہ نومسلم بذات خود کافی قوت رکھتے ہوں اور معاشی حیثیت سے پختہ ہوں تو ایسے نومسلموں کو آنحضرت کا حکم ''فارقو المشرکین ''ہوا کرتا تھا۔ یعنی اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور حلیفوں سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کرلو۔ شادی بیاہ، بین القبائل جنگیں، اور مماثل معاملات میں مشرکین سے ان کا کوئی تعلق نہ رہے۔ وہ اسلامی تعلیم پر عمل کریں، نماز اور زکوۃ کی پابندی کریں اور سیاسی حیثت سے مدینے کے ساتھ ملحق ہوجائیں۔ ایسے دور دراز قبایل کو مقامی خود اختیاری بھی حاصل ہوجاتی تھی اور مدینے کے ساتھ ان کا تعلق میری نظر اور اندازے میں ایک ''عہد یہ'' (کنفی ڈریشن) سے بڑھ کر نہ تھا۔ چنانچہ آس پاس کے دیگر اسلامی قبائل یا بستیوں کی وقت ضرورت حفاظت کرنا، کمک اور مدد بہم پہنچانا اور دیگر غیر مسلم قبائل سے لڑکر اپنی حفاظت واستحکام کے فرائض انجام دینا، یہ سب ایسے امور تھے جن کی ہدایت تو مدینے سے ہوتی تھی لیکن نگرانی اور تعمیل مقامی وحدت سے متعلق تھی۔ چنانچہ ایسی تفصیلی نظیریں متعدد موجود ہیں۔ اسی طرح کے نومسلم قبائل میں سے یمن کی ایک دلچسپ نظیر ابن سعد نے محفوظ کی ہے کہ چند لوگ مدینہ آئے اور آنحضرت سے کہا کہ آپ کے بھیجے ہوئے معلم ہمارے پاس آئے اور انھوں نے ہم سے کہا کہ جو ہجرت نہ کرے، اس کا اسلام قبول نہیں۔ ہمارے ملک میں ہماری جائداد اور معیشت کی چیزیں ہیں۔ کیا آپ کے معلم کا کہنا ٹھیک ہے؟ ہمیں اس کی تعمیل میں کوئی تامل نہیں۔ آنحضرت نے فرمایا: نہیں، اسلام کا قبول ہونا اس پر موقوف نہیں۔ تم جہاں رہو تمھیں مہاجرین ہی کے حقوق وفرائض حاصل ہوں گے۔

اس طرح کی دور دراز اسلامی بستیوں میں تعلیم کے بندوبست کے لئے دورہ کناں معلم مقرر کئے جاتے تھے، ان مقاموں کے نوعمر اور ذہین لوگوں کو مدینہ بلاکر کچھ عرصہ اسلامی صدر مرکز میں رکھا جاتا، اور اسلامی تربیت سے آراستہ کرکے ان کے ملک

کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ ان کے علاقوں میں مسجدیں بنانے کی خاص تاکید ہوتی تھی ۔ عمان جیسے دوردراز مقام کے نومسلموں کے نام آنحضرت کا ایک تنبیہی ہدایت نامہ بخاری وغیرہ نے محفوظ کیا ہے کہ مسجدیں بناؤ ورنہ فوج بھیج کر تمہیں سزادی جائے گی ۔

مختصر یہ کہ عہدِ نبوی میں ہجرت کا یہ مفہوم بھی تھا کہ نومسلموں کو اسلامی علاقے میں بسایا جائے اور آیت ومن یخرُج مِن بیته مهاجراً الی الله و رسوله میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح سے رفتہ رفتہ اسلامی علاقے کی توسیع ہوتی رہے گی، تاکہ اس بڑھنے والی آبادی کے لئے خدا کی زمین تنگ نہ ہوجائے۔ اصل منشاء یہ تھا کہ خدا کے ملک میں خدا ہی کا راج ہو۔ اور عام فاتحین کے برخلاف جو فتح کا منشاء لوٹ مار کرنا اور اپنوں کو نوازنا سمجھتے رہے ہیں، اسلامی فتح کا منشاء یہ تھا کہ کسی انسان، کسی جانور تک کا بے ضرورت خون نہ بہایا جائے اور کوئی درخت کوئی پودا تک رائیگاں ضائع نہ کیا جائے جیسا کہ سپہ سالاروں کو دی ہوئی ہدایتوں میں آنحضرتؐ نے بارہا فرمایا ہے۔ منشاء صرف یہ تھا کہ دنیا میں خدا کی حکومت اور خدا ہی کا بول بالا ہو اور خدا کے احکام سے کوئی بھی مستثنیٰ نہ ہو یہاں تک کہ حکمرانِ ملک تک اپنے کئے کا مواخذہ دار ہو۔ سیرت شامی میں ایسے بکثرت نظائر ایک مستقل باب میں جمع کئے گئے ہیں جب آنحضرتؐ نے اپنی ذات کے خلاف مقدمے سنے اور فریق ثانی کے حق میں فیصلے کئے۔

۳۔ نو آبادکاری یا مفتوحہ علاقے میں مسلمانوں کو بسانا:

رسول کریم ﷺ نے دس مصروف سال ایک مملکت کے قیام واستحکام میں نہ صرف صرف کئے بلکہ اپنے ہونے والے جانشینوں کو حکمرانی اور سپہ سالاری کے ساتھ ساتھ مکمل تربیت بھی دی، یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے چند ماہ بعد ہی جب آپ کے جانشین نے حضرت سیف اللہ خالد بن الولید کو ایرانی سرحد پر بھیجا تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں عربوں کا نہ سما سکنا اور سرحد پر نئی عرب بستیوں کا

بسانا ایک طے شدہ مسئلہ تھا۔ چنانچہ امام ابو یوسف نے اپنی مشہور کتاب الخراج (صفحہ ۸۵) میں حضرت خالد اور حیرہ والوں کا ۱۲ھ کا جو طویل معاہدہ نقل کیا ہے اس میں دارالاسلام اور دارالہجرت کا اس طور سے ذکر کیا گیا ہے کہ گویا وہ مشہور و معروف چیزیں ہیں اور سیاق و سباق اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کرنے دیتے کہ دارالاسلام سے مراد عرب ہے اور دارالہجرت سے مراد جنوبی عراق کا وہ مفتوحہ اسلامی علاقہ ہے جہاں عرب فوراً بستے جارہے تھے۔ اس سلسلے میں قادسیہ کی مشہور اور عہد آفریں جنگ کے بعد اسلامی سپہ سالاروں اور مرکز خلافت، میں جو مراسلت ہوئی وہ ایک مزید اہم تاریخی دستاویز ہے۔

ثم كتب سعد الى عمر بما فتح الله على المسلمين فكتب اليه عمر: ان قف ولا تطلبوا غير ذلك فكتب اليه سعد ايضاً انما هي سربة ادركناها والارض بين ايدينا. فكتب اليه عمر: أن قف بمكانك ولا تتبعهم واتخذ للمسلمين دارهجرة و منزل جهادو لا تجعل بيني وبين المسلمين بحرا.

(تاریخ طبری احوال ۱۴ھ نیز تاریخ دینوری برموقع)

فیلڈ مارشل حضرت سعد بن ابی وقاص نے خلیفہ حضرت عمرؓ کو اس فتح کی کیفیت لکھ بھیجی جو خدا نے مسلمانوں کو (قادسیہ میں) عطا کی تھی، تو حضرت عمرؓ نے انہیں جواب دیا کہ ٹھہرے رہو اور کسی دوسری چیز کی تلاش نہ کرو اس پر حضرت سعدؓ نے پھر لکھا کہ یہ (جانوروں یا عورتوں کا) ایک گلہ تھا جو ہمیں ملا ورنہ زمین تو ہمارے سامنے پڑی ہوئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پھر یہی جواب دیا کہ اپنی جگہ ٹھہرے رہو اور ان کا پیچھا نہ کرو اور مسلمانوں کے لئے ایک جہاد کے لئے راستے میں ٹھہرنے کی منزل تیار کرو۔ لیکن مجھ میں اور مسلمانوں میں کوئی ندی سمندر حائل نہ ہو۔

غرض اصول یہ تھا کہ ٹھوس اسلامی علاقے اور دشمن کے علاقے کے بیچ میں نو آبادیاں بسائی جائیں اور گھر سے ان کو کمک جانے میں کوئی موانع حائل نہ ہوں اور اس نو آبادی کا منشا صرف ایک منزل اور اسٹیشن کا ہو، تا کہ اور آگے جانے میں سہولت ہو۔ اور بغیر اس طرح کے استحکامی انتظامات کرنے کے محض آگے بڑھ جانا۔ چاہے اس میں کتنی ہی سہولت کیوں نہ ہو، نامناسب ہے۔ چنانچہ ان احکام کی تعمیل میں بصرہ اور کوفہ بسائے گئے اور سکندر و ہلاکو کی سی بے اصول فتوحات کا باوجود ہر طرح کی للچاہٹ کے سد باب کیا گیا۔ نتائج ظاہر ہیں کہ کس کی فتوحات دیر پا رہیں۔

جب اس طرح کی نو آبادیاں (یا اس زمانے کی اصطلاح میں ''دار ہجرت'') چن لی جاتیں تو پھر سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں عرب مع خاندانوں، بیوی بچوں اور غلاموں کے وہاں جا بستے۔ نو آبادی کا ایک خصوصی افسر ہوتا تھا جو سڑکوں کی جگہ چھڑواتا۔ مسجد اور بازار کی جگہ معین کرتا اور پوری باقاعدگی سے دیکھتے کے دیکھتے ایک عرب شہر آباد ہو جاتا۔ پروفیسر مارسے نے فرانسیسی اکاڈیمی کی رکنیت پر منتخب ہونے پر جو افتتاحی مضمون لکھ کر سنایا تھا وہ ''اسلام اور حضری زندگی'' پر تھا۔ اس میں وہ تسلیم کرتا ہے کہ نئے شہر بسانے میں عرب بڑے خوش نصیب رہے ہیں۔ ان کا بسایا ہوا تقریباً ہر شہر آج بھی آباد و سرسبز ہے اور بعض کی اہمیت تو تیرہ سو سال گزرنے پر بھی روز افزوں ہے (مثلاً بصرہ) شہر کوفہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جس طور سے بسایا گیا تھا اس پر پروفیسر ماسینیوں نے ایک دلچسپ مقالہ شائع کیا ہے جس کے ساتھ اس ابتدائی بستی کا نقشہ بھی موجود ہے جو اس عہد کی ''تمصیر'' یعنی شہر بسانے کے اصول پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔

نظر بندی:

اس عنوان سے میرا منشاء یہ ہے کہ اپنے لوگوں کو فرار ہو کر دشمن سے جا ملنے

سے جبراً روکا جائے تا کہ عارضی اختلاف رائے کے باعث اپنے دل برداشتہ بھائیوں کو ایسی حرکت نہ کرنے دی جائے جس کے سبب سے قطع تعلق مدامی اور نا قابل اصلاح ہو جائے۔

اس سلسلے میں ایک تو صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ہے جس میں قریش نے آنحضرتؐ سے یہ اقرار لیا تھا کہ اگر کوئی قریشی اپنے ولی و سرپرست سے پوچھے بغیر آنحضرتؐ کے پاس چلا آئے تو قریش کے مطالبے پر آنحضرتؐ اسے واپس کر دیں لیکن کوئی مسلمان قریش کے پاس چلا جائے تو اس کی تحویل نہیں ہو سکے گی۔ قریش کا اس سے ظاہر ہے وہی منشاء تھا جو اوپر بیان ہوا۔ اس یک طرفہ شرط کی پابندی کو آنحضرتؐ نے امام سرخسی کی رائے میں اس لئے قبول کیا تھا کہ اس وقت (٦ھ میں) مسلمانوں کے وقتِ واحد میں دو دشمن تھے۔ مدینے کے شمال میں خیبری یہود اور مدینے کے جنوب میں مکی قریش۔ ان میں باہم حلیفی کی گفت و شنید ہو رہی تھی اور مسلمانوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ دونوں کے علاقوں پر فوجیں بھیج کر سانپوں کو انڈے ہی میں کچل سکیں اور مناسب معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایک فریق سے صلح کر کے دوسرے کا قلع قمع کیا جائے۔ حسبہ صلح حدیبیہ کی یہ شرط منظور کی گئی اور معاوضے میں قریش سے غیر جانبداری کا اقرار لیا گیا ہے اور مہینے بھر بعد خیبر کے فتنے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا۔

آنحضرتؐ نے حدیبیہ کی شرطِ تحویل کی تعبیر یہ فرمائی کہ کوئی مرد اگر مکے سے آئے تو وہ مطالبے پر واپس کر دیا جائے گا لیکن کوئی عورت اس طرح واپس نہیں کی جائے گی اگر وہ مسلمان ہو چکی ہو۔ معاہدہ ہو چکنے کے بعد بعض مقدمات میں اس تعبیر کی ضرورت پیش آئی تھی اور قریش نے بھی اسے تسلیم کر لیا تھا۔

دوسری نظیر حضرت عمرؓ کے زمانے میں ملی ہے۔ چنانچہ ١٧ھ کے حالات میں طبری نے حضرت عمرؓ کا ایک خط بنام قیصر ہرقل نقل کیا ہے:

مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایک عرب قبیلہ ہمارے ملک کو چھوڑ کر تیرے ملک میں آ گیا

ہے۔ خدا کی قسم اگر تو ان کو نکال واپس نہ کرے تو ہم (ہمارے ملک میں رہنے والے) نصرانیوں سے صلح توڑ دیں گے اور ان سب کو تیرے ملک کی طرف جلا وطن کر دیں گے۔

تبادلہ آبادی:

عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں سوائے جنگی قیدیوں کے دیگر طبقات آبادی کے دوسرے ممالک میں تبادلہ کی مجھے کوئی نظر نہیں ملی۔ فقہ کی کتابوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ کسی نو مفتوح علاقے کے باشندوں کو عام طور پر چھ مہینوں کی مہلت ہوتی تھی کہ وہ اپنے مسکن کے متعلق فیصلہ کر لیں کہ اسلامی رعایا اور ذمی بننا چاہتے ہیں یا اپنے لئے کوئی اور ملک پسند کر کے چلے جانا چاہتے ہیں۔ مگر اسے مشکل ہی سے تبادلہ آبادی کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو قومیت، نسل، زبان یا رنگ پر مبنی نہیں ہے۔ اس کے لئے اس زمانے میں غیر ممالک سے ہم قوم (یعنی مسلمان) تبادلے میں مل بھی نہیں سکتے تھے۔

منتقلی و جلا وطنی:

جلا وطنی کی البتہ بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔ آنحضرتؐ نے مدینے کے یہودی قبائل بنو قینقاع اور بنو نضیر کو ان کی شرارتوں کی بناء پر حکم دیا تھا کہ مدینے سے چلے جائیں۔ ان میں سے اکثر خیبر میں جا بسے اور جو اس وقت تک ایک آزاد شہری مملکت تھا ۷ھ میں جب اس کا الحاق مملکت اسلامیہ سے ہوا تو ابتداً سب یہودیوں کو وہاں سے بھی چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ پھر انہیں تا حکم ثانی اس شرط پر وہاں رہنے کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے باغوں کی آدھی فصل مال گذاری میں دیں۔

جلا وطنی کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی وہ مشہور حدیث یہاں بیان کی جا سکتی ہے جو اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے آپؐ نے ارشاد فرمائی تھی کہ عرب میں دو دین والے نہ رہیں (یعنی صرف ایک ہی دین کے پیرو یعنی مسلمان رہیں) اور یہ کہ یہود و

نصاریٰ کو عرب سے نکال دیا جائے۔ اس کی تعمیل میں حضرت عمرؓ نے نجران (یمن) سے عیسائیوں کو اور خیبر سے یہودیوں کو نکال کر دیگر اسلامی علاقوں یعنی عراق اور شام میں منتقل کردیا۔ اس پالیسی کا شاید یہ منشاء تھا کہ صدر مقام اور مرکز میں اجنبی اور ناقابل اعتماد عناصر نہ رہیں اور یہ امر نیم جنگی اور نیم معاشرتی مصلحت پر مبنی تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں فیلڈ مارشل حضرت ابو عبیدہؓ نے بعلبک والوں سے جو معاہدہ کیا تھا (دیکھئے تاریخ طبری) اس میں یونانیوں کو چند ماہ تک ملک میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی جس کے بعد انہیں وہاں سے جہاں جی چاہے نکل جانے کا پابند کیا گیا تھا بجز ان کے جو مسلمان ہو جائیں۔

شہر بیت المقدس سے جو معاہدہ ہوا اس میں حضرت عمرؓ نے مقامی عیسائیوں کی یہ شرط منظور کی تھی کہ ان کے شہر میں یہودی نہ رہنے دیئے جائیں۔ (حوالہ ایضاً)

مختصر یہ کہ ''اولاً استحکام پھر توسیع'' کا اصول اس عہد کی پالیسی کا ایک اہم ستون تھا اور ''لا اکراہ فی الدین'' کے حکم کے باعث جبراً کسی کو مسلمان بنانے کی تو کبھی بھی اجازت نہ ملی لیکن حکومت الٰہیہ کا قیام ایک فریضہ قرار دیا گیا (اور ''وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنۃٌ ویکون الدّین کلہ للہ'' میں ''دین'' سے مراد غلبہ اور حکومت ہے) اور ذمی رعایا بننے کی اس شرط پر اجازت دی گئی کہ وہ اطاعت کریں، ''صَغار'' قبول کریں یعنی حکومت میں شرکت نہ چاہیں اور شرائط معاہدہ کی تعمیل کرتے رہیں ایسا ہو تو ان کو ہر کام کی آزادی رہے گی۔ اور ان کے مذہبی اور عدالتی مسائل انہیں کے ہم قوم افسروں کے سپرد رہیں گے اور ان کی جان و مال کی اسلامی حکومت اتنی ہی حفاظت کرے گی جتنی مسلمان رعایا کی۔ یہی حال عہدِ نبویؐ میں شروع سے رہا جب کہ مدینے کے یہودیوں نے آنحضرتؐ [۴] کو اعلیٰ ترین عدالتی اور فوجی اور سیاسی اختیارات سپرد کر دیئے تھے اور یہی اصول خلافت راشدہ میں بھی کارفرما رہا۔

(رسالہ سیاست، حیدرآباد، جولائی ۱۹۴۰ء)

حواشی:

[۱] اس مضمون کے مطبع کو جانے لیکن شائع ہونے سے کوئی تین ماہ پہلے عبدالقدوس ہاشمی صاحب نے روز نامہ رہبر دکن میں البتہ ایک مختصر عام پسند مضمون لکھا ہے۔

[۲] فرانسوانو (Francois nau) نے اپنی فرانسیسی کتاب ''عراق اور شام کے عیسائی عرب ساتویں سے آٹھویں صدی عیسوی تک'' مطبوعہ ۱۹۳۲ء، ص ۱۲۹ تا ۱۳۲۔

Les Arabes Chretiens de Mesopotamie میں ایک جگہ ضمناً لفظ ہجرت ''ہاگر'' یعنی بی بی ہاجرہ کے (جن کو بخاری شریف میں ہاجر ہی کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور ابراہیم کی بیوی اور حضرت اسمعیل کی ماں تھیں) نام سے ماخوذ سمجھا ہے۔ مگر یہ توجیہ محض ناسمجھی تھی اور ظاہر ہے کہ کسی نے قبول بھی نہیں کی۔

[۳] قرآن مجید میں ایک جگہ لات، عُزّیٰ اور منات تین بتوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد بتوں کی بے بسی اور بت پرستی کی برائی کا ذکر ہے۔ قرآن کی تفسیروں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ جب آنحضرت نے ایک مرتبہ ''اللّٰت والعُزّٰی ومنات الثالثۃَ الاخریٰ'' کی آیتیں پڑھیں تو کسی نے قافیہ ملا کر ''تلک الغرانیق العلیٰ وان شفا عتھم لترتجی'' (یعنی وہ بڑے سردار ہیں اور ان کی سفارش کی توقع کی جاسکتی ہے) کا جملہ کس دیا اور شہر میں مشہور ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ بتوں کے متعلق اس رعایت کو منظور کرتے ہیں کہ وہ خدا تو نہیں ہیں لیکن وہ خدا کے پاس سفارش کر سکتے ہیں، جب آنحضرت ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے اصل آیتیں پڑھیں اور مکے والوں کو کوئی دھوکا نہ رہا۔ مگر ابتدائی خبر کا ایک جز حبشہ پہنچ گیا کہ آنحضرت اور مکہ والوں میں صلح ہو گئی ہے۔ میرا ذاتی گمان ہے کہ غرانیق کی آیتیں ممکن ہے آنحضرت ﷺ ہی نے تلاوت فرمائی ہوں لیکن سوال کے طور پر (یعنی کیا وہ بڑے سردار ہیں اور کیا ان کی سفارش کی توقع کی جاسکتی ہے؟) بغیر حرف سوال کے سوالیہ آیتیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں (مثلاً حضرت ابراہیم کا چاند سورج وغیرہ کو خدا کہنا) اور جب التباس کو شبہ ہوا تو یہ آیتیں منسوخ ہو گئیں، جس طرح قرآن میں اور جگہ بھی ہوا ہے اور نئی آیتیں نازل کی گئی ہیں)

[۴] ملاحظہ ہو باب ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور'' جس میں آنحضرتؐ کے مرتب کئے ہوئے تحریری دستور مملکت مدینہ بابت ۱ھ کی تحلیل کی گئی ہے۔

دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور

عہد نبوی کی ایک اہم دستاویز

متمدن اقوام ہی نہیں ، وحشی باشندوں میں بھی حکمرانی اور عدل گستری کے لئے معینہ قاعدے ہوتے ہیں اور خود رائے سے خود رائے سردار بھی اپنے آپ کو ان کا پابند پاتا ہے۔[۱] عموماً جب کبھی ایسے قواعد تحریری صورت میں مرتب ہوئے تو انھیں کتاب کا نام دیا گیا **Bible Scripture** کے معنی بھی کتاب کے ہیں کنفوشس کی قانونی تالیف بھی ''کتاب'' کے نام سے موسوم ہے تو چنگیز خاں کے ''یاسہ''[۲] کے معنی بھی کتاب کے ہیں۔ چنانچہ جدید ترکی میں بھی یازمک کا مصدر لکھنے کے معنوں میں ہی برتا جاتا ہے، اور ''کتاب اللہ'' مسلمانوں کے قرآن کا نام ہے۔

غرض عام قواعد وقوانینِ ملک کم وبیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ لیکن دستور مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لانا، مجھے اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے عہد نبوی سے پہلے نہیں مل سکی۔ بلاشبہ منوسمرتی (۵۰۰ ق م) میں راجہ کے فرائض کا بھی ذکر ہے۔ اور کوتلیا کی آرتھ شاستر (۳۰۰ ق م) اور اس کے ہم عصر ارسطو کی کتابوں میں سیاسیات پر مستقل تالیفیں بھی ملتی ہیں۔ ارسطو نے تو اپنی ہمعصر شہری مملکتوں میں سے بشمول ہندوستان [۳] (۱۵۸)[۴] کے دستور بھی لکھے تھے، جن میں سے صرف شہر ایتھنز کا دستور ابھی پچاس سال قبل مصر میں بردی کاغذ

(پاپیروس) پر محفوظ مل چکا ہے، اور ۱۸۹۱ء میں شائع ہو چکا ہے، اور انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن یہ سب یا تو درسی اور مشورتی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں یا کسی مقام کے دستور کا تاریخی تذکرہ ہیں۔ کسی مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے نافذ کردہ مستند دستورِ مملکت کی حیثیت ان میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں۔

۱ھ میں مدینہ منورہ میں ہجرت کر آنے کے پہلے ہی سال رسول کریم صلعم نے ایک نوشتہ مرتب فرمایا جس میں حکمران کے حقوق اور فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے۔ خوش قسمتی سے یہ دستاویز پوری کی پوری اور بلفظہ ابن اسحاق اور ابوعبیدہ نے اپنی کتابوں میں محفوظ کی ہے، اور آج اسی کا کچھ بیان مقصود ہے۔

اس دستاویز میں ترپن (۵۳) جملے، یا قانونی الفاظ میں دفعات ہیں اور اس زمانے کی قانونی عبارت اور دستاویز نویسی کا وہ ایک انمول نمونہ ہیں اس کی اہمیت اسلامی مؤرخوں سے کہیں زیادہ یورپی عیسائیوں نے محسوس کی۔ ولہاوزن، میولر، گریمے، اشپرنگر، ومنیسنک، کائتانی، بول[۵] وغیرہ کے علاوہ ایک انگریز مؤرخ نے مختصر تاریخ عالم لکھتے ہوئے بھی اس دستاویز کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ یہاں ان جرمن، ولندیزی، اطالوی، انگریزی اور دیگر مؤلفوں کے بیانات کا ذکر غیر ضروری ہے میں صرف اپنے ناچیز خیالات اس کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، اور اس کی اہمیت کی طرف اہل ملک کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔ اس دستاویز کی تفصیلی شرح اور مغربی مؤلفوں کے بیانات کی تنقید کے لئے بڑا وقت چاہیئے۔ جو اس لکچر[۶] میں ممکن نہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ اس دستاویز کے مندرجات پر کچھ عرض کیا جائے اس کا تاریخی پس منظر اور ان حالات کا ذکر ضروری ہے جن میں وہ مرتب اور نافذ ہوئی۔

رسول کریم صلعم نے جب مکہ معظمہ میں اپنے تبلیغی اور اصلاحی کام کا آغاز کیا، اور صدیوں، نسلوں کے معتقدات و رواجات کی تبدیلی چاہی تو اہل ملک نے ابتدا،

حیرت اور پھر نفرت اور آخر کار مخالفت و معاندت کا برتاؤ کیا۔ یہ مشن پہلے ہی دن سے عالمگیر تھا اور معلوم دنیا، خاص کر ایران و روم (بیزنطینہ) تک اس کی فوری اور بآسانی وسعت کے امکانات نظر آتے تھے اور آنحضرت اپنی تبلیغ میں ظاہر بین دنیاداروں کو ان ممالک کی فتح کی بشارت دیتے تھے۔[۷] لیکن ایک مفلس اور کمزور قبیلے کے فرد کی حیثیت میں آپ کی سرداری کا مانا جانا مشکل تھا۔ آنحضرت ﷺ کی رشتہ داری طائف [۸] اور مدینے [۹] کے قبائل سے بھی تھی، اسی توقع میں پہلے آپ طائف کے قریب تر علاقے کو تشریف لے گئے، مگر وہاں وطن سے بڑھ کر مشکلیں پیش آئیں۔ آخر حج کے زمانے میں کئی سال تگ و دَو کرنے کے بعد چند مدینے والے ہی آپؐ کے گرویدہ بنے، اور مدینے آنے پر آپ کو اور آپ کے مکّی ساتھیوں کو پناہ اور مدد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

مکے کی مقامی حالت ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی عام مخالفت سے بڑھ کر جسمانی اذیت سے بہتوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس لئے مسلمانانِ مکہ ہجرت کر کے مدینے جانے لگے۔ مکّے والے ڈرے کہ کہیں یہ لوگ باہر جا کر انتقام کی تیاریاں نہ کریں، اس لئے خود حضرتؐ کے مکان [۱۰] کا محاصرہ اور شب خون کی تجویز پختہ کی گئی، مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ آنحضرتؐ بخیر و عافیت مکے سے نکل کر مدینے پہنچ گئے جھنجلاہٹ میں مکّے والوں نے آپؐ کی، اور دوسرے مہاجروں [۱۱] کی املاک و جائداد پر غاصبانہ تسلّط جمالیا، مدینے کے مسلمانوں اور مکے کے مہاجروں کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی، اگرچہ مدینے کی آبادی کا اندازہ اس وقت چار، پانچ ہزار کیا جاتا ہے جن میں آدھے کے قریب اس وقت یہودی تھے۔ مکّہ اس وقت ایک منظم شہری مملکت کی صورت میں تھا، وہاں فوج، محاصل، عبادت، تعلقات خارجہ، عدل گستری وغیرہ کے کوئی پچیس سرکاری عہدے تھے، جن کا تفصیلی ذکر میں نے حال میں ٹرونڈرم کے موتمر مستشرقین میں پڑھے ہوئے مقالے میں کیا ہے۔[۱۲]

اس کے برخلاف مدینے میں ابھی نراج کی کیفیت تھی، اور قبائلی دور دورہ تھا، عرب اوس اور خزرج کے بارہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے، تو یہودی بنوالنضیر و بنو قریظہ وغیرہ کے دس قبائل میں، ان میں باہم نسلوں سے لڑائی جھگڑے چلے آرہے تھے، اور کچھ عرب کچھ یہودیوں کے ساتھ حلیف ہوکر باقی عربوں اور ان کے حلیف یہودیوں کے حریف بنے ہوئے تھے۔ ان مسلسل جنگوں سے اب دونوں بھی تنگ آ چلے تھے۔[۱۳] اور گو وہاں کے کچھ لوگ غیر قبائل خاص کر قریش کی جنگی امداد کی تلاش میں تھے۔[۱۴] لیکن شہر میں امن پسند طبقات کو غلبہ ہو رہا تھا۔ اور ایک کافی بڑی جماعت اس بات کی تیاری کر رہی تھی کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کو بادشاہ بنادیں، حتی کہ بخاری[۱۵] وابن ہشام [۱۶] وغیرہ کے مطابق اس کے تاج شہر یاری کی تیاری بھی کاریگروں کے سپرد ہوچکی تھی۔ بے شبہ آنحضرت نے بیعت عقبہ میں بارہ قبائل میں بارہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے نقیب مقرر کر کے مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تھی، مگر اس سے قطع نظر وہاں ہر قبیلے کا الگ راج تھا، اور وہ اپنے اپنے سقیفے یا سائبان میں اپنے امور طے کیا کرتا تھا، کوئی مرکزی شہری نظام نہ تھا، تربیت یافتہ مبلغوں کی کوشش سے تین سال کے اندر شہر میں معتد بہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے، مگر مذہب ابھی تک خانگی ادارہ تھا۔ اس کی سیاسی حیثیت وہاں کچھ نہ تھی، اور ایک ہی گھر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ ان حالات میں آنحضرتؐ مدینہ آتے ہیں، جہاں اس وقت متعدد فوری ضرورتیں تھیں:۔

(۱) اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین۔

(۲) مہاجرین مکہ کے توطن اور بسر برد کا انتظام۔

(۳) شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔

(۴) شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

(۵) قریش مکہ سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ۔

انھیں اغراض کے مدنظر آنحضرت صلعم نے ہجرت کر کے مدنیہ آنے کے چند مہینے بعد ہی [۱۷] ایک دستاویز مرتب فرمائی جسے اسی دستاویز میں کتاب اور صحیفے کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور جسے بظاہر اشخاص متعلقہ سے گفت وشنید کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عام قانون ملک کتاب اللہ یا قرآن کی صورت میں جیسے جیسے نافذ یا نازل ہوتا تحریری صورت میں مرتب کردیا جاتا تھا۔ اور منکسر المزاج احتیاط پسند پیغمبر اسلام صلعم نے اس زمانے میں اپنے ذاتی اقوال و ہدایات کو لکھنے کی عام طور سے ممانعت فرمادی تھی۔ اس کے باوجود زیر بحث دستاویز کا لکھا جانا معنے خیز ہے جسے کتاب اور صحیفے کے اہم ناموں سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنے دستوارلعمل اور فرائض نامے کے ہیں۔ اصل میں یہ شہر مدینہ کو پہلی دفعہ ''شہری مملکت'' قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا۔

ہابس، روسو وغیرہ ''معاہدہ عمرانی'' کے نظریئے کے تحت مملکت کا آغاز حاکم و محکوم کے عمرانی معاہدے سے قرار دیتے ہیں۔ اس کی ایک بین اور واقعی مثال ہم کو بعیت عقبہ میں ملتی ہے جس میں مدینے والوں نے آنحضرت صلعم کو اپنا سردار مانا، اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور آپ کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث دستاویز ایک معاہدے کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور ایک حکم کی صورت میں نافذ کی جاتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتاب کے معنے فرض اور حکم کے بھی ہیں۔ ان الصلاۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً ان کتاب الابرار لفی علیین ۔[۱۸] کتب علیہم القتال وغیرہ میں لفظ ''کتاب'' اسی معنی میں برتا گیا ہے۔ جرمن لفظ (Vorschrift) اور فرانسیسی وانگریزی لفظ (Prescription) ہسپانوی (Prescripcisn) (Prescrifena) (بمعنی فرض وحکم) کا مادہ بھی ''کتاب'' ہی کے معنے رکھتا ہے۔

عرب میں عام طور پر اور مدینے میں خاص طور پر جو مرکز گریزی تھی اس کا

علاج تنظیم پسند اور وحدت خواہ بنی صلعم نے یہ تجویز کیا کہ ''ایک حکمران ایک قانون''۔ ابھی تک زکاۃ اور حج کے مرکز کش احکام نہیں آئے تھے جن سے مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا حق مل کر ملک میں بزور ایک نقطے پر لوگوں کو لانے کا اور ہر حصے کے لوگوں کو ایک ہی قبیلے کی زیارت کا بعد میں موقع ملا پھر بھی ایمان واعمال کے سلسلے میں ایک خدا کو ماننے، ایک ہی بنی کے احکام کی اطاعت کرنے اور مل کر ایک ہی سمت نماز پڑھنے کے ادارے وجود میں آچکے تھے۔ اب اس دستور نے اس میں ایک نہایت اہم اور عرب کے لیے انقلابی اصلاح و ترقی یہ دی کہ لوگ اپنے حقوق اپنی یا زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کی مدد سے حاصل کرنے کی جگہ انصاف رسانی کو ایک مرکزی اور پبلک ادارہ بنادیں۔ یہ عہد آفریں کارنامہ اسی دستاویز میں ریکارڈ میں لایا گیا ہے جس نے قبائلیت کی افراتفری کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور ایک وسیع تر ادارے یعنی مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اس دستاویز میں آنحضرت صلعم نے عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنقیدی اعلی ترین اختیارات اپنے لئے محفوظ فرمائے مگر نہایت اہم اور قابل ذکر فرق اس اقتدار اور دیگر ممالک کے مستبدانہ شاہی اقتدار میں یہ تھا کہ یہاں مادیت کو دخل نہ تھا۔ آنحضرتؐ نے سیاست میں اخلاقی عناصر داخل کئے، اصل سر چشمہ اقتدار خدا کو قرار دیا اور اپنے کو اس کا رسول اور نائب اور ساتھ ہی امت کے لئے لائے ہوئے احکام اپنے پر بھی مساوی طور پر واجب التعمیل قرار دیئے۔ اور عہد نبوی میں ذات اقدس کے خلاف دیوانی اور ٹارٹ (ضمان) کے جو مقدمات دائر ہوئے، [۱۹] ان نظائر کی موجودگی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے **King can do no wrong** (بادشاہ کسی فعل ناجائز کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا) کو مسترد کر دیا۔ اور جب ملک کا قوی ترین شخص قانون کی خلاف ورزی پر عدالتی دار و گیر سے محفوظ نہ رہ سکے تو دیگر عہدہ دار اور عام لوگ بھی تعمیل زیادہ توجہ کے ساتھ کریں گے۔ اس دستاویز کے دو نمایاں حصے ہیں:۔

حصہ اول میں (۲۵) فقرے ہیں جن کو ولہاوزن نے (۲۳) قرار دیا تھا اور جملہ یوروپی مولفوں نے ولہاوزن ہی کے نمبرات برقرار رکھے ہیں، میں نے بھی مجبوراً (۲۳) ہی نمبرات دیئے، البتہ ضمن الف وب کر کے دو دفعات کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور اس طرح ان کے (۲۵) دفعات قرار دئے تاکہ یورپی مواد سے استفادے میں کسی کو الجھن پیدا نہ ہو۔

حصہ دوم ۲۴ تا ۴۷ پر مشتمل ہے لیکن ضمنی تقسیم متعدد فقرات میں کرنی پڑی میرے حساب سے یہ حصہ (۲۸) فقرات پر مشتمل ہے اور جملہ دستاویز میں (۵۳) فقرات یا دفعات ہیں۔

پہلے (۲۳) دفعات مہاجرین و انصار کے متعلق قواعد پر مشتمل ہیں اور بقیہ حصہ مدینے کے یہودی قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے، ان دونوں میں ایک جملہ دہرایا گیا ہے کہ آخری عدالت مرافعہ محمد رسول اللہ کی ذات ہوگی۔ مسلمان مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی حد تک تو کوئی دشواری نہیں لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے چند مہینوں بعد ہی ایک نو وارد اجنبی (صلعم) کو اتنا بڑا اقتدار غیر مسلم طبقات نے دے دینا، کس طرح منظور کیا؟ مدنی عربوں کی حد تک یہ جواب ایک حد تک تشفی بخش سمجھا جاسکتا ہے کہ چونکہ وہاں اب تک قبائلی نظام تھا اور قبائلی سرداروں نے اسلام قبول کرلیا تھا اس لئے اپنے بزرگان خاندان کا مذہب قبول نہ کرتے ہوئے بھی ان کے خورد تر رشتہ دار انھیں کی سی کرنے پر مجبور تھے۔ عربی سماج کے باعث وہ خاندان اور قبیلے سے الگ نہ ہوسکتے تھے اور بیرون ملک بھی وہ اپنے باقی رشتہ داروں کی مدد کے بغیر جان و مال کا کوئی امن نہیں پاسکتے تھے۔ دستاویز میں صراحت سے یہ بتایا گیا ہے کہ جملہ مدنی قبائل اور مہاجرین مکہ وغیرہ کی مرکزائی ہوئی زبردست قوت سے انصار کے مشرک رشتہ داروں کو متمتع ہونے کا صرف اس شرط سے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی حیثیت سے مرکزی حکومت کی پالیسی میں رکاوٹیں نہ ڈالیں۔ چنانچہ حکم

دیا گیا ہے کہ عربی قبائل میں جو مشرک یا یہودی المذہب لوگ ہیں وہ مسلمانوں کے تابع اور جنگ میں معاون ہوں اور وہ قریش مکہ کی جان و مال کو نہ تو خود کوئی امان دیں اور نہ اس بات میں آڑے آئیں کہ مسلمان کسی قریشی کی جان و مال پر حملہ کریں دوسرے الفاظ میں ان کو قریشیوں سے حلیفی کو توڑنے ، تعلقات کو منقطع کرنے اور مسلمان اور قریشیوں کے تعلقات میں غیر جانب دار رہنے کی شرط پر حقوق شہریت عطا کیئے گئے اور انھیں اس کو منظور کرنا پڑا۔ ہمیں ایسے بھی بیانات عرب مولفوں کے ہاں ملتے ہیں کہ مدینے کے عرب برادرکشی اور باہمی لڑائیوں سے اکتا گئے تھے اور تنگ آکر اس پر آمادہ ہو چکے تھے کہ کسی اجنبی غیر جانبدار کو حکمراں بنا کر آئندہ امن کی زندگی بسر کریں ۔[۲۰] یہ عربی غیر مسلموں کا ذکر تھا۔

یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانے میں آنحضرت کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرین قیاس نہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دستور کا حصہ دوم، یعنی یہودیوں کا دستور العمل ، جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ ایک زبردست فتح سے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی اہل مدینہ نے اپنے سابقہ معاہدات حلیفی جو یہودیوں کے ساتھ تھے منسوخ کر لئے تھے۔ آنحضرت نے آس پاس ینبوع تک کے قبائل مثلاً بنی ضمرہ ، جہنیہ وغیرہ سے حلیفیاں کر کے مسلمانوں کی قوت کو بے حد مضبوط اور مستحکم بنا دیا تھا۔

یہودیوں کے دو بڑے گروہ آپس کے حریف و رقیب تھے۔ ان کا مستقلاً الگ الگ رہ کر محفوظ رہنا ممکن نہ تھا، اور وہ ہر طرف سے بچھڑ کر بے یار و مددگار اور ہر قوی کا شکار بنے ہوئے تھے۔ ان حالات نے انھیں مجبور کیا کہ اپنی مذہبی آزادی اور اندرونی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے آنحضرت سے ماتحتانہ تعاون کریں اور جیسا کہ عرض کیا گیا میرے خیال میں یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہو سکتا ہے، اس سے پہلے کا ہونا قرین قیاس نہیں۔ اگرچہ پوری دستاویز ایک ہی کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت انداز اسلوب سے بھی ایک ہی مرتب کنندہ کا ہونا پایا جاتا ہے اور مسلمان مورخ عام

طور سے یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز ۱ھ کی ابتدا میں مرتب ہوئی لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ۱ھ میں دستاویز کا حصہ اول مرتب ہوا ہو، اور بقیہ حصہ ۲ھ میں جنگ بدر کے بعد مرتب کر کے حصہ اول کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہو۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لسان العرب [۲۱] میں اس دستاویز کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہاں اس کو دو نام دئے گئے ہیں، ایک جملے میں اسے ''فی کتابه للمهاجرين والانصار'' کہہ کر اسے ''دستور العمل مہاجرین وانصار'' سے یاد کیا گیا ہے اور اسی سے ذرا نیچے حصہ دوم کے سلسلے میں ''(ووقع في كتاب رسول الله صلعم ليهود)'' ''دستور العمل یہودیان'' کی اصطلاح برتی گئی ہے ایک اور زیادہ راست شہادت اس سے ملتی ہے کہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن [۲۲] میں یہودیوں کے اس دستور العمل کو جنگ بدر کے بعد کا قرار دیا ہے جیسا کہ عرض ہوا اس دستور کے دو نمایاں اور ممتاز حصے ہیں، ایک اسلامی وعربی قبائل سے متعلق ہے اور دوسرا یہودیوں سے، ہر ایک کی مختصر تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی۔

سب سے پہلے فقرے میں ایک اسلامی سیاسی وحدت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے جس میں مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور وہ لوگ جو ان سب کے تابع دلاحق رہ کر ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ ہوں اور یہ سیاسی وحدت ''محمدؐ النبی رسول اللہ'' کے احکام کی اطاعت کرے گی۔ ف۱

اور اس اسلامی حصے کے سب سے آخری فقرے میں بھی مکرر اسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ منبع اقتدار تو ذات خداوندی ہے لیکن لوگ خدا کے بھیجے ہوے حضرت محمد کی اطاعت کریں گے اور اپنے جملہ اختلافوں، جھگڑوں میں ان سے ہی رجوع ہوں گے اور ان کے فیصلے کو آخری مانیں گے۔ ف۲۳

یہ سیاسی وحدت باوجود اندرونی بوقلمونی کے امت واحدہ سمجھی جاے گی اور تمام دنیا کے مقابل ایک ممتاز اور مستقل حیثیت رکھے گی۔ اور جملہ مسلم طبقات کو یکساں

حقوق وواجبات حاصل ہوں گے۔ف ۲۰

اور باوجود کمی تعداد وکمزوری وخطرات کے ان میں خودداری اور راہ راست پر ہونے کے جذبات پیدا کیے گے۔ف ۲۰، ف ۱۳

جنگ وصلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا، اور یہ نہیں ہوسکے گا کہ چند صلح یا جنگ کریں اور باقی نہ کریں۔جنگی خدمت جبری و لازمی ہوگی۔ اور سب اس میں برابر کا حصہ لیں گے۔عین حالت جنگ میں بھی نوبت نوبت فوجیں لڑیں گی اور آرام پائیں گی، یہ نہیں کہ پورا بار ایک ہی طبقے پر پڑے۔ف ۱۷، ف ۱۸

جنگ وصلح تو مرکزی مسئلہ ہوں گے البتہ حسب سابق پناہ دہی کا حق انفرادی طور سے ہر چھوٹے بڑے سب کو حاصل ہوگا اور ادنی ترین شخص کے دئے ہوئے وعدہ پناہ کا بھی پوری امت احترام کرے گی۔ف ۱۵

اور اس طرح اخوت ومساوات اور آزادی عمل اس سیاسی وحدت میں عملی طور سے جاری وساری کردی گئی۔ پناہ دہی کی اس آزادی میں ایک شرط لگائی گئی کہ جو مشرکین عرب اس سیاسی وحدت میں حقوق رعیت حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے یہ پابندی ہوگی کہ وہ قریش کی جان ومال کو کسی طرح کی پناہ نہ دیں گے اور نہ اس بات میں آڑے آئیں گے کہ قریش کی جان و مال کو مسلمان اپنے حقوق حربیت کے سلسلے میں نقصان پہنچائیں۔ف ۲۰ب

اس دفعہ کے سلسلے میں دو واقعات قابل ذکر ہیں جن کا امام بخاری [۲۳] نے ذکر کیا اور جو دونوں جنگ بدر سے پہلے پیش آئے تھے ان دونوں میں دو بڑی مسلمان شخصیتوں نے بعض قریشی افراد سے دوستانہ تعلقات کی بناء پر ان کی جائداد کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ بے شبہ دفعہ میں قریش کو پناہ دینے کی ممانعت صرف مشرک رعایا کو کی گئی ہے۔لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بھی اس کے پابند تھے اور بلاصراحت وہ اس پر عمل کرتے تھے اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ یہ دفعہ ابتدائی دستور میں نہ تھی بعد

میں جنگ بدر کے اختتام پر یہودی قبائل سے معاہدے کے یا کسی قریبی موقع پر اس اصل دستور میں اضافہ کی گئی۔ جنگ کے سلسلے میں جملہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مدگار اور دکھ درد میں حصہ دار رہنے کا حکم دیا گیا۔ ف۱۹

عدل گستری کے سلسلے میں آخری عدالت مرافعہ جہاں ذات رسالت پناہی صلعم کو قرار دیا گیا وہیں ہرجے اور خونہا (ضمان و دیت) کی ادائی کے لئے قدیم نظام بیمہ کی توثیق وتشریح کی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی رقمی ادائی کا مستوجب ہو تو اس کی مدد اس کے سب رشتہ دار کریں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنا ہو تو اس کے اہل قبیلہ ہی اس ادائی کے ذمہ دار ہوں گے۔ ف۴

اس سلسلے میں ایک طرح سے شہر کی محلہ دار تقسیم کی گئی اور ہر قبیلے کے لوگ دوسروں سے الگ یکجا ہی رہتے تھے، اور ہر محلے میں ایک میر محلّہ اور متعدد نائبان میر محلّہ اور اجتماع گاہ پائے جاتے تھے جن کو علی الترتیب نقیب، عریف اور سقیفہ کہتے تھے۔ کوئی محلّہ دار فنڈ یا خزانے کا پتہ تو نہیں چلتا، [۲۴] غالباً حسب ضرورت چندہ ہوتا ہوگا۔ یہ محلّہ دار مجلسیں بڑی حد تک خودمختار اور خود اکتفا تھیں۔

انصار کے قبائل تو معین تھے ہی اب ان عدالتی وسماجی اغراض کے لئے جملہ مہاجرین کا بھی ایک قبیلہ قرار دیا گیا۔ ف۳

اور یہ قرار دیا گیا کہ اگر کوئی محلّہ دار مجلس اپنے کسی اہل محلّہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو تو دیگر مجالس بھی ہاتھ بٹانے کی پابند ہوں گی۔ ف۱۲

اور یہ بھی صراحت سے بتا دیا گیا کہ اگر کسی قبیلے میں کوئی موالی ہوں یعنی کسی فرد سے قانونی اور معاہداتی بھائی چارہ کر کے اس قبیلے کے رکن بنے ہوں تو ایسے موالی کو اپنے اصل سے اختلاف کا حق نہ ہوگا۔ ف۱۲ اب

اس نظام ولاء کے سلسلے میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ ایک شخص کے مولا کو کوئی دوسرا شخص بلا اجازت اصل اپنا مولا نہ بنالے، (ایضاً بروایت ابن حنبل) انصاف

رسانی کا اختیار افراد سے لے کر جماعت یعنی مرکز کے سپرد کر دیا گیا جو ایک عظیم الشان انقلاب تھا، اور حکم دیا گیا کہ انصافی مسائل میں جانبداری کرنے اور اپنے رشتہ داروں کی پچ کرنے بلکہ خود حقیقی بیٹے تک کو بچانے کی کوشش کرنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی۔ اور جملہ مسلمان اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہر ضرر پہنچانے یا ضرر پہنچانے کی تیاری کرنے والے شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پوری طرح ہاتھ بٹائیں۔ ف[۱۳]

قتل عمد کی سزا قصاص مقرر کی گئی البتہ مقتول کے ولی کو اختیار دیا گیا ہے کہ دیت لے کر قصاص سے درگزر کرے۔ اور انصاف رسانی میں مداخلت کی سختی سے ممانعت کی گئی۔ ف[۲۱]

اسلام کی حقانیت جتانے اور اس کا بول بالا کرنے کے لئے مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ اگر ان کا کوئی غیر مسلم رشتہ دار کسی مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو قصاص پر اصرار نہ کریں اور کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد نہ کریں۔ ف[۱۴]

اسی طرح کسی قاتل مجرم کو پناہ یا مدد دینے کی ممانعت کی گئی اور کہا گیا کہ جو خدا اور قیامت پر ایمان لایا ہے اور جس نے اس دستاویز کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا ہے، اگر وہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس کی رستگاری کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

انصار کے بعض لوگ یہودیت قبول کر چکے تھے، خاص کر بعض بچوں کو ان کے والدین منت مان کر یہودی بنا دیتے تھے۔ ان کے متعلق بھی ایک خصوصی دفعہ رکھ دی گئی کہ اگر وہ ماتحتانہ اتحاد عمل پر آمادہ ہوں تو انھیں سب مسلمانوں کے برابر حقوق رعیت حاصل ہوں گے۔ ان کی حفاظت و مدد کی جائے گی اور ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا جائے گا۔ ف[۱۶]

یہاں تک ان امور کا ذکر ہوا جو حصہ اول میں مندرج ہیں اور جو مدینے کے عربوں سے متعلق ہیں۔ حصہ دوم یہودیوں کے قبائل سے متعلق ہے۔

اوپر اس امر سے بحث ہو چکی ہے کہ آیا یہودیوں کا یہ دستور انصار و مہاجرین کے قواعد کے ساتھ ہی بنایا گیا یا بعد میں۔ اس حصے کی مختصر تحلیل کے سلسلے میں عرض ہے کہ اس کی پہلی دفعہ مشترک ہے کہ کسی جنگ کی صورت میں اگر مسلمان اور یہودی اتحاد عمل کریں تو ہر حلیف اپنے مصارف جنگ خود برداشت کرے گا اور یہ حکم نہ صرف ف۲۴ میں بیان ہوا ہے بلکہ ف۳۷-۱ اور ف۳۸ میں بھی دہرایا گیا ہے اور غالباً ف۴۵ب کی مبہم عبارت کا بھی یہی منشا ہے کہ (علی کل اناس حصتهم من جانبهم الذی قبلهم) جس کو ابوعبید نے ''حصتهم من النفقة'' لکھا ہے اس تکرار کی وجہ غالباً یہی تھی کہ مالی معاملات میں یہودی بہت بدنام تھے ان کی بدمعاملگی کو ''ليس علينا في الامين سبيل ''اور''منهم من ان تامنه بدينار لايوده اليک ''وغیرہ آیات قرآنی میں بھی طشت از بام کیا گیا ہے۔ جب مصارف برداشت کرنے کی ذمہ داری تھی تو ظاہر ہے کہ انھیں مال غنیمت کو پانے کا بھی حق حاصل تھا جیسا کہ ابوعبیدہ نے اپنی شرح میں صراحت بھی کی ہے۔[۲۵] یہودیوں نے بھی آنحضرت کے سیاسی اقتدار کو مان لیا تھا اور ہر اختلاف میں آنحضرت کے فیصلے کو آخری تسلیم کرلیا تھا، جیسا کہ ف۴۲ میں نہایت صراحت سے قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ف۲۵ میں ''یہودی اپنے مذہب پر اور مسلمان اپنے مذہب پر'' کہہ کر دینی آزادی اور رواداری کا اعلان کرنے کے باوجود ف۴۲ میں ابن اسحاق کی روایت میں ''محمد رسول اللہ'' اور ابوعبید کی روایت میں ''محمد النبی'' کے الفاظ برتے گئے ہیں اور ف۴۷ میں ابن اسحاق کے ہاں ''محمد رسول اللہ'' کا کلمہ مکرر آیا ہے گو ابوعبید کی روایت میں یہ جملہ حذف کردیا گیا ہے۔ اس کے معنے غالباً یہ تو نہیں ہوں گے کہ ان یہود نے آنحضرت کی رسالت یا نبوت مان لی بلکہ ان تاریخی کتابوں کے کسی باادب کاتب نے یہ لفظ بڑھائے ہوں گے (کیونکہ ابن اسحاق کے ہاں دونوں جگہ آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا ہے جو خود آنحضرت کا اپنے متعلق لکھنا قرین قیاس نہیں ہے) یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''نبی'' یا ''رسول اللہ'' کا لفظ

آنحضرت نے خود لکھا تھا اور یہودیوں نے اپنی خطرناک سیاسی و جنگی حالت کے مدنظر اس پر اعتراض کی جرات نہ کی۔ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے استعمال کے متعلق سیرۃ ''ابن ہشام، ص۹۹۲، سطر (۳) سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطبے وغیرہ میں آنحضرت اس کا بطور دعا خود بھی اپنے متعلق استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اس ذیلی بحث کے قطع نظر اس دستاویز میں دس یہودی قبائل کا فرداً فرداً اور نام بنام ذکر کیا گیا۔ اور ان کے حقوق کی مساوات تسلیم کی گئی۔ اس کا منشاء بظاہر یہ ہے کہ یہودیوں نے ایک جماعت بن کر اس وفاقی شہری مملکت مدینہ میں شرکت نہیں کی بلکہ ہر قبیلہ ایک علاحدہ وحدت کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے چند یہودی قبائل سے جنگ کی یا انھیں رہنے کی سرزمین سے نکل جانے کا حکم دیا تو نہ صرف باقی قبائل خاموش رہے بلکہ بعض مواقع پر انھوں نے مسلمانوں کی جنگی مدد بھی کی اور اس جنگ کے باوجود یہ معاہدہ یا دستور دیگر یہودی قبائل کی حد تک باقی رہا، منسوخ نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ اس دستور میں خون بہا کی ادائیگی میں اہل قبیلہ اور موالی مشترکہ طور پر ذمہ دار قرار دئے گئے تھے اور بنی قینقاع کے اخراج کے بعد بنوالنضیر سے اسی قرارداد مندرجہ ف۲۵ ف۲۶ کے تحت آنحضرت نے ایک موقع پر چندہ دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ [۲۶] یہودیوں کو مسلمان رعایا کے ساتھ سیاسی و تمدنی حقوق میں صراحت سے مساوات دی گئی ف۲۵ اور یہودیوں کے معاہداتی رشتہ داروں کو جنھیں موالی بطن، اور بطانہ کا نام دیا گیا ہے حقوق اور ذمہ داریوں میں عام اور اصلی یہود کے برابر مان لیا گیا ہے۔ ف۳۲، ف۴۰، ف۳۴، ف۴۵، ف۴۶ البتہ پناہ گزیں بلا اجازت پناہ دہندہ کسی اور کو پناہ نہیں دے سکتا ف۴۱۔ یہودیوں سے اصل میں ایک جنگی حلیفی کی گئی تھی چنانچہ ف۳۷، ف۴۴ اور ف۴۵ میں صراحت سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں اور ان سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں اور مدینے کی مدافعت میں مشترکہ حصہ لیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہو تو یہودی مسلمانوں کو مدد دیں گے اور یہود پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان،

یہودیوں کو مدد دیں گے، البتہ دینی جنگوں میں جو مسلمان اختیار کریں یہودیوں کو ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری نہ ہوگی ف۴۵ نیز مسلمان کے ساتھ فوج میں ان کی شرکت آنحضرت کی اجازت پر منحصر رکھی گئی ف۳۶۔الف اس دفعہ کی عبارت کسی قدر مبہم ہے اور یہ معنے بھی نکلتے ہیں کہ یہودی آنحضرت کی اجازت کے بغیر خود بھی مستقلاً کسی سے جنگ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو آنحضرت کے سیاسی اقتدار کی مزید وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس اہم قرار داد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مکے کے قریش متاثر ہوئے ہوں گے جو مسلمانوں کے خلاف مدد دے سکنے والے ایک اہم حلیف یعنی یہودیوں کی اعانت سے محروم کردئے گئے جیسا کہ ف۴۳ میں قرار دیا گیا ہے کہ یہودی، قریش اور قریش کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دیں گے، گو بدقسمتی سے عمل اس پر نہ ہوا اور یہودی سردار برابر قریش سے سازش کرتے رہے اور جنگ بدر کی شکست کے بعد اس کا سلسلہ جو شروع ہوا تو بنو قریظہ کی بلا شرط اطاعت تک برابر جاری رہا[۲۷] بہر حال صلح و جنگ کو وفاق کا بلا شرط ایک مرکزی مسئلہ قرار دے دیا گیا، اور جنگ کی کمان آنحضرت کو حاصل ہوگئی جو آنحضرت کی زبردست سیاسی کامیابی تھی۔

سماجی اور اندرونی مسائل میں آنحضرت نے کوئی مداخلت نہیں کی اور فدیہ، دیت اور جوار یا پناہ دہی اور معاہداتی رکنیت قبیلہ کے ادارات اور رواجات کو برقرار رکھا گیا ف۲۵ ف۳۱ ف۴۰۔ اس فرزانہ سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کو ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ نہیں ہوئی اور یہودیوں نے خوشی سے اس کو منظور کرلیا کہ آنحضرت ان کی بھی آخری عدالت مرافعہ کے فرایض انجام دیں ف۴۲۔ نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے مقدمات میں آنحضرت ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلے فرمایا کرتے تھے جنگ و صلح کی طرح یہودیوں کی عدل گستری کو بھی ف۳۶ب میں صراحت کے ساتھ مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا۔ اور انصاف میں رشتہ داری وغیرہ کے باعث دخل دہی کی قطعی ممانعت کی گئی اور قدیم زمانے کے انتقامات اور انتقام کے انتقامات کا لامتناہی سلسلہ

یک لخت روک دیا گیا آنحضرت کا یہودیوں پر عدالتی اقتدار اعلی بھی مسلمانوں کے لئے بڑی سیاسی فتح تھی ۔ یہودیوں نے نہ صرف آنحضرت کو اپنا مقتدر اعلیٰ تسلیم کرلیا بلکہ شہر مدینہ و مضافات (جوف) کو ایک حرم بھی تسلیم کیا ف[۳۹] ۔ مکہ ایک حرم تھا۔ شہر طائف کی حرمت کو ۹ ھ کے معاہدہ طائف میں بھی تسلیم اور برقرار رکھا گیا (دیکھے کتاب الاموال لابی عبید، ص ۵۰۶ یہودیوں سے ایک نیم عرب شہر کو حرم مقدس منوالینا بھی آنحضرت صلعم کا ایک سیاسی کارنامہ تھا اور اس طرح چھوٹی سی بستی کو جو بیس ایک محلوں پر مشتمل تھی شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا، اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں و کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا، اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا کہ وہ بعد میں ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہیت، کا بلا کسی دقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔ یورپ کے لفظ پر آپ حیران نہ ہوں، عہد بنی امیہ سے بہت پہلے حضرت عثمان کے زمانے میں ۲۷ھ میں مسلمانوں کی فوجیں اندلس میں داخل ہوگئیں اور مزید کمک نہ ملنے کے باوجود وہیں مقیم اور ملک کے ایک حصے پر قابض رہیں تا آں کہ بہت دنوں کے بعد طارق آتا ہے اور اندلس کی فتح کو مکمل کرتا ہے، عہد عثمانی کی اس مہم کا ذکر طبری [۲۸] اور گبن [۲۹] نے بھی کیا ہے، اور سب جانتے ہیں کہ عہد عثمانی تک مدینہ ہی مرکز خلافت تھا۔

اس دستاویز میں ایک جگہ لفظ ''دین'' بھی برتا گیا ہے۔ اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس کو پیش نظر رکھے بغیر مذہب اسلام اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہاں اس دستور کے متن کا ترجمہ بے محل نہ ہوگا۔

اصل متن دستور کے ماخذ

۱۔ سیرۃ ابن ہشام (طبع یورپ) ص ۳۴۱ تا ۳۴۴۔

۲۔ سیرۃ ابن اسحاق (ترجمہ فارسی، مخطوطہ پاریس) ورق ۱۰۱۔

۳۔ کتاب الاموال مولفہ ابو عبید قاسم بن سلام (طبع مصر) فقرہ ۵۱۷۔

۴۔ البدایہ النہایہ مولفہ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶۔

۵۔ سیرۃ ابن سید الناس۔ احوال بعد ہجرت کے ضمن میں۔

متن کے اقتباسات کے ماخذ

۱۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب ۱۹۔ باب ۲۱۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل۔ ج ا ص ۲۷۱۔ ج ۲ ص ۲۰۴ ج ۳ ص ۲۴۲۔

۳۔ تاریخ الطبری (طبع یورپ سلسلہ اول) ص ۱۲۶۲، ۱۳۵۹۔

۴۔ لغت لسان العرب مولفہ ابن منظور تحت مادہ ہائے ''بدر، وسع، عقب، عقل، فرح، وتغ''۔

۵۔ طبقات ابن سعد ج القسم دوم ص ۱۷۲۔

اس موضوع پر یورپی زبانوں کے مضامین

1. Wellhausen Gemeindeordnung von Medina, (in Skizzen und Vora rbeiten, vol.4. Nr,2.)
2. Caetani, Annali dell 'Islam, anno1, 43.
3. Wensinck, mohammed on de Joden te Medina. pp 78 et Saq.
4. Buhl, Das Leben Mohammeds, pp. 210.212.
5. Sprenger, Das Leben und die Lehre des Mohammed vol. 3, pp.15.18.
6. Grimme, Mohammed pp. 75.S1.

7. Mueller,Der Islam in Morgon -und Abendland, vol. 1. pp. 15.18.
8. Majid Khadduri, The Law of War and Peace in Islam p. 84.87.
9. Hamidullah, "Administration of Justice in Early Islam", Islamic Culture, quartly, Hyderabad. vol pp. 163. 72.
10. La Diplomatie musulmane in loco.

ترجمہ دستور مملکت مدینہ بہ عہد نبوی

(کوشش کی گئی کہ ترجمہ واضح ہو اور سمجھے کے لئے کسی حاشیے کی ضرورت نہ رہے۔ اور فقرات پر نمبر بھی لگا دئے گئے ہیں تا کہ حوالے میں سہولت رہے۔ یہ نمبر چونکہ معین ہو چکے ہیں اور جرمنی، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ ہر جگہ ایک ہی ہیں اس لئے جہاں مجھے اختلاف کرنا پڑا وہاں الف، ب کر کے ذیلی تقسیم کی گئی ہے اور بین الاقوامی نمبروں کو باقی رکھا گیا ہے)

رحم والے اور مہربان خدا کے نام سے۔

ف۱ یہ ایک حکم نامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمد کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جوان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

ف۲ تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (امت) ہوگی۔

ف۳ قریش سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے محلے کے (ذمہ دار) ہوں گے اور اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ

دے کر چھڑائیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۴ اور بنی عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۵ اور بنی الحارث بن خزرج اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۶ اور بنی ساعدہ اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۷ اور بنی جُشَم اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہرگروہ اپنے ہاں کے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۸ اور بنی النجار اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہرگروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۹ اور بنی عمرو بن عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہرگروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۱۰ اور بنی النبیت اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۱۱ اور بنی الاوس اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر کردیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خودفدیہ دے کے چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۱۲ الف۔ اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دئے بغیر چھوڑ نہ دیں گے تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۱۲ ب۔ اور یہ کہ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولا (معاہداتی بھائی) سے خود معاہدہ برادری نہیں پیدا کرے گا۔

ف۱۳ اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ف۱۴ اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور نہ کسی کافر کی کسی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا۔

ف۱۵ اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان (مسلمانوں میں) کا ادنی ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عاید کر سکے گا۔ اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل۔

ف۱۶ اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

ف ۱۷ اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا جب تک کہ (یہ صلح) ان سب کے لئے برابر اور یکساں نہ ہو۔

ف ۱۸ اور ان تمام ٹکڑیوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائی جائے گی۔

ف ۱۹ اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لیں گے جو خدائی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

ف ۲۰ الف۔ اور بے شبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں

ف ۲۰ ب۔ اور یہ کہ کوئی مشرک (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان اور مال کو کوئی پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا۔

ف ۲۱ اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خونبہا پر راضی ہو جائے۔ اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لئے اٹھیں گے اور اس کے سوائے انھیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی۔

ف ۲۲ اور کسی ایسے ایمان والے کے لئے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ بات جائز نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے۔ اور جو اسے مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے۔ اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہوگا۔

ف ۲۳ اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمد سے رجوع کیا جائیگا۔

ف ۲۴ اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں

گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

ف۲۵ اور بنی عوف کے یہودی، مومنین کے ساتھ، ایک سیاسی وحدت (یا امت) تسلیم کیے جاتے ہیں یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں کو ان کا دین۔ موالی ہوں کہ اصل۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

ف۲۶ اور بنی النجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۲۷ اور بنی الحارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۲۸ اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۲۹ اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۳۰ اور بنی الاوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۳۱ اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

ف۳۲ اور جفنہ جو (قبیلہ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، اسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

ف۳۳ اور بنی الشطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ اور وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

ف ۳۴ اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

ف ۳۵ اور یہودیوں (کے قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

ف ۳۶ الف۔ اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد کی اجازت کے بغیر (فوجی کاروائی کے لئے) نہیں نکلے گا۔

ف ۳۶ ب۔ اور کسی مار، زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی اور جو خونریزی کرے تو اس کی ذات اور اس کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا ورنہ ظلم ہوگا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس (دستورالعمل) کی زیادہ سے زیادہ وفا شعارانہ تعمیل کرے۔

ف ۳۷ الف۔ اور یہودیوں پر ان کے خرچے کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کے خرچے کا۔

ف ۳۷ ب۔ اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد عمل میں آئے گی۔ اور ان میں باہم حسن مشورہ اور بہی خواہی ہوگی اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

ف ۳۸ اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

ف ۳۹ اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہو) اس دستور والوں کے لئے ایک حرم (اور مقدس مقام) ہوگا۔

ف ۴۰ پناہ گزیں سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کے ساتھ۔ نہ اس کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

ف ۴۱ اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی (یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزیں کو نہیں)

ف ۴۲ اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو

تو اسے خدا اور خدا کے رسول محمدؐ سے (جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو) رجوع کیا جائے گا۔ اور خدا اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف۴۳ اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس کو جو انھیں مدد دے۔

ف۴۴ اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم مدد دہی ہوگی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

ف۴۵ الف۔ اور اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں گیا اور اس میں شریک رہیں گے اور اگر وہ کسی ایسے ہی امر کے لئے بلائیں تو مومنین کا بھی فریضہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا ہی کریں بجز اس کے کہ کوئی دینی جنگ کرے۔

ف۴۵ ب۔ ہر گروہ کے حصے میں اسی رخ کی (مدافعت) آئے گی جو اس کے بلمقابل ہو۔

ف۴۶ اور (قبیلہ) الاوس کے یہودیوں کو، موالی ہوں کہ اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور والوں کو اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفا شعاری کا برتاؤ کریں گے۔ اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔ جو جیسا کرے گا ویسا خود ہی بھرے گا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس دستور کی مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف۴۷ اور یہ کہ حکم نامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئے گا۔ اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہوگا اور جو مدینے میں بیٹھ رہے تو بھی امن کا مستحق ہوگا ورنہ ظلم اور عہد شکنی ہوگی۔ اور خدا اس کا نگہبان ہے جو وفا شعاری اور احتیاط (سے تعمیل عہد) کرے اور اللہ کے رسول محمدؐ بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

(مجلہ طیلسانیین حیدر آباد دکن)، جولائی ۱۹۳۹ء

حواشی:

[۱] Grammar of politics. by H J)Laski میں بھی یہی نتیجہ استقراء نکلا ہے

[۲] مسالک ابن فضل اللہ العمری، مخطوطہ پاریس۔

[۳] Aristotle on the othenion constitution by kenyonp XV

[۴] Encyclopaedia of soceal sciences Vol-1 p.27 نیز P-X III

[۵] حوالے مضمون کے آخر میں دے گئے ہیں

[٦] موتمر دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد

[۷] ابن ہشام ص ۲۷۸، نیز طبقات ابن سعد، احوال قبل الہجرۃ

[۸] معارف ابن قتیبہ، ص ۴۳، کتاب المنتقی من دلائل النبوۃ لابی نعیم (مخطوطہ) الفصل العشرون

[۹] ابن ہشام ص ۱۰۷، ۳۳٦، ۳۴٦ ، طبقات ابن سعد ج ۱/ ۱ص ۳۴، ۴۵، ۴٦، معارف ابن قتیبہ ''احوال عمومۃ'' تاریخ طبری ج ۲ص ۱۷۷ تا ۱۷۹ وغیرہ

[۱۰] بخاری کتاب ٦۴ باب ۸۴ حدیث ۳، یہ مکان بی بی خدیجہؓ سے آنحضرت کو وراثت میں ملا تھا (مبسوط سرخسی ۵۲/۱۰)

[۱۱] ابن ہشام ص ۳۳۹ ص ۳۴۱ تا ۲۲ نیز بنی جحش کی جائداد پر ابوسفیان کے قبضے اور فروخت کے لئے محمد بن حبیب کی المنمق (مخطوطہ) ص ۱۸۵

[۱۲] مطبوعہ رسالہ اسلامک کلچر، جولائی ۱۹۳۸ نیز باب گزشتہ ''شہری مملکت مکّہ''

[۱۳] ابن ہشام ص ۲۸۷، طبقات ابن سعد ۱/۱ ص ۱۴۷، مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۴۲۷، بخاری کتاب ٦۳ باب ۲۷، ۴٦

[۱۴] ابن ہشام ص ۲۸۵، ۲۹۰

[۱۵] بخاری کتاب ۷۹ باب ۲۰

[۱٦] سیرت ابن ہشام ص ۲۷۷، تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۵۱۱ ومابعد، نیز قرآن مجید سورہ ٦۳

آیت ۸ کی تفسیر

[۱۷] ابن سعد ج ۲/اص ۱۹۔ کتاب الاموال لابی عبید ۵۱۸

[۱۸] ابرار کے نامہ اعمال کا جنت میں جانا بے معنے بات ہوگی۔ میں اس کے معنے یہ لیتا ہوں کہ ابرار کے متعلق طے شدہ حکم یہ ہے کہ وہ علیین میں رہیں گے

[۱۹] ابن ہشام ص ۴۴۴، نیز تاریخ ابن الاثیر ذکر احوال مرض موت آنحضرت صلعم وسیرۃ شامی، بر موقع۔ جہاں چھ آٹھ مقدموں کا ذکر ہے۔

[۲۰] ملاحظہ ہو اوپر ص ۸۱

[۲۱] تحت کلمہ ''ربع''

[۲۲] سنن ابی داؤد کتاب ۱۹ باب ۲۱

[۲۳] بخاری کتاب ۴۰ باب ۲ نیز کتاب ۶۴ باب ۲

[۲۴] لیکن بنوالنضیر کے یہودیوں میں قبیلہ داری بیت المال تھا چنانچہ سیرۃ شامی میں غزوہ سویق کے بیان میں لکھا ہے ''سلام بن مشکم وکان سید بنی النضیرفی زمانه ذلک و صاحب کنزهم. ....یعنی بالکتر هنا المال الذی کا نوایجمعونه لنو ایبهم ومالبصرض لهم'' (یعنی سلام بن مشکم اس زمانے میں بنوالنضیر کا سردار اوران کا افسر خزانہ تھا، خزانے سے مراد یہاں وہ مال ہے جو وہ اتفاقی حوادث اورضروریات کے لئے جمع کیا کرتے تھے

[۲۵] روض الانف للسهیلی ج ۲ص ۱۷۔ کتاب الاموال لابی عبید ۵۱۷

[۲۶] ابن ہشام ص ۶۵۲۔ ابن سعد ج /اص ۴۰ تا ۴۱۔ تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۴۴۹ تا ۵۰

[۲۷] البدایہ والنھایہ لابن کثیر ج ۴ص ۶۔ ابن ہشام ص ۶۸۱ نیز پروفیسر ٹارے کی ''جوئش فاونڈیشن آف اسلام''

[۲۸] تاریخ طبری ص ۲۸۱۷

[۲۹] Decline and fall of the Roman Empire v.p 555

قرآنی تصور مملکت

جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے کبھی ایک اقتدار کے تحت متحد نہیں ہو سکا تھا، اور یہ ایک انوکھا اور عجیب و غیرب واقعہ تھا کہ پورے ملک نے حضرت محمد صلعم کو متحدہ طور سے اپنا روحانی اور سیاسی سردار تسلیم کر لیا۔ جس ملک میں نراج کا دور دورہ ہو، وہاں دس ہی سال کی کوشش میں ایک مرکزیت اور نظام قائم کر دینا رسول کریم صلعم کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ آنحضرت صلعم اپنے آپ کو آسمانی وحی کا تابع قرار دیتے تھے، جو وقتاً فوقتاً آتی تھی، اور جس کا مجموعہ اب قرآن کے نام سے دنیا میں موجود و مشہور ہے۔ اگر کوئی شخص سیرۃ نبویہ کا قریب سے مطالعہ کرے، تو اسے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے اس قول کی صحت کو باور کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوگی، کہ قرآن رسول کریم صلعم کی زندگی کا آئینہ ہے، (کان خلقہ القرآن)۔ اسی لئے یہ معلوم کرنا کہ آنحضرت صلعم کی شریعت میں مملکت کا تصور کیا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ قرآن کو دیکھنے سے ممکن ہے (حدیث کے مواد سے استفادہ طویل تر فرصت اور کثیر تر مطالعے کا متقاضی ہے)۔

یہ چیز قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف ازمنہ سابقہ کے پیغمبروں کے حالات بیان ہوئے ہیں، بلکہ ان کی سیرتوں کو جو قرآن میں ہیں اب بھی ماخذ قانون تسلیم کیا گیا ہے، بجز اس کے کہ صراحت سے قرآن اسے یا اس کے کسی جز کو منسوخ

قرار دے۔ دوسرے الفاظ میں انبیائے سابقہ کی سنت مسلمانوں پر اب بھی واجب التعمیل ہے، بجز اس کے کہ اس کے کسی معین جز کے نسخ کا کوئی حکم قرآن مجید میں یا رسول کریم صلعم کے افعال واقوال میں صراحت سے ملتا ہو۔ ایک آیت ملاحظہ ہو۔

اولئک الذین اتینھم الکتب والحکم والنبوة الایه

یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی۔ اگر کوئی لوگ اس کو نہ مانیں تو ہم یہ امانت ایسے لوگوں کے سپرد کریں گے، جو اس سے انکار نہ کریں۔ یہی وہ لوگ [۱] ہیں، جن کی خدا نے ہدایت کی ہے، اس لئے تو ان کی رہنمائی کی پیروی کر۔'' (قرآن ۸۹ تا ۶/۹۰ نیز دیکھئے ۴۲/۱۳)۔ امام بخاری اور ترمذی نے ایک حدیث روایت کی ہے، کہ جب کبھی کسی معاملے میں براہ راست آسمانی وحی نہیں آتی، تو رسول کریم صلعم بجائے عام عربی رواجات کے اہل کتاب کے طریقوں کی پیروی فرمایا کرتے تھے۔

یہ چیز سیاسی معاملات کہ حد تک بھی اسی طرح صادق آسکتی ہے، جس حد تک معاشی و معاشرتی معاملات میں۔

معاشرہ انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ''مملکت'' کا قیام بڑے عرصے کے بعد ہوسکا۔ قرآن مجید میں واقعات کی جو ترتیب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ سب سے پہلے حضرت آدمؑ پیدا ہوئے، جن کو خدا نے زمین پر نائب یا خلیفہ مقرر کیا۔ وہ نسل انسانی کے باپ تھے، اور بزرگ خاندان ہونے میں ان کا کوئی حریف نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد کئی نسلوں تک ان کی اولاد میں مختلف قسم کے اختلافات اور برائیاں کم یا زیادہ مقدار میں ساری رہیں، اسے لئے قرآن مجید کے مطابق پیغمبر بھیجے گئے، جو خدا اور عام انسانوں کے مابین واسطے کا کام دیتے تھے۔ وہ انسانوں کو یہ بتاتے تھے، کہ ان کے خالق کی مشیت اور اس کا حکم کیا ہے، اور نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے تھے۔ ان پیغمبروں نے خلوص کے ساتھ جو بے

غرضانہ نصیحتیں کیں، اوران کی باتوں کو کچھ لوگوں نے مانا بھی تو اس جماعت کی حیثیت کسی مملکت کی قرار دینی مشکل ہے۔ بظاہر قدیم ترین زمانے میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کے باوجود سیاسی نظام اور اقتدار کی ضرورت نہیں پائی جاتی تھی، قرآن مجید میں بھی بار ہا ذکر ہے۔ کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو سرفرازی عطا ہوئی۔ مگر ایک مملکت کو دوسری مملکت کی جگہ قائم کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان قومی وحدتوں کے غیر سیاسی وجود کے باوجود ان لوگوں کی معاشی اور سماجی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، لیکن ان چیزوں کا ذکر صرف اس طور سے ہوا ہے، کہ لوگ ان کو خدا کی نعمتیں سمجھ کر دیا رکھیں اور خدا کی اطاعت کا فریضہ بجالائیں۔

بادشاہی کے ذکر کا آغاز قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے ملنے لگتا ہے، جب کہ ایک شخص اپنے ملک کے تمام لوگوں کی جان و مال پر اپنا اقتدار چلاتا ہوا نظر آتا ہے (دیکھئے قرآن مجید ۲۵۸ ص ۲ نمرود کا قصہ) حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے سے مملکت میں زیادہ ترقی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان کے زمانے کے حالات میں (دیکھئے قرآن مجید ۱۳/۳۰) بادشاہوں اور وزیروں اور سرکاری قید خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے، (سورہ یوسف)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو حالات قرآن مجید میں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ان مقدس رہنما کی تمنا اور خواہش یہ تھی کہ ارض موعود میں ایک مملکت قائم کریں۔ مگر قوم نے اپنی نااہلی کے مظاہرے (اور عدم اطاعت احکام الٰہی) سے مایوسی کا سامان کردیا آخر ان کی قوم کو چالیس سال تک انتظار کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو، جس کی بچپن ہی سے ان کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہو، اور پھر اس نئی نسل کی مدد سے وہ ارض موعود کو فتح کریں۔ گو اسی اثناء میں حضرت موسیٰ نے وفات پائی، اور ان کی چہل سالہ تربیتی اسکیم ان کے بعض فیض یافتوں نے مکمل کی۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں جو فرعون مصر تھا، وہ قرآنی تذکرے

کے مطابق ایک خاصا با قاعدہ حکمران تھا۔ جس کا ایک وزیر تھا، اور جس کے مشورے کے لئے معمرین اور اہل الرائے لوگوں کی ایک مجلس بھی پائی جاتی تھی، اس مجلس کے اجلاسوں کی جو روئداد قرآن مجید میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اور عاجلانہ فیصلے نہیں کیا کرتی تھی بلکہ اس کے مشورے مناسب اور قابل عمل ہی ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ و ہارون سے ان کی جدت طرازیوں کے باعث کیا برتاو کرنا چاہیے؟ جب فرعون نے یہ سوال پیش کیا، تو مجلس شوریٰ نے نرمی اور اعتدال کا مشورہ دیا تھا۔ اس زمانے میں عوام الناس تک ایک حد تک سیاسی شعور رکھتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ (قرآن مجید ۱۹/ ۲۸) جب ایک شخص نے حضرت موسیٰ کو ان کی سخت گیری کے باعث ملامت کرنی چاہی تو اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ۔

اِنْ تُرِيدُ اِلاَّ اَن تَكُونَ جَبَّاراً فِی الاَرضِ الایہ تو تو زمین میں ایک جبار بن جانا چاہتا ہے، اور اصلاح وفلاح کا کام کرنے والوں میں سے نہیں ہونا چاہتا۔''

حضرت موسیٰ کے زمانے میں مجلس دوگانہ یا مرکب بادشاہت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ [۲]۔ جو بنی اسرائیل میں کارفرما رہی۔

طالوت یعنی بادشاہ ساؤل کا قصہ قرآن مجید میں ایک خصوصی دلچسپی کا حامل ہے۔ بنی اسرائیل کو ان کے دشمن نے شکست دے کر ان کے گھروں سے جلاوطن کر دیا تھا۔ انتقام کی خواہش نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے پیغمبر سے یہ خواہش کریں کہ ان پر ایک بادشاہ نامزد کیا جائے جو ان کو ساتھ لے کر دشمنوں سے لڑ سکے۔

اِذ قَالُوا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكاً نُّقَاتِل فِی سَبِیلِ اللّٰهِ ۔ الایہ، یاد کرو جب موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک بادشاہ کو مامور کر، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑسکیں، اس (نبی) نے کہا اگر تم پر لڑنا فرض ہونے کے بعد لڑنے سے انکار کرو تو؟ انھوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں،

جب کہ ہمیں ہمارے گھروں سے اور ہمارے بچوں سے نکال باہر کردیا گیا ہے، اس کے باوجود جب لڑنا ان پر فرض کیا گیا تو انھوں نے روگردانی کی۔ بجز چند لوگوں کے اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

ان کے پیغمبروں نے ان سے کہا:۔ دیکھو اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ وہ ہمارا بادشاہ بنے؟ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں، کیونکہ وہ مالدار نہیں ہے۔ اس (نبی) نے کہا اللہ نے اسے کو تم پر فوقیت دی ہے، اور علم و جسم میں اس کو وافر حصہ دیا ہے اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اللہ ہر چیز کے گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے''۔

(قرآن مجید ۲۴۶ تا ۲/۲۴۷)

علاوہ اور اہمیتوں کے اس اقتباس میں یہ بتایا گیا ہے، کہ مال و دولت یا حسب و نسب نہیں بلکہ علم و جسم یعنی سیاست دانی اور بہادری بادشاہت کی اولین ضرورتیں ہیں۔ اس اقتباس سے یہ اہم چیز بھی معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس زمانے میں یہودیوں نے مذہب اور سیاست کو الگ چیزیں ہونا تسلیم کر لیا تھا، اور نبی کے علاوہ بادشاہ کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ بادشاہ فرائض نبوت بجا نہیں لا سکتا تھا۔ اور نہ نبی فرائض بادشاہت، البتہ یہ چیز قابل ذکر ہے، کہ طالوت یعنی بادشاہ ساول کے فوری جانشین حضرت داودؑ اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ دونوں بادشاہت اور نبوت ہر دو حیثیتوں کے حامل بنے، ان کا کچھ تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

حضرت داوٗدؑ کا قرآنی تذکرہ بے حد اہم ہے، کیونکہ اس میں فرائض باشاہت کا (جن میں عدل گستری سب سے اہم ہے) ذکر کیا گیا ہے:۔

(۱) وَقَتَلَ داوٗد جالوتَ و اتاہ اللّٰہُ الملکَ وَالحَکمۃَ

اور داود نے جالوت کو قتل کیا، پھر خدا نے اس کو بادشاہت اور حکمت عطا کی۔''

(قرآن مجید ۲/۲۵۱)

(ب) وَشَدَ دنامُلکۂ وآتیناہُ الحِکمۃَ وفصل الخطابِ ہم نے اس کی حکمت کو مضبوط بنادیا، اور اس کو حکمت اور فیصلہ کرنے والی زبان عطا کی۔''

(ایضاً ۲۰/۳۷)

(ج)''یٰداودُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خلیفتَہ فیْ الارضِ فاحکُم بینَ النَّاسِ بالحقِ'' ۔الخ اے داود! بے شک ہم نے تجھ کو زمین پر ایک نائب مقرر کیا ہے۔ اس لئے لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کیا کر۔ اور خواہشات کی پیروی نہ کر ورنہ وہ تجھے خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ اور جو کوئی خدا کی راہ سے بھٹکے تو اس کا انجام برا ہوتا ہے۔ کیونکہ قیامت کے حساب وکتاب کو اس نے بھلا دیا ہے۔

(قرآن مجید ۳۸/۲۶)۔

حضرت سلمان کے سلسلے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ''اور سلیمان داود کا وارث بنا''۔ [۳] اگرچہ بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوا تھا، لیکن اس قرآنی تذکرے کا منشا یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ بیٹا بطور حق کے بادشاہ بنا ہو، بلکہ یہ محض خدا کی عنایت تھی کہ باپ کی جگہ بیٹے کو بھی حکومت ملی ورنہ اقتدار کا اصلی سرچشمہ خدا ہی کی مشیت ہے۔ وہ جسے چاہے نوازے۔

حکمرانی کے کل پرزوں کی حرکت کا سب سے دلچسپ منظر قرآن مجید میں ملکہ سباء کے تذکرے میں ملتا ہے، چنانچہ:۔

قالت یا ایّھا الملو افتُونِی فی اَمْرِی مَا کُنتُ قاطِعَتہ امراً حتی تَشھَدُوْن ۔الایہ اس (ملکہ) نے کہا اے سردار نے مجھے میرے اس معاملے میں مشورہ دو میں تمہاری موجودگی کے بغیر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی۔ انھوں نے کہا۔ ہم بڑے طاقتور اور بہادر لوگ ہیں۔ حکم دینا تیرا کام ہے۔ اس لئے تو سوچ کر فیصلہ کرے اس (ملکہ) نے کہا جب کبھی بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل بنا دیتے ہیں ۔ اور وہ ایسا ہی کریں گے۔ البتہ میں ان

(حضرت سلیمان کے ملک والوں) کو ایک تحفہ بھیجوں گی، اور دیکھوں گی کہ سفیر کیا واپس لاتے ہیں؟ چنانچہ جب سفیر سلیمان کے پاس پہنچے، تو انھوں نے فرمایا کہ تم مجھے مال کے ذریعے سے کچھ مدد دینی چاہتے ہو، جب کہ وہ چیز جو خدا نے مجھے دے رکھی ہے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے، جو ان نے تمھیں دی ہے؟ تمھیں تو اپنے تحفے ہی پر ناز ہے۔ ان کے پاس واپس جاو۔ ہم بے شک ان کے پاس ایسی فوجیں لے کر آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہیں کرسکیں گے، اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے۔ اور وہ پست ہو جائیں گے۔'' (قرآن مجید ۳۲ تا ۲۷/۳۷)۔

ہر زمانے میں اس امر کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی ہے، کہ ملت کی رہنمائی کے لئے ایک قوانین کا مجموعہ بھی موجود ہو۔ قرآن مجید میں اکثر اس کا ذکر آیا ہے، کہ پیغمبروں کو کتابیں یا صحیفے دیئے گئے۔ کتاب کے لفظی معنی حکم دینے کے بھی آتے ہیں۔ اور صحیفے سے مراد دستور العمل ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے سلسلے میں خاص طور سے اس کا ذکر ہوا ہے کہ جونہی وہ فرعون کی سرزمین سے نکل کر باہر آگئے، تو خدا نے حضرت موسیٰؑ کو احکام لکھی ہوئی تختیاں (الواح) عطا کیں، جن کی تعمیل بنی اسرائیل پر فرض قرار دی گئی۔

ظالم بادشاہوں کے ظالمانہ اور نامناسب افعال کی قرآن مجید میں بار ہا برائی کی گئی ہے، (دیکھئے قرآن مجید ۱۸/۸۰، ۲۸/۴ وغیرہ)۔ ایک چیز جو قرآنی تذکروں میں خاص طور سے قابل ذکر معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مملکت سے زیادہ حکمران مملکت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مملکت کا ذکر محض ضمناً آیا ہے، اور سیاسی وحدت میں بادشاہ کا ذکر ہی سب سے نمایاں ہے۔ کیونکہ قدیم زمانوں میں یہی صورت حال تھی۔

اسلامی مملکت:

اب تک ہم نے اپنی تحقیقات کو زمانہ قدیم کی مملکت تک محدود رکھا تھا۔ اس

کے معنے یہ نہیں، کہ آنحضرت صلعم نے جو اسلامی مملکت قائم کی تھی۔ اس کے لئے کوئی خصوصی احکام قرآن مجید میں نہیں دئے گئے۔ ہمارے تذکرے کا منشا یہ تھا کہ چونکہ انبیائے سلف کی سنت بھی مسلمانوں کے لئے واجب التعمیل قرار دی گئی ہے۔ اس لئے ان کے زمانے کے احکام کا مستند تذکرہ نہ صرف اسلامی مملکتی تصور کے لئے ایک پس منظر کا کام دیتا ہے، بلکہ واقعتاً وہ احکام، اسلامی قانون سیاسی و انتظامی کا جزء بن جاتے ہیں۔ وہ احکام جو قرآن مجید میں نبی کریم صلعم کو خاص طور پر دئے گئے ہیں، ان کا اب موضوع وار تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی یہ چیز ہے کہ اقتدار اعلی کے ربانی ماخذ کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اور قیامت کے حساب وکتاب پر بار بار زور دیا گیا ہے تاکہ بادشاہ میں کسی دینوی ذمہ داری کے نہ ہونے کے باعث استبداد نہ پیدا ہوجائے۔ اگرچہ قرآن مجید میں علاقے یا زمین کا ذکر بعض وقت حکمرانی کے ساتھ آیا ہے لیکن وہ بڑی حد تک ضمنی ہے۔ بنیادی نہیں مثلاً:۔

(ا) قُلِ اللّٰھمّ مٰلِکَ اْلمُلْکَ تُؤتِي الملکَ

من تشآءُ و تنزِع الْملکَ مِمّن تشآءُ : الآیہ

کہہ اے خدا، ملک کے مالک! تو ہی جس کو چاہتا ہے، ملک دیتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے ملک واپس لے لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے تو ہی ذلیل کرتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، تو ہر پر قدرت رکھتا ہے۔ (قران مجید ۳/۲۶)

(ب) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بعضٍ

الا یہ وہی ہے، جس نے تم کو زمین میں نائب مقرر کیا، اور تم میں سے: چند کو دوسروں پر رتبے میں فوقیت دی تاکہ تمھیں اس چیز کے زریعے سے آزمائے، جو اس نے تمھیں دی ہے۔ (ایضا ۶/۱۶۶)

وَلَقَدْ مَكّنّا كُمْ فِی الارضِ وَجعلنَا لکُم فیھَا معایِش قلیلًا مَاتَشکرُوُن۔

ہم نے تم کو زمین میں اقتدار عطا کیا اور تمھارے لئے وہاں روزی مہیا کی تاکہ تم کچھ تو شکر گذار بنو۔

جامعہ روما کے پروفیسر نالینو کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں معلوم ہوتی کہ اسلامی حکمران کی تخت نشینی کے وقت جو بیعت لی جاتی ہے، وہ ایک طرح سے معاہدہ معاشری کہلا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

''کسی شخص کو خلافت کا رتبہ عطا کرنا فقہا کے نزدیک ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کا ایک فریق وہ شخص ہوتا ہے، جو اس عہدے کو قبول کرے اور دوسرا فریق جماعت اسلامی ہوتی ہے یہ معاہدہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا، جب تک کہ بیعت یعنی اظہار وفاداری امت کے اصحاب حل وعقد کی طرف سے نہ عمل میں آ جائے۔[۴]

لہٰذا بیعت کے معنے خود ایک معاہدے کے ہوتے ہیں، اور اصطلاحاً اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وفاداری اور اطاعت کی ایک طرف سے پیشکش کی جائے اور دوسرے فریق کی طرف سے اسے قبول کیا جائے۔(دیکھئے قران مجید ۱۰/۴۸، ۱۲/ ۶۰) دوسرے الفاظ میں حکمران کا اقتدار چاہئے مشیت خاصہ سے پیدا نہ ہوتا ہو، لیکن اسی پر مبنی ہوتا ہے اور اسی کا محتاج ضرور رہتا ہے اور فقہا کا تصور یہ ہے کہ مشیت عامہ ہی سے مشیت الٰہی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔**یداللہ علی الجماعہ**.

رسول کریم صلعم کے متعلق مسلمانوں میں یہ چیز جزءعقیدہ ہے، کہ پیغمبر معصوم ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ خلفاء پیغمبروں کے سیاسی جانشین سمجھے گئے لیکن معصومیت کا یہ اعزاز ان کے لئے کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دیگر قوموں میں'' بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا'' کا جو سیاسی نظریہ یا کلیہ پایا جاتا ہے، وہ مسلمانوں میں کبھی جگہ نہ پا سکا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کو اسی پر ناز ہے، کہ نہ صرف عام حکمران بلکہ خود

پیغمبر صلعم بھی حقوق العباد کے معاملے میں انھیں عام قوانین کے پابند ہیں جن کے عام مسلمان اور یہ کہ رسول اللہ صلعم نے بھی ضرورت پر خود اپنی ذات کے خلاف مقدمات سنے اور منصفانہ فیصلہ کیا۔[۵]۔ پیغمبروں کی معصومیت کا منشاء اسلامی علم کلام میں صرف یہ کیا جاتا ہے کہ وحی کی تبلیغ اور خدا کے احکام پہنچانے میں ان سے کوئی غلطی یا سہو سرزد نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ دیگر معاملات میں پیغمبر کی حیثیت بھی ایک انسان ہی کی ہوتی ہے۔ اور احادیث میں متعدد مرتبہ بیان ہوا ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ ''دنیاوی معاملات میں میں بھی تمھاری ہی طرح ایک انسان ہوں۔ سیاسی حیثیت سے رسول کریم صلعم جماعت اسلامی کے ایک فرد تھے، اور ان قوانین کے جن کو آپ نافذ کرتے تھے، خود بھی پوری طرح پابند تھے۔ مثال کے طور پر مال غنیمت میں آپ کا بھی اتنا ہی حصہ ہوتا جتنا فوج کے کسی عام سپاہی کا۔

غرض جملہ مخلوقات کی طرح کرہ ارض اور انسانی بستی کا بھی اصل مالک اور بادشاہ خدا ہی کی ذات ہے، اور وہی صلاحیتوں کو دیکھ کر کسی انسان کو اپنی نیابت سے سرفراز کرتا ہے۔ اور پھر دیکھتا ہے، کہ وہ عمل کیسا کرتا ہے۔

وَ ان الارضِ یَرثُھا عِبادی الصلحون، اِنّی جاعلٌ فی الارضِ خلیفة ینظر کیف تعملون ان الارض لله یورثھا من یشاء من عبادہ وغیرہ) خدا کا خلیفۂ برحق تو نبی ہوتا ہے جس کا براہ راست وحی سے تقرر ہوتا ہے، اور وحی ہی سے اس کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بھی سرور کائنات صلعم اپنی اطاعت اور پیروی کی بیعت لیتے رہے۔ نبی کے دنیا سے پردہ فرمانے پر احکام شریعت سے ناواقفوں کو واقف کرانے کی حد تک مشہور اسلامی مقولہ بلکہ شاید حدیث شریف ہے[۶] کہ **العلماء ورثة الانبیاء** لیکن سلطنت رانی اور سیاست مدن کے لئے ماوردی، ابن خلدون وغیرہ کے الفاظ میں ''اصحاب حل وعقد'' کسی کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ انتخاب بمصداق حدیث شریف **یدالله علی الجماعته** منشاء ربانی کا اظہار اور

باعث خیر و برکت ہوتا ہے۔ اور یہی اصحاب حل وعقد انتخاب وبیعت کے بعد بھ
حکمران کی حکمرانی میں مرجع کا کام دیتے ہیں، اور ضرورت ہوتو اسے معزول بھی کر سکتے
ہیں۔[۷] حکمران کے حق اجتہاد کے حدود، مصالح ملکی اور نظم ونسق میں شوری
موقف واصحاب حل وعقد کی دستوری حیثیت وغیرہ پر تفصیل سے بحث یہاں ممکن
ہوگی، البتہ اس سوال کا جواب شاید ضروری ہے، کہ اصل دنیوی اقتدار کے استعمال
حق کس کو حاصل ہوتا ہے، اس کا جواب حضرت امام اعظم کے الفاظ میں :۔

ان نواحی دارالاسلام تحت ید امام المسلمین ویدہ ید جماع
المسلمین، (مبسوط سرخسی ج۔اص۹۳)

اسلامی سرزمین کے جملہ حصے اسلامی بادشاہ کے اقتدار میں ہوتے ہیں، ا
اس کا اقتدار مسلمان کی جماعت ہی کا اقتدار ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ کے دونوں شاگردوں امام ابویوسف اور امام محمد شیبانی نے م
وضاحت سے کہا ہے، کہ کسی ملک کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا امتیاز یہ ہے
وہاں غلبہ اور محافظ قوت کس قوم کو حاصل ہے تعداد سے بحث نہیں۔

''لھما الدار انما تنسب الی اھلھا لثبوت یدھم القاھرۃ علیھ
قیام ولایتھم الحافظۃ فیھا (محیط رضی الدین سرخسی مخطوطہ استانبول و
نمبر ۵۔۶ ب) اور حنفی علماء متفق ہیں، کہ اسلامی مملکت کا انتظام امام، پوری امت مس
کے نائب کے طور پر کرتا ہے، مناچہ شارح شیبانیؒ کے الفاظ میں ''الامام بمنز
جماعۃ من المسلمین فی استیفاء ھذا الحق۔'' (مبسوط سرخسی ج ۹ ص ۴
یعنی اس حق کے نفاذ میں امام کی حیثیت امت مسلمہ کے قائم مقام کی ہوتی ہے۔

بہر حال یہ اسلامی تصور اقتدار اعلی ہے، کہ مقتدر اعلیٰ خداوند خلاق کی ذ
کبریائی ہے اور حکمرانی شریعت کو حاصل ہوتی ہے، اور خلیفۃ اللہ فی الارض یا شری
کے نفاذ کے افسر کا انتخاب بھی خدا ہی کرتا ہے، اور اس بارے میں خدا کی مشیئ

اظہار ید اللہ علی الجماعۃ'' اور لا یجتمع امتی علی الضلالۃ۔'' وغیرہ احادیث شریفہ کے مصداق اور عہد خلافت راشدہ کے نظائر کے مطابق اصحاب حل و عقد کی بیعت کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

دین و دنیا کا ملاپ:

قدیم زمانوں میں جب انسانی تمدن نے زیادہ ترقی نہ کی تھی۔اور تقسیم کار کی اتنی زیادہ ضرورت پیش نہ آئی تھی تو کسی ملک میں مرکزی حکومت کے اختیارات یا تو عدل گستری کے متعلق ہوتے تھے، (جس میں دشمن سے جنگ بھی شامل ہے۔اور فقہ کی کتابوں میں باب الجہاد کا ذکر حدود یعنی سزاؤں کے سلسلے ہی میں ملتا ہے) یا قومی معبود کی پرستش۔عبادت کے متعلق دیگر سلطنتی نظم ونسق کے مسائل اٹھتے ہی نہ تھے، بلکہ وہ عوام کی انفرادی معاملات سمجھے جاتے تھے۔اور عبادت ہی نہیں عدل گستری اور جنگ بھی مذہبی مراسم کی تابع تھی۔تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کشوری اور مذہبی فرائض میں دوری پیدا ہوتی جاتی تھی، چنانچہ رومیوں نے لیس (JUS کا دنیوی قانون) کو ہمہ گیر فاس (FAS) یا مذہبی قانون) سے ایک الگ چیز کے طور پر ایجاد کیا۔ یہودیوں نے ''قالو النبی لھم البعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ ۔ (قرآن ۲/۲۴۶) اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر جس کے ساتھ ہم خدا کی راہ میں جنگ کرسکیں۔کہا، اور اس طرح نبوت و بادشاہت یا مذہب و سیاست کو جدا کردیا۔ حضرت عیسی کی طرف بھی یہ قول انجیل میں منسوب ملتا ہے، کہ قیصر کی چیزیں قیصر کو دے دو، اور کلیسا کی کلیسا کو۔'' بدھ متیوں اور ہندوؤں کے ہاں بھی ترک دنیا انسانیت کا کمال قرار پایا۔

غرض قدیم اہل مذہب نے دنیائے ناپائیدار کو دل لگانے کے قابل چیز نہ سمجھا لیکن اس میں دو بنیادی مسائل نظر انداز ہوکر خامی پیدا ہوگئی، ایک تو گنتی کے چند

فرشتہ صفت انسانوں کے سوا باقی جو لاکھوں کروڑوں عامۃ الناس تھے، ان کے معاملات مادیت پسندانہ ہو گئے اور دوسرے سیاست کی اخلاقی بنیاد نہ رہی، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ سابقہ تمام مذاہب اکائیوں یا دہائیوں میں ختم ہو جانے والے فرشتہ صفت انسانوں کے لئے ہوتے تھے، اور اسلام ناز کرسکتا ہے، کہ وہ امیوں اور اوسط درجے کے انسانوں کے لئے ایک قابل عمل دستور لایا۔ یہ ظاہر ہے کے دنیا میں ایسوں ہی کی بہت بڑی اکثریت ہوتی ہے۔ انسان نما فرشتے اور انسان نما شیطان دونوں کی تعداد ہمیشہ بہت محدود ہی ہوتی ہے۔

مذہب یا دین کے اگر وسیع معنے لئے جائیں تو اس میں پورا تمدن انسانی اور دنیا و آخرت کے جملہ مسائل شریک ہوجاتے ہیں۔ اور اگر محدود معنوں میں اس اصطلاح کی استعمال کیا جانے تو وسیع معنے لینے والوں سے اختلاف محض ایک لفظی بحث رہ جاتا ہے۔ جس طرح فنی اور علمی ضرورتوں سے اب خود تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام ایک چیز نہیں سمجھے جاسکتے، اسی طرح انسانی تمدن کی تمام شاخوں کو ایک ہی علم قرار دینا بدرجہ اولی کم سہولت بخش ہوگا۔ اسی لئے میں مذہب اور سیاست کو یہاں دو بالکل الگ چیزیں لیتا ہوں۔ اس معنے کے لحاظ سے مذہب خدا اور بندے کے تعلقات کا نام ہے، اور سیاست بندے اور بندے کے معاملات کا، ان دونوں کو ایک کہنے والا گویا ہاتھ اور پاؤں کو ایک کہتا ہے، لیکن جس طرح ایک زندہ اور تندرست انسان میں ہاتھ اور پاؤں دونوں ہی ایک مشترکہ اور مرکزی قوت مثلاً عقل یا ارادے کے تابع ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح دین اسلام نے مذہب اور سیاست کو ایک مشترکہ دستور العمل کے تابع کر دیا۔ جو قرآن یا ربانی کلام تھا۔ اور دونوں ہی کی رہنمائی کے لئے احکام کا ماخذ ایک ہی قرار دے کر سیاست میں اخلاقی اساس اور اخلاق میں حقیقت پسندی باقی رہی، کوئی شخص ہاتھوں کے بل تھوڑی دور ضرور چل سکتا ہے، اور پاؤں سے برا بھلا کچھ لکھ بھی ضرور سکتا ہے۔ اسی طرح عبادت کو سیاست اور سیاست کو عبادت بنا کر انسان چند روز

گزار ضرور سکتا ہے۔ لیکن یہ غیر فطری عمل نہ سہولت بخش ہوگا اور نہ مفید۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک بزرگ سیرت نگار نبوت کے الفاظ میں ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ نے صرف آسمانی بادشاہت کی خوشخبری نہیں سنائی بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی بے خوف وخطر کی جاسکے۔ اور خدا کی بادشاہی دنیا میں قائم ہو۔''

وَعَدَ اللّٰہُ الّذین آمنوا منکُم و عملوا الصلحٰتِ لیستخلفنهم فی الارض الآیه

خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا (جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے) اور ان کے لئے ان کے اس دین کو جو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے، جما دے گا۔''

(قرآن ۲۴/۵۵)

قرآن نے سب سے اچھی دعا انسانوں کے لئے یہ بتائی ہے:۔

ربَّنَا اٰتِنَا فی الدُنیا حَسَنَةً وَ فی الاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَ قِنَا عَذابَ النَارِ۔ اے ہمارے رب ہم کو انیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور ہم کو (دوزخ کی) آگ کے عذاب سے بچا۔'' (قرآن ۲/۲۰۱)

اور ایک جگہ فرمایا:۔

لِلّذینَ احسنوُا فی هذه الدنیا حسنةً ولدار الآخرة خیرٌ ولَنعْمَ دار المتقین '' اور جنھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے اس دنیا میں بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے!

(قرآن ۱۶/۳۰)

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے:۔

فاٰتٰھم اللہُ ثوابَ الدُّنیا و حُسنِ ثوابَ الآخرة واللّٰہُ یحبُّ المحسنینَ۔ تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا، اور اللہ نیکی کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ (قرآن ۳/۱۴۸)

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، ان کو دونوں جہاں کی نعمتیں بخشیں:۔

وَالذین ھَاجرُو انی اللہ مِنْ بَعْدِ ماظلموا الآیہ اور جنھوں نے (اللہ کے لئے) ستائے جانے کے بعد گھر چھوڑا، اللہ ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دے گا، اور بیشک آخرت کا اجر سب سے بڑا ہے۔ (قرآن ۱۶/۴۱)

(اور اولیاء و اتقیاء یعنی فرشتہ صفت مسلمانوں کو ترک دنیا کی ہدایت نہ کی، بلکہ دنیا داری اور دین داری دونوں کے مِلاپ کا حکم دیا:۔

الّذینَ ان مکنّا ھُمْ فی الارضِ اقامو الصّلوٰة و آتو الزّکوة الآیہ، وہ ایسے لوگ ہیں، کہ اگر ہم ان کو زمین میں جمادیں تو وہ نماز کھڑی کریں اور زکوۃ دیں اور اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔ (قرآن ۲۲/۴۱)

ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا، کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیئے۔ اور یہ اشارہ بھی کہ دین و دنیا کا امتزاج یا ملاپ ہی کو انسان بناتا ہے اور ''احسن تقویم'' کا مظاہرہ ہوسکتا ہے ورنہ وہ یا تو فرشتہ ہو جائے گا، یا شیطان اور ان دونوں اصناف سے جدا ایک خاص مخلوق یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

دنیا دار اگر چند بنیادی دینی احکام کی پابندی کریں اور دین دار بقدر ضرورت دنیا سے استفادہ کرتے رہیں تو خود انسانوں میں بھی ذوقی و اخلاقی بے اعتدالی کم ہو

جائے گی ورنہ یہی بے اعتدالی اختلال اور خونریز کشمکش کا باعث بنتی رہی ہے۔

ایسی آیتیں قرآن مجید میں بکثرت ملتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے، کہ خدا نے اپنی ہر مخلوق انسان کی خدمت یا استفادے کے لئے پیدا کی ہے اور انسان اپنے خالق کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے مگر اس کی تفصیل یہاں طول بحث سمجھی جائے گی۔

بیعت:

حکمران کی اطاعت کو جیسی کچھ اہمیت حاصل ہے، ظاہر ہے قرآن مجید میں بھی اس پر کچھ کم زور نہیں دیا گیا ہے، مثلاً:۔

(ا) **یاایھا الذین آمنوا اطیعو اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم** الایہ اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم مین سے افسران حکومت ہوں ، اگ تم میں کسی معاملے میں آپس میں جھگڑا ہو تو اسے اللہ اور رسول سے رجوع کرو، اگر تمھیں خدا اور یوم آخرت پر سچا ایمان ہو یہی بہتر اور مآل کار اچھا طریقہ ہے۔ (قرآن مجید ۴/۵۹)

(ب) **اذاجآء ھم امر من الا من اوالخوف اذاعوا بہ** الایہ اگر امن یا خوف کی ان کو کوئی خبر ملتی ہے، تو اسے مشہور کر دیتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس کی اطلاع رسول کو اور اپنے افسروں کو دیتے تو سمجھ دار لوگ اس کو سمجھ جاتے۔

(قرآن مجید ۴/۸۳)

یہ تو افسروں کی اطاعت کا ذکر تھا۔ جناب رسالت مآب صلعم کی شخصی اطاعت پر تو اس سے بھی زیادہ مواقع پر زور دیا گیا ہے کہیں صرف حکم ہے، تو کہیں اس کے فوائد بتا کر ترغیب دی گئی ہے، رسول اللہ کی اطاعت اور پیروی کے ان احکام کا یہ ناگزیر نتیجہ تھا، کہ بعد کے زمانے میں آپ کے ہر قول اور ہر فعل کا تذکرہ محفوظ کرنے کی اتنی عظیم الشان کوششیں اہل علم کی جانب سے عمل میں لائی گئیں۔ ایسی بعض آیات

حسب ذیل ہیں:۔

(ا) **ماأتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا** ۔ جو کچھ رسول تمھیں دے اسے لے لو، اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔ (قرآن مجید ۵۹/۷)

(ب) **لَقَد کَانَ لکُم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ** بیشک اللہ کے رسول میں تمھارے لئے ایک اسوہ حسنہ پایا جاتا ہے۔ (قرآن مجید ۲۱/۳۳)

(ج) **یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون** الا یہ اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور جب وہ کچھ کہے تو سن کر روگردانی نہ کرو...... اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں جھگڑو نہیں ، تاکہ تم کمزور نہ پڑجاو، اور تمھاری ہوا نہ اکھڑ جائے،[۸] اس کے برخلاف صبر سے کام لو، اللہ صبر سے کام لینے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ (قرآن مجید ۲۰،۴۶/۸)

(د) **وما ینطق عنِ الھویٰ اِنْ ھُو اَلّا وحیٌ یوحیٰ** وہ (یعنی رسول خدا) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا ، بلکہ وہ وحی ہی ہوتی ہے، (قرآن مجید ۵۳/۳) آرنلڈ نے اپنی کتاب خلافت میں بالکل ٹھیک رائے ظاہر کی ہے، کہ جب اس طرح رعیت کے فریضہ اطاعت پر زور دیا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی حکمران کے لازمی فرائض کا اتنا ذکر نہیں ہوا تو اس سے اسلامی حکمران جابر اور استبداد پسند نہیں بن گیا، کیونکہ حشر ونشر اور حساب وکتاب کا عقیدہ نیز حکمران کا بھی قانون اسلامی کے ماتحت ہونا اس پر گرفت رکھنے کے لئے کافی ثابت ہوئے، اس کے یہ معنے نہیں، کہ حکمران کے فرائض پر قرآن مجید نے زور نہ دیا ہو:۔

(ا) **فلذ لِکَ فادع واستقم کما امرت ولا تتبع اھواء ھم** الا یہ اس کے لئے بلا اور (اے محمد) استقامت سے رہ جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے، اور

ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر، بلکہ کہہ:۔

میں ایمان لاتا ہوں ہر اس کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے، کہ تم میں انصاف کرتا رہوں۔ اللہ ہمارا اور تمھارا آقا ہے، ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمھارے کام، ہم میں اور تم میں کوئی حجت نہیں، اللہ ہمیں یکجا کرے گا، اور ہمیں اسی کی طرف جانا ہے۔ (قرآن مجید ۴۲/۱۵)

(ب) فلنسئلنَّ الذین اُرسِلَ الیھم ولنسئلن المرسلین تب ہم یقیناً ان لوگوں سے دریافت کریں گے، جن کے پاس ہمارا پیغمبر بھیجا گیا تھا اور ہم پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔ (قرآن مجید ۷/۶)

متعدد آیتوں میں اس پر زور دیا گیا ہے۔ کہ اجتماعی اور حکومتی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دی جائے، مثلاً قرآن مجید (۲۷ تا ۲۸/۸ تا و ۲۴/۹):۔

(ا) یا ایھا الذین آمنوا لا تخونوا اللہ والرسول الایہ، اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو، اور نہ جان بوجھ کر اپنی باہمی امانتوں میں خیانت کرو۔

(ب) وَاعلموا انما اموالکُمْ و اَوْلادُکم فتنہٌ. الایہ

یہ جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمائش ہے، اور خدا ہی کے پاس اجر عظیم پایا جاتا ہے۔

مذکورۂ بالا آیتوں سے یہ واضح ہوتا ہے، کہ ذاتی مفاد کے لئے یا بیوی بچوں کی خاطر بھی ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے، جو نا مناسب ہو، اور عالم آخرت کے حساب وکتاب کے لئے ہمیں اپنے ہر فعل میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

ضمناً اس چیز کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے، کہ ''حب ملی'' اسلام میں ایک نیم مذہبی، نیم سیاسی وحدت کے تصور پر مبنی ہے، جغرافی یا لسانی ولونی یا نسلی وحدت سے اسے کوئی سروکار نہیں، چنانچہ:۔

(ا) یـاایھـاالـنـاس انـا خـلـقـنـا کم من ذکر وانثی وجعلنا کم شعوباوقبائل لتعارفوا. الآیہ، (اے انسانو ہم نے تم کو مرد اور عورتیں بنایا، اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا، تا کہ تم پہچانے جاسکو، لیکن اصل میں تم میں سے سب سے زیادہ بزرگ خدا کے پاس وہی ہوتا ہے، جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ علم اور خبر خدا ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ (قرآن مجید ۴۹/۱۳)

(ب) انـمـا الـمـو مـنون اخوۃ ۔ ایمان والے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ (ایضا ۴۹/۱۰)

(ج) واعتـصـمـو ابـحـبـل اللہِ جمیعاً وّلاَ تفرّقوا واذکروا نعمت اللہِ علیکم اِذْ کنتُم اعداء فالّف بین قلو بکم . الایہ

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ نہ کرو، اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو تم آپس میں دشمن تھے، اور (ایمان لانے کے باعث) اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی، اور اس کی عنایت سے تم بھائی بھائی بن گئے، تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اور اسی نے تم کو بچایا۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں تم سے بیان کرتا ہے، تا کہ تم ہدایت پاسکو، اور تم سے ایک ایسی قوم پیدا ہو جو بھلائی کی طرف بلائے، اچھی بات کا حکم دے، اور بری بات سے روکے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ (قرآن مجید ۳/۱۰۲)۔

یہ بیان کرنے کی شاید ہی کچھ ضرورت ہو کہ ایمان اور عمل صالح کی فوقیت کے سوا اسلام حسب ونسب کی کسی برتری کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا، انبیاء کی اولاد تک ''عمل غیر صالح[۹]''، کے باعث عذاب میں گرفتار ہوئی۔

عدل گستری:

یہ حکمران کا اولین فریضہ ہے کہ اسے ناطرفدار ہونا چاہیے، اور انصاف کے

ساتھ حسب موقع و ضرورت رحم بھی کرنا چاہیئے، (دیکھئے قرآن مجید ۱۶/۹۰، ۵۸، ۴/۱۳۵، ۵/۸، ۱۶/۴۰)۔

غیر مسلم ذی رعایا کو عدالتی خود مختاری دینے کا قرآن مجید میں حکم ہے، جہاں ان کے ساتھ ان کے شخصی قوانین کے مطابق فیصلے انجام پائیں گے اگر غیر مسلم رعایا اسلامی عدالت میں اپنی مرضی سے مقدمہ یا مرافعہ پیش کرے تو اس کے ساتھ بھی انصاف کیا جانا چاہیئے (قرآن مجید ۴۲ تا ۵/۵۰) اس بارے میں مزید تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے،[۱۰] البتہ اتنا اور اشارہ کیا جاسکتا ہے، کہ قیامت کی جزائے اعمال، حساب و کتاب، چشم دید گواہ، تحریری شہادت، کراما کاتبین کی ڈائری وغیرہ کی جو تفصیل قرآن میں آئی ہے وہ عہد نبوی کے مروجہ امور ہوں گے، جن کے ذریعے سے عالم آخرت کا خاکہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شورائیت:

قرآن مجید میں حکم ہے کہ حکمران اپنے فیصلے مشورہ لے کر کیا کرے۔ چنانچہ:

(ا) **وشاورهم فی الامر فاذاعزمت فتوكل على الله** الایہ اور ان سے معاملات میں مشورہ کر پھر جب تو عزم کرے تو خدا پر توکل کر، بیشک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (قرآن مجید ۳/۱۵۹)

(ب) **فما اوتيتم من شئی فمتاع الحياة الدنيا و ما عند الله خير وابقى** الایہ جو کچھ تمھیں دیا گیا وہ دنیاوی زندگی کا ایک حق تمتع ہے، اور بس، ورنہ خدا کے پاس جو چیز ہے، وہ بہتر اور زیادہ پائدار ہے۔ یہ ان لوگوں کو ملے گی، جو اپنے رب پر ایمان لاتے، اور اس پر توکل کرتے ہیں، اور جن کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں، اور جو اس چیز کو خرچ (خیرات) کرتے ہیں، جو ہم نے کو عطا کی۔ (ایضاً ۳۶ تا ۴۲/۳۸)۔

(ج) طاعة وقول معروف فاذ اعزم الامر فلو صدقوا الله لكان خیرا لھم (مشیروں وغیرہ کے لئے فیصلے کے بعد) اطاعت اور (فیصلے کے لئے) قول معروف ہونا چاہئے اور پھر جب کسی کام کا عزم کرلیا جائے، تو اگر وہ لوگ خدا سے اپنے کئے ہوئے وعدے کو پورا کریں تو انھیں کے لئے اچھا ہے۔ (قرآن مجید ۲۱/۴۷)

غرض اگر مشورہ لینے کی ایک طرف پابندی عاید کی گئی ہے، تو دوسری طرف مشورہ کے بعد جو بھی چیز قرار پاجائے اس کی تعمیل کرنا بلا لحاظ اس کے کہ وہ اپنی رائے اور مشورے کے مطابق تھی، یا مخالف، ضروری قرار دیا گیا ہے، ساتھ ہی اس کا بھی ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ آخری ذمہ داری چونکہ حکمران پر ہوتی ہے، اس لئے اس کو مشورے کے متعلق حق تنسیخ دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید ۱۱۷/۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

قانون سازی:

قرآن مجید نے نبی کریم صلعم کے ہر قول وفعل کو اسوۃ حسنہ اور قانون کی حیثیت دی ہے، (دیکھئے قرآن مجید ۳ تا ۵۳/۴، و ۵۹/۷ وغیرہ) اس حکم کے باعث اسلامی فقہاء قانون سازوں کا کام آسان تر ہوگیا، کیونکہ ایک طرف تو جن چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں نہ تھا، ان کے لئے حدیث نبوی میں کافی مواد مل گیا، اور دوسری طرف یہ بھی دیکھا گیا، کہ خود رسول کریم صلعم نے نہ صرف یہ کہ قیاس اور استنباط سے کام لیا، بلکہ اس کی صراحت کے ساتھ اجازت بھی دی تھی، جیسا کہ معاذ بن جبل گورنر یمن کے تقررنامے وغیرہ میں مذکور ہے۔ اگر چہ قرآن اور حدیث کی قیاس کے ذریعے سے تنسیخ نہیں ہوسکتی، لیکن قیاس اور تعبیر کی اجازت سے علماء وفقہاء کو انفرادی رائے سے کام لینے کی خاصی گنجائش مل گئی، حتیٰ کہ یہاں تک تسلیم لیا گیا، کہ مجتہد سے غلطی ہونے کے امکان کے باوجود اس کو اس کام سے نہیں روکا جاسکتا، چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے، کہ ''اجتہاد کرنے والا خطا بھی کرسکتا ہے، ثواب کو بھی پہنچ سکتا

ہے۔ اور صحیح فیصلے کی صورت میں اسے دو ثواب ملیں گے۔ اور خطا کی صورت میں ایک ثواب۔'' [۱۱] اس طرح اس کا بھی موقع نکل آیا، کہ ایک مجتہد کے بعد دوسرا مجتہد بھی اجتہاد کرے، اور کسی بہتر نتیجے پر پہنچنے کے باعث سابقہ مجتہد کا فیصلہ منسوخ قرار پائے۔ اور خود اجماع کے متعلق بھی فقہاء نے ایسی ہی سہولت تسلیم کی ہے۔ (دیکھو بخاری، باب اجماع) جب تک ان اجازتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا، اسلامی قانون میں زمانے کا ساتھ دینے کی گنجایش رہی، اور وہ ترقی کرتا رہا، اور جب سے قدیم فقہاء کے فیصلوں کے خلاف اجتہاد کا دروازہ چند لوگوں نے بند کر دیا، تو اس سے قانون اسلامی کو بیحد نقصان پہنچا، لیکن یہ مسئلہ یہاں دائرہ بحث سے خارج ہے۔

جہاں بانی کے قواعد:

قرآن مجید میں اندرونی اور بیرونی سیاست کے قواعد خاصی تفصیل سے ملتے ہیں، جن سے حالت امن وصلح وغیر جانبداری میں حکمراں کی رہنمائی مقصود تھی۔ رسول کریم صلعم نے خود ایک مملکت قائم کی، اور اس ملک میں جہاں ہمیشہ سے نراج سا چلا آرہا تھا، ایک مرکزیت اور ایک تنظیم پیدا، اور عربوں کو خانہ جنگیوں کے ذریعے اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے روک کر انھیں اپنے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی فاتح اور نو آباد کار قوم بنا دیا، اور ان کے ذہنوں سے احساس کمتری کو کلی طور پر دور کر کے ان میں وہ صحت اور جذبہ بھر دیا، جسے احساس برتری یا احساس خود شناسی کہا جاسکتا ہے، اور جو کسی ترقی پذیر قوم کے لئے اس قدر ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ولولہ دلانے والی چیز کو وہ اپنے مشن اور مقصد حیات باور کرنے لگے:۔

(۱) کنتم خیر امۃٍ اُخرجتْ لِلنّاسِ تاْمُرُون بالمعروفِ وتنھون عن المنکر، تم وہ بہترین قوم ہو، جو انسانوں کے لئے پیدا کی گئی کہ تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو، اور بری بات سے روکتے ہو۔ (قرآن مجید ۳/۱۱۰ نیز ۳/۱۹ و ۳/۸۵)

(ب) اُذِنَ لِلّذین یُقَاتِلُون بانهم ظلموا الآیہ، ان لوگوں کو جن سے لڑا جا رہا تھا (برابر کا جواب دینے کی) اجازت دے دی گئی کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا تھا، ۔۔۔۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں، تو وہ خدا کی عبادت کو قائم کر دیں، اور زکات دیں، اچھی بات کا حکم دیں، اور بری بات سے روک دیں۔ (قرآن مجید ۳۹ تا ۲۲/۴۱)

(ج) قاتلوھم حتٰی لاتکونَ فتنۃٌ و یکون الدین کلہ للہ، ان سے اس وقت تک لڑتے رہو، تا آنکہ فتنہ باقی نہ رہے اور خدا ہی کا دین چھا جائے۔

(ایضاً ۸/۳۹)

(د) وما اَرسَلنٰکَ الّا کافۃً لِلنّاسِ بشیراً وّنذیراً الآیہ (اے محمدؐ) ہم نے تجھے صرف اس لئے بھیجا ہے، کہ تمام لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنے، گو اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔ (قرآن مجید ۳۴/۲۸)

غالباً یہی وہ ایقان یا احساسِ فرض تھا، جس نے انھیں دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی غرض سے اپنی ہر چیز کو قربان کر دینے کے لئے آمادہ کر دیا۔ جہاد کا جو حکم مذکورہ بالا اور دیگر آیات قرآنی میں ملتا ہے، اس کا منشا یہ بالکل نہ تھا، کہ دوسروں کی جائداد لوٹی جائے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا، کہ وہ ایک مقدس ترین اور بڑا ایثار طلب فریضہ تھا، کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دوسروں کی رہنمائی کریں، اور ان کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ یہ بار جو محض خدا کی راہ میں تھا اسے انھوں نے ہنسی خوشی برداشت کیا۔

قانون بین الممالک کے خاصے تفصیلی احکام ہمیں قرآن مجید میں ملتے ہیں، جن پر مختلف مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔[۱۲] یہاں ان کی تفصیل کی گنجایش نہیں، صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ قرآن مجید میں انتقامی جنگ (۱۹۰ تا ۲/۹۵) معاہدات کی تعمیل (۹) مدافعت (۴/۷۵، ۳۹ تا ۲۲/۴۱) ہمدردانہ جنگ (۸/۷۲)،

فریق ثانی کی طرف سے معاہدہ شکنی کا خوف (۸/۵۸)، مذہبی رواداری (۲/۲۵۶، ۱۰/۹۹، ۱۰/۱۰۰) غیر مسلم رعایا سے برتاؤ (۹/۲۹)، قیدیوں سے برتاؤ (۴۷/۴ و ۸ تا ۹/۷۶)، پناہ جویوں کو امن دینا (۹/۶) مفتوحہ اراضی کا انتظام (۱۰/۷)، صلح کرنا (۸/۶۱) غیر جانبداری (۸۸ تا ۹۱/۴، ۱۱ تا ۵۹/۱۲، ۸ تا ۹/۶۰) وغیرہ وغیرہ امور کا اصولی ذکر ملتا ہے۔

قومی دولت:

لایکون دولة بین الاغنیآء منکم تاکہ وہ تم میں سے صرف مالداروں میں گردش نہ کرتی رہے،'' (قرآن مجید ۵۹/۷)

دولت عامہ کے متعلق یہ اسلامی اصول کا خلاصہ ہے، جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے اسلامی معاشیات کے پیش نظر یہ چیز رہی ہے کہ دولت کی ملک کے ہر طبقے میں تقسیم عمل میں آئے، اور وہ یکجا اکٹھی نہ ہو، بلکہ گردش کرتی رہے۔ معیار سے زائد دولت پر لازمی محصول (یعنی زکات وصیت کرنے کے اختیارات کی تحدید اور کسی شخص کی جائداد سے اس کی وفات پر اس کے قریبی رشتہ داروں کو لازمی طور سے حصہ ملنا، نیز غربا اور محتاجوں کے لئے حکومت کی آمدنی میں لازمی طور سے حصہ مقرر کیا جانا، یہ اور اس کے مماثل قاعدے قرآن مجید نے مقرر کئے ہیں، جن سے تقسیم وگردش دولت کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی انفرادی ملکیت پر کوئی قید عاید نہ ہونے سے ہر شخص کو اپنے قوائے فطری سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ترغیب ہوتی رہتی ہے، اور سود کی ممانعت اور قرضہ ہائے حسنہ کا انتظام جو قرآن مجید نے کیا ہے، [۱۳] وہ اسلامی قواعد معاشیات کو ایک مکمل نظام کی حیثیت دے دیتے ہیں، جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ اشتراکیت، بلکہ اس میں ان دونوں کی خوبیاں ہیں، اور ساتھ ہی دونوں کی برائیوں سے اس نظام کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اخلاق عامہ:

جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، میرے نزدیک مذہب اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے ممتاز عمل ہیں، ان کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ مذہب انسان اور خالق کے تعلق کا نام ہے، اور سیاست بندوں کے باہمی تعلقات کے لئے برسرکار ہوتی ہے، لیکن اگر ان دونوں میں کوئی رابطہ اور حلقہ اتصال نہ پیدا کیا جائے، تو انسانیت کو لامحدود نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اسلام نے اس کا ایک حل تلاش کرلیا، اور اس کو کامیابی سے عمل میں لاکر بھی دکھا دیا۔ اور وہ یہ تھا کہ اگر چہ مذہب اور سیاست دونوں کے دائرہ ہائے عمل بالکل جدا جدا ہیں، لیکن دونوں کے قواعد کا ماخذ داساس ایک ہی چیز کو قرار دیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کا مذہب اور مسلمانوں کی سیاست دونوں کی رہنمائی قرآن وحدیث، اصول انصاف واستحسان، اور ہم آہنگی ضمیر سے ہوتی ہے۔آخر الذکر کے سلسلہ میں ایک مشہور اسلامی اصول ہے کہ "استفت قلبک ولو افتاک المفتون" (مفتیوں کا فتویٰ بھی مل جائے تو عمل سے پہلے دل سے پوچھ لو)

سیاسی اصطلاحات:

اسلامی ادارہ ہائے سیاست نے اپنی بہت ہی اصطلاحیں قرآن مجید ہی سے لی ہیں، چنانچہ امت اور ملت سے سیاسی جماعت مراد ہوتی ہے۔خلیفہ اور امام اس جماعت کے سردار کا نام ہوتا ہے، (دیکھئے قرآن مجید ۴۲/۸ نیز سیرۃ ابن ہشام میں ص ۳۴۱ میں رسول کریم صلعم نے شہر مدینہ کے لئے ہجرت کے بعد جو دستور مملکت نافذ فرمایا تھا، اور جس کا پورا متن خوش قسمتی سے ہم تک پہنچ چکا ہے، اس کی دفعہ (۲) میں بھی انہی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے (لفظ خلیفہ کے لئے دیکھئے قرآن مجید ۳۸/۲۷ اور لفظ امام کے لئے ۲/۱۲۴)

جانشینی:

لفظ خلیفہ کے ساتھ ہم جانشینی کے خاردار مسئلے سے دو چار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس نے تیرہ سو سال سے مسلمانوں کو دو بڑی متخاصم جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جو اسلام رسول کریم صلعم اپنی امت کے لئے لائے تھے، اور جس کی آپ عمر بھر تبلیغ کرتے رہے، اس کے بنیادی اصولوں میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے، کہ آپ کی جانشینی کے لئے کیا اصول ہو، اور اس اصول کا ماننا اس سے بھی کم ایک جز عقیدۂ امر بن سکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس صورت حال پیدا ہوگئی، اور ہر دو فریقوں کے ہاں غلو رکھنے والے خیالات بھی پھیلتے رہے۔ حالیہ زمانے میں ایک حل جو اس کے لئے سونچا گیا ہے وہ سنجیدہ غور کا مستحق ہے، وہ یہ کہ سنی اور شیعہ دونوں اس امر پر متفق ہیں تاریخی واقعہ کی حیثیت سے جناب رسالت مآب صلعم کے بعد حضرت علی پہلے خلیفہ نہیں ہوئے۔ اسی طرح شیعہ اور سنی دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ روحانی امور میں حضرت علی جناب رسالت مآب صلعم کے خلیفہ بلافصل ہیں [۱۴]۔ چنانچہ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ وغیرہ اور خود نقشبندیوں کی ایک شاخ، غرض قریب قریب تمام ہی صوفی سلسلے اسی کو مانتے ہیں۔[۱۵] اب رہا یہ امر کہ حضرت علی کو سیاسی جانشینی کا بھی استحقاق تھا یا نہیں، یہ ایک خالص علمی مسئلہ رہ جاتا ہے، جس کو آئے دن کی روزمرہ سیاسی زندگی پر اب تیرہ سو سال بعد اثر انداز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

جس طرح ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کے آنے تک اول الذکر ہی کی شریعت باقی رہتی ہے، اسی پر قیاس کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک حکمران کی وفات کے باوجود اس کے جانشین کے انتخاب تک اول الذکر ہی کا اقتدار جاری رہتا ہے، اور اسی کے مقرر کردہ افسر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہنے کے پابند ہیں، چنانچہ:۔

کان ابو حنیفة یقول اذا مات الخلیفة فالقاضی علی قضائه والوالی علی ولایته حتی یغیر له القائم بعده ،(مناقب ابی حنیفه

للموفق ج اص ۸۷۔۸۸) امام ابو حنیفہ فرماتے تھے، اگر خلیفہ کا انتقال ہو جائے، تو قاضی اپنی قضاءت پر اور والی اپنی حکومت پر باقی رہتا ہے، جب تک خلیفہ کا جانشین اسے بدل نہ دے۔

اس مسئلہ کو قاتل حضرت عمر کے بعض بے گناہ ہم وطنوں کی شہادت اور ان شہداء کی عدم دار و گیر کے افسوسناک تاریخی واقعے کے باعث تھوڑی سی اہمیت تھی، اس لئے اس کا بھی ذکر کر دیا گیا۔

خاتمہ کلام:

ظاہر ہے کہ دشمن کے اعتراف سے بڑھ کر ناطرف دارانہ اور دقیع شہادت کوئی اور ہو نہیں سکتی۔ اس لئے مذکورہ بالا اصول اور نظریات پر عمل کے متعلق ہم اجنبیوں کے بیانات نقل کرتے ہیں۔

خلافت راشدہ کے آغاز پر مسلمانوں کے ہاتھوں حکومت الہیہ کی جس توسیع کا آغاز ہوا، اس کا اولین ہدف عیسائیوں کی بیزنطینی سلطنت بنی۔ اس جنگی کارروائی کو شروع ہو کر پندرہ سال بھی نہیں گزرے تھے کہ (حضرت عمر کے آخری زمانے یا حضرت عثمان کے ابتدائی زمانے میں) ایک نسطوری پادری نے جو تاثرات سپرد کاغذ کئے تھے وہ اتفاق سے محفوظ ہیں:۔

''یہ طائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے، وہ ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں۔ لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسر پیکار نہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں۔'' [١٦] اسی طرح کی ایک اور شہادت زمانہ حال کے ایک متعصب رومن کیتھولک پادری نے ''کلیسائی تاریخ و جغرافیہ کے قاموس'' میں یوں دی ہے۔

''مسلمان عربوں کو یعقوبی (جاکو بائٹ) عیسائیوں نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خودمختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کئے جائیں۔'' [۱۷]

یہ تو نور نبوت سے براہ راست منور ہونے والے عہد خلافت راشدہ کا ذکر تھا۔ اس کے صدیوں بعد کے دنیا دارانہ دور کے متعلق روسی مستشرق پروفیسر بارتولڈ لکھتا ہے:۔

''حروب صلیبیہ کے زمانے میں، ایک روسی مورخ کلیسا کے مطابق پادری اورعوام سب ہی کی یہ خواہش تھی کہ مسلمانوں کا جواِن کے کندھوں پر واپس آجائے بہ نسبت اس کے کہ لاطینیوں کا تسلط برقرار رہے۔ [۱۸]

اسی طرح یونانی ادبیات کا مشہور مورخ کردم باخرتسلیم کرتا ہے:۔

''قسطنطنیہ کے سقوط کے عین ماقبل زمانے میں بیزنطینیوں کو لاطینی اہل مغرب سے کچھ اتنی شدید نفرت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اسلام سے نفرت پر غالب آگئی تھی اور بہ کثرت تالیفوں میں نہ صرف یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ:۔ کیا مسلمانوں کے ہاتھوں میں پڑنا لاطینیوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بہتر نہ ہوگا، بلکہ اس سوال کا اثبات میں جواب دیا جاتا رہا۔'' [۱۹] ایک اور مولف کے دلچسپ مشاہدے پر اس ذکر کوختم کیا جاتا ہے، پروفیسر واکر نے قانون بین المما لک کی تاریخ لکھتے ہوئے یہ ملا خطہ پیش کیا ہے کہ متمدن اور مہذب سلطنتوں پر وحشیوں کا دھاوا بول دینا اور غالب آکر سلطنت وحکومت کے مالک بن جانا،

معاشرہ انسانی کی تاریخ کا ایک عادتی واقعہ ہے لیکن جرمنوں، تاتاریوں وغیرہ وحشیوں کے برخلاف عجیب بات یہ ہے کہ عرب کے بدوجب یک بیک اپنے صحرائی براعظم سے بیرون میں اُمنڈنے لگے (یعنی خلافت راشدہ میں) تو ان عربی

فتوحات کو عام تصور کے وحشی فتوحات میں کسی طرح شامل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان ''وحشی بدؤوں'' میں پہلے ہی دن سے ان کے مفتوحوں سے بھی بڑھ کر تہذیب اور اخلاق حسنہ نظر آتے ہیں۔[۲۰]

ہم اصول بھی دیکھ چکے اور اس کا اطلاق بھی لیکن یہ محض سرسری خاکہ ہے جو نقش اولین سے بڑھ کر نہیں۔ضرورت ہے کہ زیادہ قابل اہل علم اس موضوع پر توجہ فرمائیں۔وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین.

(معارف۔اعظم گڈھ، دسمبر ۱۹۴۱ء)

حواشی:

[۱]اس سے اوپر کی آیتوں میں (۱۸) پیغمبروں کے نام لئے گئے ہیں جن میں نوح، ابراہیم، اسمعیل، ہارون، موسی، اور عیسی علیہم السلام شامل ہیں، اور انھیں کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

[۲]قرآن مجید ۳۲ چنانچہ خود حضرت موسیٰؑ نے اپنے بھائی کے متعلق خدا سے دعا کی تھی کہ واشترکہ فی امری (اس کو میری امیری میں شریک بنا)

[۳]قرآن مجید ۱۶/۲۷

[۴]فرانسیسی رسالہ موسومہ ''خلاف کی عام نوعیت'' اور ''سلاطین عثمانیہ کے دعوے خلافت پر تبصرہ''۔مطبوعہ ردماص (۱۱)

[۵] سیرۃ ابن ہشام ص ۴۴۴، کامل ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۴۱ نیز سیرۃ شامی میں آٹھ دس ایسے واقعے درج ہیں

[۶] دیکھئے آگے باب ''نظام تعلیم''

[۷] بدائع الصنائع للکاسانی ج ۷ ص ۱۶

[۸]ایک بحری محاورہ ہے، باد بانوں سے ہوا نکل جائے تو ملاح بے بس ہو جاتا ہے، اس محاورے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ قدیم عربوں کو سمندر سے کتنا لگاؤ تھا

[۹] قرآن مجید ۴۶/۱۱

[۱۰]''عدل گستری ابتدائے اسلام میں'' کے عنوان سے جو مضمون ابتداً مجلہ عثمانیہ حیدر آباد مارچ

۱۹۳۸ء میں چھپا اس کے حوالے فرانسیسی مولفین نے بھی دیئے ہیں۔ یہ ایک آیندہ باب میں ملے گا۔ مگر غیر مسلم رعایا کی حیثیت اسلامی مملکت میں تفصیل طلب ہے۔ شاید آئندہ اس کا موقع ملے۔

[۱۱] رسالہ امام شافعی۔ ص ۶۷ وغیرہ

[۱۲] چنانچہ اسلامک کلچر حیدر آباد میں جنوری ۱۹۴۱ء و مابعد کے پرچوں میں میرا کئی سوصفحوں کا ایک طویل مقالہ چھپا ہے۔ اس کی کتابیات میں سابقہ اہل علم کی کوششوں کی بھی تفصیل ہے۔

[۱۳] آیت ''والغارمین'' کی طرف اشارہ ہے جو علاوہ فقراؤ مساکین کے ہیں۔ نیز حضرت عمر کے زمانے سے بیت المال کا قرضہ حسنہ دیا کرنا معلوم ہے۔ مزید تفصیل کے لئے میرا مضمون ''انجمن ہائے قرضہ ہائے حسنہ'' مطبوعہ مجلّہ طیلسانیین حیدر آباد ۱۹۴۳ء

[۱۴] خلیفہ بلافصل کے معنی گویا یہ ہوئے کہ جس نے براہ راست مشکوۃ نبوت سے فیض پایا ہو، اس معنے کے لحاظ سے تمام اکابر صحابہ خلفائے بلافصل تھے۔

[۱۵] اور یوں بھی عالم مادی ہیں ''دو شاہان در اقلیمے نہ گنجند'' صحیح ہو تو ہو عالم روحانی میں ایک سے زیادہ خلیفہ بلافصل ہونے میں کوئی امر مانع نہیں

[۱۶] پادری السمعانی کی Assemani bibl orient III.2.p.XCVI نیز دخویے کی De Goje,Memoire sur la conquete. de la syrie, p 106

[۱۷] فرانسیسی قاموس Dict.Dhist. et Geographie: Ecclesiastique, S.V ("Antioche" Par Karalevski.)۔

[۱۸] جامعہ کلکتہ کا شائع شدہ روسی سے ترجمہ (Barthold, Musl men rviure)۔

[۱۹] جرمن تالیف Krumbacher,Geschichte der Byzantinischen literature, P.49. 50

[۲۰] Walker, a history of the Law of Nation, Vol. 1. p 73 Theirsuccess represents no Barbarian, conquest. Far Higher Civilization Then that of the Byzantine Empire in Asia and Africa.

اسلامی عدل گستری اپنے آغاز میں

یہ مقالہ انجمن طیلسانیین (گریجویٹس) جامعہ عثمانیہ کی تیسری سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ اس کا ترجمہ اگرچہ رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد) میں چھپ رہا ہے لیکن اس اصل میں اس کے بعد متعدد چیزیں بڑھائی گئی ہیں۔ (م ح ا)۔

حیدرآباد کی مجلس وضع قوانین[۱] کے ضابطے اور عدالت عالیہ کے متعدد فیصلوں میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ممالک محروسۂ سرکار عالی (حیدرآباد) کا بن لکھا یا غیر موضوعہ قانون شریعت اسلام ہے اسی بناء پر، موجودہ حیدرآباد کی عدل گستری کے اصول کو بہتر طور سے سمجھنے کے لئے ہمیں اسلامی عدل گستری کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اسلام پہلے عرب سے شروع ہوا۔ عرب اپنی جاہلیت کے زمانے میں بھی عدل گستری کو جو اہمیت دیتے تھے اس کی شاہد۔ ولہاوزن کے الفاظ میں۔[۲]۔ خود ان کی زبان ہے جس میں ''حکومت کرنے'' اور مقدمے کا فیصلہ کرنے'' کے لئے ایک ہی لفظ (حکم) پایا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حکومت کا اگر واحد نہیں تو سب سے بڑا مقصد اور فریضہ عدل گستری سمجھا جاتا تھا۔

داؤد انّا جعلنا ک خلیفتہ فی لارض فا حکم بین الناس بالحق

اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں نائب بنایا ہے اس لئے لوگوں میں حق طور

سے فیصلے کیا کر۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے دیگر ممالک میں بھی عدل گستری کی اہمیت برابر تسلیم کی جاتی رہی ہے۔[۳] اسلام نے بھی اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اسے انسانیت کا عین اقتضا اور ''خدا کی نیابت'' کا پہلا فریضہ قرار دیا۔ چنانچہ یہ حکم دیا گیا کہ حق رسانی میں مدد دینے کے لئے بن بلائے بھی آگے بڑھنا اور اپنے معلومات کی حد تک سچ سچ گواہی دینا ہر شہری کے لئے ضروری ہے۔[۴]

قدیم عربوں کے پاس عدلیہ اور تنفیذیہ کے ادارے تو تھے لیکن تشریعۃ (یعنی ادارۂ قانون سازی) نہ تھا۔ یہ کمی اسلام نے آکر پوری کی جیسا کہ آگے بتایا جائے گا۔ عرب میں عدلیہ اور تنفیذیہ اگرچہ تھے لیکن بہت ہی ابتدائی حالت میں ان میں اسلام نے جس کی تحریک سنہ ۱۳ ق / ھ ۶۱۰ء میں شہر مکہ میں شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کے اغراض اور ضرورتوں کے لئے اصلاح و ترمیم کی اگرچہ بعض قدیم چیزیں جو بُری نہ تھیں برقرار ہیں خود رسول کریم کا ارشاد ہے کہ ''اسلام میں زمانہ جاہلیت کی اچھی چیزوں پر عمل کیا جائے گا''۔[۵]

اسلام سے پہلے عرب میں جو عدالتی نظام تھا اس کے سلسلے میں سب سے پہلے اس ادارے کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو خاص شہر مکہ میں قائم کیا گیا تھا۔ جرہمی دور میں اس کا آغاز ہوا مگر اس وقت کی زیادہ تفصیلیں ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ حرب فجار کے بعد اس ادارے کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور اس کی حلف گیری کے ابتدائی جلسے میں اس ہونہار نوعمر نے باوجود کم سنی کے بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا تھا جسے کچھ دنوں بعد دنیا پیغمبر اسلام کے محترم نام سے جاننے لگی۔ اس ''حلف الفضول'' میں ایک رضا کار جماعت شریک ہوئی جس کا مقصد حدود شہر میں ہر مظلوم کی خواہ وہ شہری ہو یا کہ اجنبی۔ مدد کرنا اور اس وقت تک چین نہ لینا تھا جب تک ظالم حق رسانی نہ کرے۔[۶]

نبوت ملنے کے بعد بھی آنحضرت اس جماعت کے کام میں فاعلانہ حصہ

لیتے [۷] اور اس پر فخر کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس ''حلف الفضول'' کی دہائی سے بڑے بڑے سرکش گھبراتے تھے۔ اور اس رضا کار جماعت نے جس نیک کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسے وہ عہد بنی امیہ کی ابتدا تک انجام دیتی رہی نئے ارکان کے بھرتی نہ کیے جانے کے باعث ابتدائی ارکان کے مرجانے پر یہ ادارہ آخر برخاست ہوگیا۔

یہ تو غیر معمولی اور خصوصی طریقہ تھا۔ معمولی اور عام طور سے انصاف ستانی اور فیصلہ یابی کے ملک میں تین مسلمہ طریقے تھے:۔

(۱) سب سے پہلے قبیلہ داری پنچ تھے۔ جب باہمی گفت وشنید سے معاملہ طے نہ ہوتا تو مستغیث اور ملزم یا مدعی اور مدعا علیہ ان قبیلہ واری پنچوں کے سامنے حاضر ہوتے جن کا فیصلہ قطعی ہوتا۔ اور بہت سی صورتوں میں جرم کو اصطلاحی الفاظ میں ''دفن'' کردیا جاتا [۸]۔ اور پھر اسی بنیاد پر انتقام طلبی جائز نہ ہوتی۔

(۲) اگر اندرونی طور سے یوں فیصلہ نہ ہوسکتا اور خاص کر اگر کسی قبیلے کی الگ الگ شاخوں سے تعلق رکھنے والے افراد میں جھگڑا ہوتا تو کاہنوں سے رجوع کیا جاتا۔

''کاہن'' [۹]۔ عبرانی زبان میں اور یہودیوں کے ہاں عبادت گاہوں کے منتظم کو کہتے ہیں۔ ابتداً لوگ ان مذہبی پیشواؤں کی غیر جانبداری اور بے لاگ فیصلوں کی توقع میں ان سے رجوع کرتے ہوں گے۔ یہ عرب کا ہن بھی یونانی مندوں کے پجاریوں کی طرح عموماً ذو معنی اور مسجع مقفٰی عبارت میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ غالباً یہ صحیح نہیں کہ عرب کے کاہن سب کے سب یہودی رہے ہوں۔ بہر حال عرب میں کچھ لوگ غیب دانی کے مدعی پائے جاتے تھے ان کو کاہن کہا جاتا تھا۔ مشکل مقدموں میں ان سے رجوع کیا جاتا اور پرانے قصوں کے مطابق بعض وقت وہ فریقین سے ایک لفظ سنے بغیر صحیح صحیح فیصلہ گنگنانا شروع کردیتے۔ [۱۰]۔ ان فیصلوں کی عدم تعمیل پر کسی قوت تنفیذ یہ کے تدارک کی عدم موجودگی کے باوجود لوگوں کے

تو ہمات ہی تہدید کا کام دیتے انسائیکو پیڈیا آف اسلام میں لفظ ''کاہن'' کے تحت لکھا ہے کہ ''اپنی خانگی حیثیت میں کاہن خاص کر جھگڑوں اور ہر طرح کے قانونی مسائل میں فیصلہ کنندوں کا کام دیتے۔ غرض ''کاہن'' اور ''حکم'' کے تصورات باہم بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں (الحطیہ نظم ۱۷ بیت ۷۔ نیز الابشیہی مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۳۲۱ھ ج ۲ ص ۳۷) ان کے فیصلوں کو ایک طرح خدائی فیصلہ سمجھا جاتا جن کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہوسکتا۔''[۱۱]

کہتے ہیں کہ یہ لوگ رنگین لباس نہیں پہنا کرتے تھے (الکاهن لا یلبس المصبغ)۔[۱۲]

زمزم کا چشمہ دریافت کرنے کے بعد اس کی ملکیت کا تصفیہ کرانے کے لئے عبد المطلب اور دیگر مکے والے ایک کاہن کے پاس گئے تھے۔ عبد المطلب نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی کی منت مانی تھی۔ اس سے چھٹکارا پانے کی تدبیر معلوم کرنے کے لئے بھی ایک کاہنہ عورت ہی سے رجوع کیا گیا تھا۔ اس قسم کی نظیریں بکثرت عربوں کی تاریخ جاہلیت میں مل سکتی ہیں۔

(۳) تیسرا اور شاید سب سے اہم ادارہ ''تحکیم'' کا تھا۔ عامر بن انظرب العدوانی کے پاس عربستان کی ہر جگہ سے تحکیم کے لئے مقدمے اس کی عمر بھر آتے تھے[۱۳]

قبیلہ تمیم کے سرداروں کا موروثی طور پر پورے عرب کا حکم ہوا کرنا عربیات کا ہر طالب علم جانتا ہے (مثلا مرزوقی جلد ۲، ص ۱۶۷) بازار عکاظ میں تو کثرت کار کے باعث دو سردار ہونے لگ گئے تھے جن میں سے ایک خالص عدالتی کام کے لئے مخصوص تھا (نقائض جریر وفرزوق ص ۴۳۸) یہ سردار سال میں ایک بار کسی بڑے میلے مثلا عکاظ میں جاتے اور اس جگہ دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدمات کو سن کر فیصلہ کرتے۔ لوگ ان ''عدالتوں'' کے اجلاس کے انتظار میں رہتے اور دور دور سے آتے

(نقائض جریر ص ۱۳۹) علاوہ اور مسائل کے قرض کے مقدمات کی بھی یہاں نظیر ملتی ہے (کتاب الاغانی ۴۷/۱۹) یہاں جگ ہنسائی کا خوف اور حکم کے پس پشت پورے میلے کی اخلاقی قوت، تہدید کا کام دیتی۔ ان موروثی حکموں میں سے چند کا ذکر ابو عبیدہ وغیرہ نے کیا ہے، [۱۴]

اور ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ [۱۵] غیلان بن سلمہ ثقفی کی عادت تھی کہ ایک دن اپنے ذاتی معاملات پر توجہ کرتا، ایک دن شعر شاعری کے علمی جلسوں میں حصہ لیتا اور ایک دن ''حکم'' بن کر جھگڑے چکاتا۔ قبیلہ داری حکم بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ خود شہری مملکت مکہ کے دس اداروں میں۔ سے ایک حکم کا بھی تھا۔[۱۶] وقتی طور پر بھی کسی کو حکم بنایا جاسکتا تھا چنانچہ قصی اور قضاعہ کی جنگ میں بنی کنانہ کے ایک فرد شداخ کو حکم بنایا گیا تھا۔[۱۷] زمانہ جاہلیت کے ان حکموں میں ایک نے مقدمے کی سماعت اور فیصلے کی غرض سے اپنے لئے لکڑی کا ایک تخت نشست گاہ کے طور پر بنایا تھا جس پر سائبان یا چتر کے طور پر لکڑی ہی کا ایک قبہ تھا۔ اسی لئے اس کو ذو الاعـــواد (لکڑیوں والا) کہنے لگے۔[۱۸] لیکن یہ خصوصی صورت ہے ورنہ عام طور پر حکم کمبل اوڑھے، عمامہ باندھے اور شاید کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے فیصلہ صادر کیا کرتے تھے۔[۱۹]

''منافرت، مفاخرت، میراث، چشموں کی ملکیت، خونی مقدمات'' غرض ہر قسم کے مسائل میں ان حکموں سے رجوع کیا جاتا۔[۲۰] عرب میں بنوالدیان کا ایک قبیلہ ہی تھا۔ ان کے جد اعلی کو بھی عدل گستری سے ضرور کوئی تعلق رہا ہوگا۔

یہ تو اس زمانے کا ذکر ہے جب عرب میں اسلام شروع ہونے کو تھا یہ نظام بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں کہا جاسکتا لیکن خود اس حالت تک پہنچے کے لئے بھی عرب میں کم وبیش وہی ارتقا عمل میں آیا ہوگا جو اور ملکوں میں۔ یعنی فطری احساس مدافعت نے شروع میں خود انتقامی کی بجھائی ہوگی جس میں ملزم ورنہ اس کے قریبی رشتہ دار بیٹے

بھائی وغیرہ سے بھی بدلہ لیا جاتا تھا۔ (اس سلسلے میں جنگ تغلب کی نظیر سے کون واقف نہیں) اس کے بعد اندرون قبیلہ جرم یا تعدی، داخلی امن قائم رکھنے، جھگڑا چکانے، ظالم کو سزا دینے اور مظلوم کی فریا درسی کرنے کے لئے خود قبیلہ اپنے سرداروں یا انصاف کے لئے مقرر شدہ خصوصی افسروں کے ذریعے سے دخل دہی کر کے عدل گستری کرنے لگا ہوگا۔ یہ شروع میں ''آنکھ کے بدلے آنکھ'' سے کم نہ ہوتا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ جب بعض صورتوں میں ضرر کی مالی یا رقمی قدر د قیمت کی جانے لگی اور بالآخر متعین بھی ہوگئی تو ملزم کے سماجی درجے، عمر اور جنس کے لحظ سے فرق بہر حال باقی اور جاری رہا ہوگا۔ چنانچہ اس کی نظریں عام طور سے ملتی ہیں کہ کسی طاقتور قبیلے کے فرد کا خون بہا معمولی قبیلے کے فرد سے مثلاً دگنا ہوتا (ابن ہشام ص۸۰۲ تا ۳) یا آزاد فرد کا قاتل غلام ہوتا تو غلام سے قصاص لینا ناکافی سمجھا جاتا اور غلام کے مالک یا کسی اور آزاد رشتہ دار کا سر مانگا جاتا۔ یا کوئی آزاد کسی غلام کو قتل کرتا تو قاتل کا قصاص گوارا نہ کیا جاتا بلکہ کوئی کم تر معاوضہ دیا جاتا۔ یہی حال عورت کا بھی تھا۔ اور اس قاعدے کو قرآن نے اسلامی دور میں منسوخ کیا:۔

''الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ (۲:۱۷۸) آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہی قتل کئے جائیں (نہ کم نہ زیادہ)

یہ سب سزائیں تو اس وقت دی جاسکتی تھیں جب ملزم، قبیلے کی دسترس میں ہوتا۔ اگر ملزم فرار ہوجاتا تو یہ محدود وسائل والے، خانہ بدوش، بعض صورتوں میں خاص کر بین القبائل جرم کے موقع پر، ملزم کو ''طرد'' یعنی جات باہر کر دیتے اور وہ اپنے قبیلے کی ہر قسم کی اخلاقی و مادی مدد سے محروم ہو کر اپنی حفاظت خود ہی تنہا کرنے پر مجبور ہوجاتا اور اکثر بے بسی و بے کسی سے غربت میں جان دیتا۔ ممکن ہوتا تو وہ دور دراز کے کسی اجنبی قبیلے میں جا کر پناہ گزیں ہوتا اور انھیں سے بھائی چارہ کر کے انھیں کا ایک

فرد بن جاتا۔ ایسے لوگ دخیل، مولا اور حلیف کے مختلف ناموں سے موسوم ہوتے اور یہ اس زمانے کا طریقہ توطن Law and mode of domicile and Naturalisation. تھا۔[۲۱]

اب تک صرف تاریخی پس منظر پیش کیا گیا۔ اس کے بعد، جیسا کہ بیان ہوا۔ ۶۱۱ء سے اسلام شروع ہوا۔ اس کے آغاز اور ترقی سے یہاں بحث نہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم کی ذات ہجرت سے پہلے اور بعد، زندگی بھر، اپنے پیروؤں کے لئے انتہائی عدالت کا کام دیتی رہی۔ لیکن ایک واقعی مملکت کی بنیاد ہجرت کے بعد ہی پڑی۔ ہجرت کر کے مدینہ آتے ہی آنحضرت نے فوراً اپنے عدالتی حقوق و فرائض کا تعین فرما دیا تھا۔[۲۲] اور ہماری خوش قسمتی سے یہ دلچسپ اور اہم دستاویز بجنسہ و بلفظہ ہم تک نقل ہوتی آئی ہے۔[۲۳] اسے سب سے پہلی اسلامی مملکت کا دستور اور آئین کہا جاسکتا ہے۔ (دیکھئے باب ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور'')

اس تاریخی دستاویز کے دو حصے ہیں فقرہ ۱ تا ۲۳ میں مہاجرین اور انصار کی وحدتوں کا ذکر ہے اور فقرہ ۲۴ تا ۴۷ میں ان قواعد کا ذکر ہے جو مضافات مدینہ میں بسنے والے حلیف یہودی قبائل اور بستیوں سے متعلق تھے ان ہر دو حصوں کے عدالتی فقرات کی تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی:۔

حسب سابق ہر قبیلہ انصار اپنے افراد کے مواخذہ جات کا اجتماعی طور سے ذمہ دار ہوگا۔ اگر کوئی فرد دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو تو اس قیدی کے قبیلے کے سب افراد مل کر فدیہ ادا کریں گے (ف ۴ تا ۱۱)۔

اس سلسلے میں انصار کے قبائل تو معین تھے لیکن مہاجرین مکہ سب مل کر ایک قبیلہ تصور کئے جائیں گے۔ (ف ۱۲)۔

انصاف رسانی متضرر کے ہاتھوں میں نہیں رہے گی بلکہ وہ پوری جماعت مسلمانان کا فریضہ سمجھی جائے گی اور اس میں کسی رشتہ داری اور قرابت کے باعث پاس

ولحاظ نہیں کیا جائے گا (ف ۱۳) اور کسی قاتل یا مجرم کو کوئی شخص پناہ نہیں دے سکے گا (ف ۲۲)

کسی مسلمان کا قتل عمد سزائے موت کا مستوجب ہوگا البتہ مقتول کے ولی مسلمان ہوں تو انھیں چاہیئے [۲۴] کہ قاتل کے مسلمان ہونے کی صورت میں قصاص کا مطالبہ نہ کریں (ف ۱۴)

ہر قسم کے جھگڑے کے لئے آنحضرت کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا ۔[۲۵] (ف ۲۳) اسی طرح یہودیوں سے جو دفعات متعلق ہیں ان میں بیان کیا گیا ہے کہ :۔

فدیہ، دیت، ولاء اور جوار کے ادارے حسب سابق برقرار رہیں گے (ف ۲۵۔۳۱۔۳۵۔۴۰) مگر کوئی شخص قریش اور انکے مددگاروں کو اپنے جوار یعنی پناہ میں لینے کا مجاز نہ ہوگا (ف ۴۳)۔

عدل گستری ایک مفاد عامہ کا معاملہ ہے اور کوئی شخص خود اپنے رشتہ داروں کی بھی پاسداری نہ کر سکے گا (ف ۳۶ ب ۳۱) آنحضرت ہر قسم کے جھگڑوں میں آخری فیصلہ کریں گے (ف ۴۲) دیگر جزئی تفصیلوں کو یہاں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔[۲۶] گو اس عظیم الشان اور انقلابی اصلاح کی جانب خصوصی اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ انفرادی انتقام جوئی کی جگہ مرکزی عدل گستری کا ادارہ وجود میں آ گیا اور یہ اختیار افراد ہی نہیں قبائل سے بھی چھین کر حکمران وقت کے سپرد کیا گیا جو تفتیش اور غیر جانبداری کا پابند تھا۔

اس موقع پر یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ کم از کم اہل کتاب غیر مسلموں کے مقدموں میں آنحضرت صلعم ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ چنانچہ یہودیوں کے دو مقدموں کا اکثر مورخوں نے ذکر کیا ہے جن میں توریت پر عمل کرایا گیا۔[۲۷] قرآن مجید میں اس مسئلے سے کافی طویل بحث کی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے یہودی توریت پر عمل کریں تو نصرانی انجیل پر اور مسلمان قرآن پر اور یہ کہ خدا ہی

نے ہر ایک کو الگ الگ شریعتیں دی ہیں ورنہ اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی ''امت'' بنا دیتا۔[۲۸] آنحضرت کا یہ طرزِ عمل بعد میں مستقل قانون بن گیا کہ غیر مسلم رعایا سے ان کا شخص قانون ہی متعلق ہو اور اس غرض کے لئے خصوصی عدالتیں بنائی جائیں۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں اس چیز نے خاصی ترقی کر لی تھی اور ان ملی عدالتوں کے حکام بھی ہم ملت ہی مقرر ہوتے تھے۔ ممکن ہے اس میں یہ مصلحت بھی ہوشیدہ ہو کہ سخت تر شخصی قانون والی ''ملتیں'' ہمسایہ و ہم شہری مسلمانوں کی ''الحنیفیته السحاد'' کی سہولتوں کو دیکھ دیکھ کر اپنے سکون کے لمحوں میں اس کو قبول کرنے کی خاموش ترغیبیں پاتے رہیں۔ بہر حال ایک ابتدائی اور فوری اور بہت اہم فائدہ اسلامی مملکت کو اس سے یہ پہنچا کہ جدید مفتوحہ علاقے میں اقلیتوں کی ....جن پر وہاں کی سابق حکومت سخت مظالم توڑا کرتی تھی....... پر خلوص تائید حاصل ہو گئی جن سے اس کو اپنی تازہ فتح کے مستحکم اور مکمل کرنے میں کافی مدد ملی۔

چنانچہ مشہور پادری کار الفسکی لکھتا ہے:۔

''علاوہ یہودیوں کے جن پر بہت سخت مظالم ہو رہے تھے.......یعقوبی عیسائیوں نے بھی عربوں کو اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا...... مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جن کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدار عطا کئے جائیں۔[۲۹]

ایک اور غیر مسلم شہادت جو ہمعصر ہونے کے باعث خاص اہمیت رکھتی ہے، قابل ذکر ہے، چنانچہ شام کی فتح کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عمر کے زمانے میں ایک نسطوری پادری نے ایک دوست کے نام جو خط لکھا تھا وہ موجود ہے اور اس میں لکھا ہے:۔

''یہ طائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں، لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسر پیکار نہیں۔ اس کے بر خلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور قدیسوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجوں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں۔[۳۰]

یہ یاد رہے کہ کم از کم انصار کے قبائل کی حد تک آنحضرت صلعم نے ہجرت سے پہلے ہی بعیت عقبہ میں ہر ایک کا ایک ایک نقیب مقرر کر دیا تھا جو اپنے قبیلے کی نمائندگی کرتا اور اندرونی نظام اور باقاعدگی کا ذمہ دار تھا۔ اگر کسی معاملے میں نقیب کا فیصلہ تشفی کا سامان نہ کرتا تو معاملہ آنحضرت کے پاس آتا۔ نقیب کے تحت ہر دس آدمیوں کا ایک افسر ہوتا تھا جسے عریف کہتے تھے۔[۳۱] اس نظام سے وقت ضرورت استصواب عامہ Torry میں بھی مدد لی جاتی تھی۔[۳۲] مدینے کی حد تک آنحضرت پورا عدالتی کام خود انجام دیتے تھے لیکن جب اسلامی عملداری میں وسعت ہو کر انتظامی کام بڑھ گیا تو مدینے میں آنحضرت نے چند مفتی (یعنی قاضی) [۳۳]'' مقرر فرما دیئے تھے۔[۳۴] جن کے فیصلوں کے خلاف آنحضرت کے پاس مرافعہ بھی ہوتا تھا۔[۳۵] مدینے میں مستقل قاضیوں کے علاوہ کسی خاص شخص کو کسی خاص مقدمے کی سماعت کے لئے موقتی [۳۶] قاضی بنایا جایا کرنے کی بھی عہد نبوی میں متعدد نظیریں ملتی ہیں نیز ان کے آنحضرت کے پاس مرافعوں کی بھی۔[۳۷] یہ تو ظاہر ہی ہے کہ دارالحکومت کے باہر صوبوں اور ضلعوں میں بھی علیحدہ عدالتی افسروں کی ضرورت تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ دار عامل (گورنر) بھی بیک وقت سپہ سالار اور افسر مال (تحصیلدار) اور قاضی ومحتسب (نگران اخلاق و مال تجارت وغیرہ) ہوتے تھے۔ ان کی کارروائیوں اور فیصلوں کے خلاف بھی آنحضرت کے پاس مرافعے آیا کرتے تھے۔[۳۸] ان قاضیوں کو مستقر کی جانب روانگی کے وقت جو ہدایتیں دی جاتی تھیں ان میں سے چند کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے حضرت معاذ بن جبل عہد نبوی کے عدالتی

حلقے میں جو نمایاں حیثیت رکھتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے حالات سے عام کیفیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:۔

''معاذ بن جبل وبعثه رسول الله صلعم قاضیاًالی الحنبد یعلم الناس القران وشرائع الاسلام و یقضی بینهم و جعل الیه قبض الصدقات من العمال الذین بالیمن''۔[۳۹] معاذ بن جبل کو آنحضرت نے قاضی بنا کر جند (جو یمن میں ہے) بھیجا تاکہ لوگوں کو قرآن اور احکام اسلام سکھائیں اور ان کے مقدموں کا فیصلہ کریں اور یمن کے تحصیلداروں سے جمع شدہ محاصلِ سرکاری اپنی تحویل میں لیں۔

جب معاذ بن جبل یمن روانہ ہونے لگے تو آنحضرت نے آخری باریابی کے موقع پر ان سے جو گفتگو فرمائی وہ بھی اسلامی عدل گستری اور قانونیات کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے:۔

''ان رسول الله صلعم بعث معاذ الی الیمن فقال کیف تقضی؟ قال بمافی کتاب الله. قال فان لم یکن فی کتاب الله؟ قال فبسنة رسول الله .قال فان لم یکن فی سنته رسول الله؟ قال اجتهد برائی. قال الحمد الله الذی وفق رسول رسول الله لمایحب رسول الله''[۴۰]

'' آنحضرت نے معاذ کو یمن بھیجا تو پوچھا کس طرح فیصلے کرو گے؟ کہا اس کے مطابق جو اللہ کی کتاب (قرآن) میں ہو۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ہو؟ کہا تو رسول اللہ کی سنت کے موافق فرمایا اگر رسول اللہ کی سنت میں نہ ملے؟ کہا تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ فرمایا خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے فرستادے کو ایسی بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔''

قاضیوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی جاتی تھی کہ دی ہوئی ہدایتوں کے خلاف وہ جو کام کریں گے وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔[۴۱] جب عمرو بن حزم یمن گورنر بنا کر بھیجے

گئے تھے تو ان کو آنحضرت نے ایک تحریری ہدایت نامہ دیا تھا۔ یہ اسلامی تاریخ انتظام مملکت میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔اس طویل اور ہمہ گیر دستاویز میں انھیں انصاف رسانی اور بے لاگ عدل کا حکم دیا گیا ہے اور ظلم وستم سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔[۴۲] عمرو بن حزم کے لئے لکھے ہوئے ہدایت نامہ میں تفصیل سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جسمانی ضرر رسانی کی کس کس صورت میں متضرر کو کیا ہرجہ دلایا جائے گا۔[۴۳] اس قسم کا ایک قانون آنحضرت کے حکم سے حضرت ابوشاد کو بھی لکھ کر دیا گیا تھا۔[۴۴]

بدلے اور انتقام کا تصور حمورابی کے زمانے میں یہ تھا کہ کسی کی بیٹی یا بیٹے کے قتل پر قاتل کی بھی بیٹی یا بیٹے کو قتل کیا جائے اور اصل قاتل محفوظ رہے۔[۴۵] قانون حمورابی کے بعد اس کے قانون قصاص اعضا کا کچھ حصہ [۴۶] قانون حضرت موسیٰ (توریت) میں بھی ملتا ہے جس میں آنکھ کے عوض آنکھ اور کان کے عوض کان کا طریقہ قائم کیا گیا تھا۔[۴۷] مگر یہ عہد اسلام کی، آنحضرت صلعم کے زمانے کی ترقی ہے کہ عمد، مشابہ عمد اور خطا میں فرق کیا جانے لگا۔[۴۸] اور نیت سب سے پہلے دیکھی جانے لگی۔[۴۹] اس کے علاوہ بہت سی صورتوں میں فمان یعنی ٹارٹ مقرر کر دیا گیا اور ہرجے کا معاوضہ بجائے مساوی انتقام کے رقمی یا مادّی صورت میں دلایا جانے لگا۔[۵۰] اور سخت قانونی انصاف کی جگہ استحسان یا نصفت کو عدالتیں روا رکھنے لگیں۔[۵۱] مطلب یہ ہے کہ اانصاف کے ساتھ رحم کو بالکل نظر انداز نہیں کر دیا جا سکتا۔ اور حالات و واقعات کے لحاظ سے برموقع مناسب رعایت بھی کی جا سکتی ہے۔ اور ذمہ داری کو ''شخصی'' قرار دیا گیا، نیا بتی نہیں کہ ایک کا بار دوسرے پر لادیا جائے۔[۵۲] اس طرح شبہے کا فائدہ ملزم کو دینا اور غلطی سے سزا دینے کی جگہ غلطی سے رہا کرنا، اصول قرار دیا گیا۔[۵۳]

ایک نئی ''(جدت)'' یہ کی گئی کہ انسانوں کے سوا باقی سب مخلوقات کو ذمہ داری سے بری کر دیا گیا ورنہ اب تک عرب میں کوئی گڑھا اور کوئی جانور بھی کسی آدمی

کے ضرر اور ہلاکت کا باعث ہوتا تو ذمہ داری سے بری نہ ہوتا۔[۵۴]۔ چنانچہ امام ابو یوسف نے بیان کیا ہے کہ:۔

کان اهل الجاهليته اذا عطب الرحل فی القليب جعلوا القليب عقله و اذا قتله دابة جعلوها عقله و اذا قتله معدن جعلوه عقله فسال سائل رسول الله صلعم فقال العجاء جبار و المعدن جبار و البئر جبار۔[۵۵]

زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی گڑھے میں گر کر مرجاتا تو وہ گڑھا، اس کا خون بہا قرار دیا جاتا (اور ہلاک شدہ شخص کے وارثوں کی ملک قرار پاتا) اگر کوئی جانور کسی کو قتل کرتا تو وہی اس کا خوں بہا قرار دیا جاتا۔ اور اگر کوئی کسی کان میں ہلاک ہوتا تو وہ کان اس کا خون بہا قرار دی جاتی کسی نے اس بارے میں آنحضرت سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ بے زبان جانور اور کان اور کوئیں کی ضرر رسانی سے کوئی ذمہ داری نہیں پیدا ہوتی۔

ابھی بیان ہوا کہ مختلف صوبوں پر جو عامل اور قاضی بھیجے جاتے تھے انھیں خاص احکام اور ہدایتیں دی جاتی تھیں۔ مرکز حکومت مدینہ میں عدالت ابتدائی ہر قبیلے کے عریف اور نقیب ہوتے یا مفتی اور قاضی ۔ عدالت مرافعہ اور عدالت انتہائی خود جناب رسالت مآب کی ذات تھی۔ ''مرافعہ'' اور ''استصواب'' آنحضرت کے پاس بعض وقت اضلاع اور صوبہ جات سے بھی ہوتا [۵۶] ''تصحیح'' کی بھی متعدد نظیریں؛ تاریخ نے اس عہد کے متعلق محفوظ کی ہیں اور جب کبھی آنحضرت صلعم کو کسی افسر کے غلط فیصلے یا طرز عمل کا پتہ چلتا تو آپ (بصیغہ تصحیح) دخل دہی فرما کر تلافی اور تدارک فرماتے۔ حضرت خالد بن الولید اور واقعہ بنی جذیمہ اس کی ایک انتہائی مثال ہے۔ تصحیح اور مرافعے کا نظام حضرت عمر کے زمانے میں ایک بہت ہی ترقی یافتہ ادارہ بن گیا تھا اور انھوں نے حج کے موقع کو ایک عدالتی اور انتظامی تنقیح کا مقام بھی قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ جملہ والیان صوبہ اور حکام عدالت اس وقت مکہ معظمہ آتے اور حضرت عمران کے خلاف دعوے اور مقدمے، خود سنتے اور حق رسانی کرتے۔ اگر سرکاری افسروں

سے کوئی لغزش ہوئی ہوتی تو بڑی سختی سے دارو گیر کرتے۔

جیسا کہ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے، ثبوت مانگے بغیر اگر ہر دعوے کو صحیح مان لیا جایا کرے تو لوگوں کی جان و مال محفوظ نہ رہیں۔[۵۷] اسی لئے امور تنقیح طلب اور شہادت پیش شدہ کی جانچ [۵۸] کے لئے آنحضرت صلعم کے بہت سے اصولی اور ذیلی احکام حدیث میں ملتے ہیں۔ ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

انصاف رسانی کے لئے قاضی کو چاہئے کہ صرف روداد پر فیصلہ کرے اور اپنے خانگی معلومات کو دخل نہ دے۔[۵۹] ایسا حکم نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ قاضیوں کو بددیانتی کی ہمیشہ زبردست ترغیب ہوتی رہتی۔ ناحق فریق کی جادو بیانی کے سلسلے میں ایک دلچسپ حدیث قابل ذکر ہے، جو صحاح ستہ[۶۰] میں آنحضرت سے مروی ہے۔

''انما انا بشروا لکم تختصمون الی دلعلی بعضکم ان یکون احـحن بـحـحبة من بعض فا قضی له نحو ما اسمع منه فمن قضیت له بشئی من حق اخیه فلایا خذ منه شیا فا نما اقطع له قطعة منا النار.''

''بے شبہ میں صرف ایک انسان ہوں۔ تم میرے پاس جھگڑتے آتے ہو اور یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دلیل بہ نسبت دوسرے کے زیادہ چرب بانی کے ساتھ پیش کرے اور میں جو کچھ سنوں اسی کے مطابق فیصلہ صادر کروں۔ اگر کسی کو میرے (اس طرح کے) فیصلے سے (ناحق) کچھ ملے تو وہ اس سے استفادہ نہ کرے کیونکہ میں جو کچھ دیتا ہوں وہ آگ کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں۔''

جس سماج میں پیشہ ور دکیل اور اڈوکیٹ نہ ہوں اور جو قانونی حق سے زیادہ قدرتی حق پر زور دیتا ہو، اس کے لئے حضرت علی کو دی ہوئی اس ہدایت نبوی سے بہتر اور کیا ہدایت دی جاسکتی ہے کہ:۔

اذاجلس بین یدیک الخصمان فلا تقض بینهم حتی تسمع من الآخر کما سمعت من الا ول فانه احری ان تبین لک القضاء . قال فما

زلت قاضیا وما شککت فی قضاء بعدہ[۶۱]

جب تیرے پاس دو جھگڑنے والے آئیں تو تو اس وقت تک ان کا فیصلہ صادر نہ کر جب تک کہ تو پہلے اور دوسرے دونوں کا بیان نہ سن لے۔ تجھے، اس طرح صحیح فیصلے کا سجھائی دینا زیادہ ممکن ہے۔ (حضرت علی فرماتے ہیں) اس کے بعد سے میں ہمیشہ فیصلے کرتا رہا ہوں اور فیصلے کرنے میں مجھے کبھی شک اور ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوئی۔

آنحضرت صلعم نے قانون اور انصاف رسانی کا یہ اہم قاعدہ مقرر فرما دیا تھا کہ بار ثبوت مدعی پر ہے اور اگر مدعی ثبوت نہ پیش کر سکے۔[۶۲] تو دعوے کے منکر یعنی مدعا علیہ کو قسم دی جائے [۶۳] اس قاعدے کو بدلنے کی اب تک کہیں ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ مزید براں، مدعی اپنے ناکافی ثبوت کی تلافی (جب کہ مدعا علیہ کے پاس بھی جوابی ثبوت نہ ہو) قسم کے ذریعے سے بھی کرتا اور عہد نبوی میں اس کی بکثرت نظیریں ملتی ہیں۔[۶۴] ایک نسبتاً فروتر اخلاق کے زمانے میں ثبوت میں پیش شدہ گواہوں کے علاوہ، قاضی شریح مدعی کو قسم بھی دیتے تھے کہ اس کا دعوی سچا ہے۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا:۔

رایت الناس احدثوا فاحدثت[۶۵] جب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں نت نئی برائیاں پیدا ہوگئی ہیں تو مجھے بھی نئے طریقے اختیار کرنے پڑے۔

اسی سلسلے میں حضرت علی کی ایک نئی اصلاح کی طرف توجہ منعطف کرائی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کہ گواہوں کی پیشی پر ان کا ''تزکیہ'' یعنی معتبر ہونے کے متعلق اہل محلہ وغیرہ کا اظہار، قدیم سے رائج تھا لیکن اس تحقیقات کو قاضی شریح نے مخفی طور سے کرانا شروع کیا۔[۶۶] اور جھوٹے گواہوں کا انسداد کرنے کے لئے حضرت علی ایک گواہ کا ظہار لیتے وقت دوسروں کو عدالت کے کمرے سے ہٹا دیتے تھے اور ان کا قول مشہور ہے کہ ''انا اول من فرق بین الشھود ''.[۶۷] ورنہ اس سے پہلے سب گواہ مرہ عدالت میں حاضر رہتے اور ایک دوسرے کے بیانات سنتے رہتے تھے۔

قاضی شریح کا ذکر اب تک کئی بار آیا ہے فصل خصومات ان کا موروثی پیشہ تھا۔ اوران کے والد ھانی اپنے بے لاگ فیصلوں کے باعث زمانہ جاہلیت میں ابوالحکم کے معزز نام سے مخاطب کئے جاتے تھے۔[٦٨] خود شریح ان مادر زاد قاضیوں میں سے ہیں جن کی تعداد تاریخ عالم میں بھی بہت کم ہے اور جن پر ہر قوم بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ یہ بچے سے تھے کہ انھوں نے ایک پیچیدہ قانونی مقدمے میں جس میں خلیفہ حضرت عمر پریشان تھے ایک بہترین اصول اس پیچیدگی کے حل کا بتایا۔ مردم شناس وقدردان حضرت عمر اس قدر خوش ہوئے کہ باوجود لوگوں کی مخالفت کے اس کمسن بچے کو عراق کے اہم صوبے کا قاضی بنا کر کوفہ روانہ کیا۔ قاضی شریح کو وہاں جو کامیابی ہوئی اس کے لئے صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ وہ تقریباً پچھتر سال تک مسلسل اسی کام کو انجام دیتے رہے اور کسی خلیفہ مابعد کو ان کی اہلیت کے متعلق بدگمانی نہیں ہوئی [٦٩] انھیں قاضی شریح کو حضرت عمر نے جو ہدایت نامہ دیا تھا۔ اس کے چند فقرے خود ان کی زبانی سنئے :۔

مااستبان لک من کتاب اللہ فلاتسئل عنه فان لم یستبن فی کتاب اللہ فمن السنته فان لم تجده فی السنته فاجتهدو ایک[٧٠] اگر تجھ کو کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے تو پھر اس کے متعلق کسی اور سے رجوع نہ کر۔ اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنت میں اور جو سنت میں بھی نہ ملے تو پھر اپنی رائے کو کام میں لا۔

ایک دوسری روایت میں ہے :۔

قال الشعبی عن شریح قال قال لی عمر اقض بما استبان لک من کتاب اللہ فان لم تعلم کل کتاب اللہ فاقض بما استبان لک فی قضاء رسول اللہ فان لم تعلم (کل) قضاء رسول اللہ فاقض بما استبان لک من (قضاء) ائمة (الائمة؟) المهتدین فان لم تعلم کل ماقضته ائمته (الائمة؟) المهتدین فاجتهدو ایک واستشر اهل العلم

والصلاح. [۷۱] شعبی نے شریح سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا، مجھ سے حضرت عمر نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر پوری کتاب اللہ میں بھی وہ مسئلہ نہ ملے تو رسول اللہ کے فیصلوں میں جو چیز ملے اس کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر رسول اللہ کا کوئی فیصلہ نہ ملے تو راہ یاب اماموں کے فیصلوں کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر راہ یاب اماموں کے فیصلوں میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو اپنی رائے کو کام میں لا اور علم وصلاح والوں سے مشورہ کر۔

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے یہی طرز عمل اور حکم آنحضرت کا تھا اور بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر کا بھی یہی طرز عمل تھا۔[۷۲] بلکہ یہاں تک پتہ چلتا ہے۔[۷۳] کہ قاضیوں کے لئے مشیران قانون بھی جزء لاینفک بنادئے گئے تھے اور عرصۂ دراز تک اس پر عمل رہا جس کے باعث نئے قاضیوں کی ناتجربہ کاری قانون کی مکمل تعمیل میں حارج نہ ہوئی۔شاید یہ متاخر قانون روما کے ''کونسیلیم'' سے مشابہ ہے۔ اس کے کچھ اشارے بدائع کا شانی جلد ۷،ص ۱۲، میں ملتے ہیں اور تفصیل کے لئے امیل تیان کی مذکورہ کتاب جلد ۱،ص ۳۱۴ و مابعد۔

حضرت عمر نے اپنی خلافت کے زمانے میں مختلف صوبوں کے قاضیوں کو جو ہدایتیں دی تھیں ان میں سے چند تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں۔[۷۴] ان میں سے ایک جو ''کتاب سیاستہ القضاء و تدبیرا الحکم'' کے موزوں نام سے مشہور ہے۔[۷۲] سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ وہ ہدایت نامہ ہے جو انھوں نے حضرت ابو موسی الاشعری کو بصرے کا قاضی بنانے کے بعد بھیجا تھا اور آج بھی حکام عدالت کے لئے دستور العمل بن سکتا ہے۔ اس کی اہمیت نے آکسفرڈ کے پروفیسر عربی ڈاکٹر مار گولیوث کو ۱۹۱۰ء میں اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ اس پر ایک بسیط مضمون لکھے۔[۷۶] مگر بدقسمتی سے اصل دستاویز کا انگریزی ترجمہ مارگولیوث نے کیا ہے، حد درجہ ناقص ہونے سے اس کی اہمیت کا کوئی صحیح اندازہ پڑھنے والے کو بالکل نہیں ہوسکتا۔ اسلامی

مولفوں نے بھی قدیم سے اس دستاویز کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس پر شروح لکھے ہیں۔[۷۷]اس کافی طویل دستاویز کا یہاں خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ اصل متن بکثرت مولفوں نے محفوظ کیا ہے۔[۷۸]

قضائت ایک خدائی فریضہ ہے اور آنحضرت کا واجب التعمیل حکم اور طرز عمل۔

اگر آپ کے پاس کوئی مقدمہ رجوع ہو تو غور وفکر کے بعد پوری طرح سمجھ کر فیصلہ کیجئے اور اس کی تعمیل کرائیے۔ بغیر تعمیل کے اچھے سے اچھا فیصلہ بھی بیکار ہے۔ فریقین سے برابری کا برتاؤ کیجئے تاکہ کمزور آپ کے عدل سے مایوس نہ ہو جائے اور قوی ظالم اس سے بے جا فائدہ نہ اٹھائے۔ بار ثبوت مدعی پر ہے اور منکر پر صرف قسم۔

اگر فریقین صلح کر لینی چاہیں تو وہ جن شرائط پر چاہیں صلح کر سکتے ہیں صرف شرط یہ ہے کہ اس طرح کوئی حرام چیز حلال نہ ہو جائے اور حلال چیز حرام۔

فیصلہ کر چکنے کے بعد نظر ثانی میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اصل تو حق رسانی اور انصاف ہے۔

اگر کسی بات کے فیصلے میں قرآن اور سنت میں کوئی چیز نہ ملے تو خوب غور و فکر کیجئے اور نظائر اور مشابہ امور کو ڈھونڈھ کر ان پر قیاس کیجئے اور ایسا فیصلہ کیجئے جو خدا کو زیادہ پسند آئے اور حق سے زیادہ قریب ہو اگر مدعی کو اپنا حق ثابت کرنے یا شہادت فراہم کرنے میں مہلت درکار ہو تو وہ دی جائے۔

شہادت سے اگر وہ دعوی ثابت کر دے تو اس کے موافق ورنہ اس کے مخالف فیصلہ صادر کیا جائے۔

شہادت کے اغراض کے لئے سب مسلمان قابل اعتماد ہیں، سوائے بد چلنی میں سزا یافتہ (مجلود فی حد) اور ایسے لوگوں کے جن کا جھوٹی گواہی دینا اس سے پہلے ثابت ہو چکا ہو۔

کسی مدعی کے رشتہ دار کی خاص اس مقدمے میں شہادت قابل اعتماد نہیں۔

مجلس عدالت میں غرور وتکبر، لوگوں کو جھڑکنا اور حق بات پر ناگواری نہیں ظاہر کرنی چاہیئے، خدا سب کو دیکھتا ہے اور سنتا ہے، اسی سے سب کو اپنا معاملہ صاف رکھنا چاہیئے۔

اس عہد کا اسلامی قانون شہادت اتنا وسیع موضوع ہے کہ ایک مستقل مقالے کے بغیر یہ بتانا ناممکن ہوگا کہ تفتیش کس طرح ہوتی تھی، تنقیح شہادت اور جرح کے کیا قواعد تھے، گواہوں کی تعداد، عمر، مرد اور عورتیں، مسلم اور غیر مسلم کی شہادت، غیر ملکی مستامنوں کے عدالتی حقوق وغیرہ کے کیا قاعدے تھے۔

قاضیوں کی تنخواہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے۔ اسلام میں اس اصول کو شروع ہی سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ قاضیوں کو معقول بلکہ بیش قرار تنخواہ ہیں دے کر رشوت کے لالچ سے بچایا جائے۔ آنحضرت طالب عہدہ لوگوں کو کبھی گورنر یا قاضی نہیں بناتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت نے حکام عدالت کے لئے ماہواریں بھی مقرر کرنی شروع فرمادی تھیں اور اس بارے میں حضرت عتاب بن اسید کا نام بہ طور نظیر پیش کیا جاتا ہے، جن کو کہتے ہیں کہ، ماہانہ تیس درہم تنخواہ دی جاتی تھی۔[۷۹] سلیمان بن ربیعۃ الباہلی کو حضرت عمر ماہانہ پانچ سو درہم دلاتے تھے اور کم سن قاضی شریح کو ماہانہ ایک سو۔ حضرت علی اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ قاضی شریح کے پاس اپنے ایک مقدمے کے لئے رجوع ہوئے اور اپنے بیٹے امام حسن کو بطور گواہ پیش کیا۔ حضرت علی کے، باوجود خلیفہ ہونے اور امام حسن کی خصوصی شخصیت بتا کر اصرار کرنے کے، قاضی شریح نے بیٹے کی گواہی کو باپ کے حق میں قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد حضرت علی نے قاضی شریح کی بھی ماہوار پانچ سو درہم مقرر کردی۔[۸۰]

متعدد نظیروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت فوجداری مقدموں میں ملزم کو تحقیقات تک اور مدیون کو قرض کی ادائی کے لئے حوالات میں رکھتے تھے۔[۸۱] نیز حاضری کا مچلکہ بھی لیتے تھے۔[۸۲] خلافت راشدہ میں قیدخانوں کے لئے مستقل عمارتیں

ہونے لگ گئی تھیں۔ اس غرض کے لئے حضرت عمر کا مکان خریدنا مشہور ہے۔ حضرت علی کے بنائے ہوئے دو قید خانے نافع اور مخلیس کے نام سے معروف ہیں۔ [۸۳]

انگریزی قانون کا ایک اہم اصول ہے کہ بادشاہ کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں دائر کیا جاسکتا کیونکہ King cando no wrong لیکن اسلام کسی انسان کو خطا سے میرا نہیں سمجھتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے خود اپنی ذات کے خلاف ٹارٹ اور دیوانی دونوں قسم کے متعدد مقدمات سنے اور مدعیوں کے حق میں فیصلے صادر کئے۔ [۸۴] حضرت عمر نے نہ صرف اضلاع بلکہ مستقر حکومت، مدینہ منورہ میں مستقل اور پورا وقت دینے والے قاضی مقرر کر دیئے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خود خلیفہ کے خلاف کوئی مقدمہ دائر ہوتا تو خلیفہ کو بھی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑتی کیونکہ کوئی اپنے آپ فریق اور حاکم دونوں نہیں بن سکتا (" علی ان الامام لایکون قاضیاً فی حق نفسہ" مبسوط سرخسی جلد ۱۶، ص ۷۳، مزید تفصیل کے لئے میری انگریزی تالیف "مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ ص ۸۰ تا ۸۳)۔ اس قسم کی نظیریں نہ صرف حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کے زمانے میں ملتی ہیں۔ [۸۵] بلکہ خلفائے بنی امیہ و بنی عباس تک اس سے اپنے کو مستثنیٰ کرنے کی جرات نہیں رکھتے تھے اور عبد الملک اور منصور کا عدالت میں مدعا علیہ بن کر جواب دہی کے لئے حاضر ہونا [۸۶] مثال کے لئے کافی ہے۔ اس کی نظیریں حال کے حیدر آباد کی تاریخوں تک میں ملتی ہیں۔ مستقل قاضیوں کے سلسلے میں ایک بعد کے زمانے کا واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مورخ ابن الجوزی نے بیان کیا ہے کہ عبید اللہ ابن الحسن العنبری اور عمر بن عامر بصرے میں پہلی مرتبہ ایک عدالت میں مشترکہ قاضی مقرر کئے گئے اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ مل کر مقدمے سنیں اور متفقہ فیصلے صادر کریں۔ [۸۷] (عورت کے قاضی ہوسکنے کے متعلق مباحث ماوردی باب ششم میں دیکھئے) قاضی یا حاکم عدالت کا اجلاس شروع میں عموماً مسجد میں ہوتا تھا جو شہر کے ٹاؤن ہال کا کام دیتی تھی۔ ان مسجدوں میں مسلم اور غیر مسلم

سب بے تکلف آسکتے تھے۔ ابن عساکر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں ایک عمارت دارالقضاء کے نام سے بن چکی تھی۔ [۸۸]
سلطان نورالدین زنگی کا ایک دارالعدل تعمیر کرانا البتہ ایک بعد کا واقعہ ہے۔

چونکہ مقدمات ہر قسم کے پیش ہوتے ہیں اس لئے ان کے تصفیے کے لئے ماہرین کی امداد حاصل کرنی ضروری ہوتی ہے۔ تعمیرات۔ [۸۹] غلے اور زرعی پیداوار کا اندازہ۔ [۹۰] قیافہ شناسی، [۹۱] اور اسی طرح کی چند چیزوں کے ماہر خود عہد نبوی میں عدالتی اغراض کے لئے برسرموقع بھیجے جایا کرتے تھے اور ان کی رائے پر آنحضرت فیصلہ کرتے اور فیصلہ نافذ کراتے۔

قاضی کا تقرر شروع سے مرکز حکومت سے متعلق رہا ہے خاص کر صوبوں کے صدر قاضی۔ البتہ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی اور خود حضرت عمر اپنے گورنروں کو اجازت دیتے تھے کہ اپنے علاقے میں حسب ضرورت حکام عدالت خود مقرر کریں اور انھیں کافی تنخواہ دے کر مستغنی بنا دیں۔ [۹۲]

قاضیوں کا سخت غصے کی حالت میں فیصلے نہ کرنا، پیچیدہ مقدموں میں مشورے کرنا، جھوٹے دعوے، جھوٹی شہادت اور جانبدارانہ فیصلوں پر سخت وعیدیں، رشوت اور سفارش کی ممانعت، مبہم فیصلوں (قضاء بقضائین) کی ممانعت، وغیرہ امور زیادہ تر ادب القاضی سے متعلق ہیں۔ [۹۳] ان پر اس مختصر اشارے کے بعد ایک اہم تر چیز کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

عدل گستری کے لئے حق و ناحق میں امتیاز کرنے کے لئے ایک معیار یعنی ایک قانون کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ فیصلوں میں ہر جگہ یکسانی رہے اور لوگوں کو اپنے حقوق و فرائض پہلے ہی سے معلوم رہیں اور ساتھ ہی ان احکام کی خلاف ورزی کے لئے ایک تدارک اور ایک تہدید بھی مقرر کردی جائے تاکہ ان کی پابندی زیادہ سے زیادہ ہوسکے۔

تدارک کے لئے عام طور پر صرف حکومت کی قوت کام میں لائی جاتی ہے لیکن پوشیدہ جرائم خاص کر جھوٹی تاویلوں کی اس سے روک تھام نہیں ہوتی۔ اسی لئے اسلام نے برائیوں کی اصل جڑ پر وار کیا اور احکام کو ایک تقدس دے دیا تاکہ ہر فرد رعیت خوف سے نہیں بلکہ بہ رضا و رغبت اور نہ صرف ظاہر بلکہ باطن میں، حکومت کی دار و گیر سے بالکل باہر بھی، ہر جگہ اپنے فرائض بجالائے اور جرم و گناہ سے بچے۔ حشر و حساب کا عقیدہ بھی اس کو موثر بنانے میں بڑا حصہ لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مقنن اصلی اور سر چشمہ احکام صرف خدائے حکیم و قدیر کی ذات ہے جس کا کوئی حکم نامناسب یا ظالمانہ نہیں اور جو انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے ان کے اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور اسی کے مطابق سزا یا جزا دے گا۔ آنحضرت ایک پیغبر تھے اور خدا کا پیغام بندوں تک پہنچاتے تھے، اپنے دل سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ ''وَمَا ینطِقُ عنِ الھوَیٰ اَن ھُو اِلا یوحی اوحیٰ'' [۹۴]۔

غرض خدا نے اپنے احکام کچھ تو اپنی ''کتاب'' [۹۵] یعنی قرآن کی صورت میں دئے جو ابتدائے اسلام سے تھوڑا تھوڑا نازل ہو کر آنحضرت کی زندگی میں مکمل ہو گیا۔ اس کے سوا کچھ اور احکام آنحضرت کے قول و فعل کے ذریعے سے پہنچائے گئے اور قرآن ہی میں ان کے واجب التعمیل ہونے کی صراحت کر دی گئی۔ [۹۶]۔

یہ تو راست قانون سازی تھی۔ فقیہ، مجتہد، قاضی وغیرہ اسی قانون موضوعہ کے پابند ہوتے ہیں گو جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل گورنر یمن کے سلسلے میں بیان کیا گیا، اجتہاد اور صوابدید نیز استحسان کے لئے گنجایش رکھ کر قانون میں ضرور لچک پیدا کر دی گئی۔

قرآن و حدیث اور آرائے مجتہدین یعنی اجماع و قیاس سے قانون اسلام کا انتخاب، استنباط، تدوین اور ترقی اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ البتہ اس مختصر خاکے کے آخر میں ان حقوق اساسی کا ذکر بے محل نہ ہو گا جو آنحضرت صلعم نے حجتہ

الوداع (۱۰ھ) کے موقع پر اپنے جبل الرحمۃ کے مشہور پہاڑی خطبے میں[۹۷] حلقہ بگوشان اسلام کے لئے مقرر فرمائے یہ خطبہ مسلمانوں کی تاریخ تمدن میں ایک منشور انسانیت کا کام دیتا ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

ہر شخص کے تین بنیادی حقوق یعنی جان، مال، آبرو محفوظ اور قابل احترام ہیں۔

- امانت (اور قرض) واپس ادا کئے جائیں۔
- زمانہ جاہلیت کا سود ممنوع کیا جاتا ہے اور فی الوقت واجب الادا سود بھی نہیں دلائے جائیں گے، صرف اصل واپس ملے گا۔ خود حضرت عباس کے سود بھی کالعدم کئے جاتے ہیں۔
- زمانہ جاہلیت میں کئے ہوئے خون لوگ اب بھول جائیں اور ان کے بدلے اور انتقام کا خیال نہ کریں۔ خود آنحضرت اپنے چچازاد بھتیجے کا خون معاف کرتے ہیں۔
- زمانہ جاہلیت کے تمام آثار مٹا دیئے جاتے ہیں سوائے خانہ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کے پانی کے انتظام کے۔
- قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا اور شبہ عمد میں سو اونٹ خون بہا دیا جائے گا۔

سال کبیسہ کی تقویم برخاست کی جاتی ہے اور قمری سنہ رائج کیا جاتا ہے جس میں بارہ مہینے ہوتے ہیں۔

- میاں اور بیوی کے ایک دوسرے پر حق ہوتے ہیں۔ شوہر کا حق یہ ہے کہ بیوی پاکدامن رہے اور ان لوگوں کو گھر میں داخل ہونے نہ دے جن کو شوہر ناپسند کرتا ہے۔ بیوی کا حق یہ ہے کہ شوہر اسے اچھا کھلائے اور پہنائے۔ عورتیں ایک امانت ہیں۔ ان سے سلوک میں خدا سے ڈرو اور اچھا برتاؤ کرو۔
- سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں بلا رضا مندی کوئی کسی کا مال نہ لے اور نہ آپس میں لڑائی کرے۔
- میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان کو تھامے

رہو گے، تم بھٹکو گے نہیں۔ وہ قرآن اور سنت ہیں۔ اور میں تمھیں میرے اہل بیت سے سلوک کے متعلق بھی تاکید کرتا ہوں۔

- سب لوگوں کا رب بھی ایک ہی ہے اور سب آدمیوں کا باپ بھی ایک ہی ہے۔ تم آدم سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ خدا کے نزدیک تم میں سے محترم ترین وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو، ورنہ کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فضلیت نہیں۔
- وراثت کے لئے حصے خدا نے مقرر کر دئے ہیں۔ وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی روا نہیں.
- بچہ فراش (عورت؟) کا ہوگا اور زانی کو پتھر ملیں گے۔
- نسب اور ولا میں جھوٹے دعوے اور کوششیں ایک ملعون فعل ہیں۔

یہ ایک سرسری خاکہ ہے جو ابتدائے اسلام کے، زیادہ تر طرز عمل اور نظائر کی روشنی میں، مرتب کیا گیا۔ اور یہی طرز عمل بعد کے زمانوں میں ہمیشہ تمام دنیائے اسلام کے لئے ایک قابل عمل نمونے اور ایک واجب التعمیل نظیر اور حکم کا کام دینے لگا۔ اسلامی تصور عدل کے متعلق چند آیتوں کی تلاوت سے اسے ختم کرتا ہوں:۔

- **ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ولایجر منکم ستنان قوم علی الاتعدلوا اعدلوھو اقرب للتقوی** ۔ خدا انصاف اور احسان دونوں کا حکم دیتا ہے کسی کی شخصی مخالفت کے باعث ناانصافی کے مجرم نہ بن جاؤ بلکہ عدل کرو اور یہی متقی کی شان ہے۔
- **جَزآء سیئۃ مثلُھا فَمَن عفا واَصلَحَ فأجرہ علی اللہ.** برائی کا بدلہ مساوی برائی ہے (زیادہ نہیں) لیکن اگر کوئی عفو اور صلح سے کام لے تو خدا اس کا اجر دے گا
- **وَان عَاقبتم فَعَاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولین صبرتم لھو خیر للصابرین** ۔ اگر بدلہ لینا چاہو تو اتنا ہی لو جتنا تمھیں نقصان پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اگر صبر کرلو تو یہ بہتر ہے۔ (مطبوعہ مجلّہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ سالنامہ ۱۹۳۶ء)

حواشی:

[۱] ۱۸۹۴ء میں قایم شدہ اوردیسی ریاستوں میں سب سے پہلی (دیکھئے اخبار ہندو مدراس، مورخہ ۱۱رفروری ۱۹۳۷ء ضمیمہ سلور جوبلی ص ۵ مضمون راجہ کرشنا چار سابق معتمد مجلس وضع قوانین ومشیر قانون، حیدرآباد

[۲] Gemeinwesen ohne obrigkeil Ein Regieren beisst Richten

حکومت کرنے کے معنی ہی ہیں انصاف کرنا

[۳] قرآن مجید ۳۸/۲۷ (یہ ایک ابتدائی مکی سورت ہے

[۴] قرآن مجید ۲:۶۵و۲:۲۸۳و۲:۱۴۰و۲:۲۸۲و۲۲:۱۳و۵:۶۷ وغیرہ وغیرہ۔

[۵] (''یعمل فی الاسلام بفضائل الجاھلیة'' (مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۲۵، حدیث بھی ہے۔

[۶] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۵تا۸۶۔ روض الانف للسہیلی ج اص ۹۰ تا ۹۴۔طبقات ابن سعد ج ۱/۱ ص ۴۲۔مسند احمد ابن حنبل ج اص۔۱۹۔ نیز محمد بن حبیب کی کتاب المحبر اور کتاب المنمق، برموقع

[۷] علاوہ اس قول کے (دیکھیے حوالہ بالا) کہ اگر مجھے اس کی دہائی دے کر بلایا جائے تو میں اب بھی مدد کو دوڑوں یہاں اراشی شخص کے واقعے کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جس کا ابن ہشام میں صفحہ ۲۵۷ تا ۲۵۸ پر ذکر کیا گیا ہے۔

[۸] (صبح الاعشی اللقلقشندی ج ۱۳ص ۳۵۲ [۹] یہ ایک عبرانی لفظ کا معرب ہے

[۱۰] مثلاً دیکھئے صبح الاعشی ج اص ۳۹۸ تا ۹۹

[۱۱] انسائیکو پیڈیا آف اسلام، تحت'' کاہن'' نیز سیرۃ ابن ہشام ص ۳۶ بیان جاحظ ۱/۱۱۳۔

[۱۲] امیل تیان کی فرانسیسی تالیف'' ممالک اسلامیہ کی تاریخ نظام عدلیہ'' جلد اول ص ۲۸۸ (غالباً بحوالہ جاحظ۔حوالہ واضح نہیں ہے)۔

[۱۳] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۲ ص ۲۰۶، سیرۃ ابن ہشام ص ۷۸ تا ۷۹۔ الاشتقاق لابن درید ص ۱۲۴،''تحاکموا الیه حتی خرف وھو الذی قرعت له العصا ۔نیز اغانی ۳/۸۹

(طبع جدید)

[۱۴] نقائض جریر وفرزدق ص ۱۰۵، ۱۳۹، ۴۲۸ وغیرہ۔ نیز کتاب الازمنہ والامکنہ للمرزوقی ج ۲ ص ۲۷۳ تا ۲۷۴۔ اشتقاق ابن درید ص ۱۷۲ (ہرم بن قطبہ، کے متعلق کہ عامر بن الطفیل اور علقمہ بن علاثہ نے اسی سے رجوع کیا تھا)۔

[۱۵] کتاب المعارف برموقع۔ نیز مرزوقی ۲ ص ۷۹ تا ۸۰۔

[۱۶] عقد الفرید لابن عبدربہ، ج ۲، ص ۴۵ تا ۴۶۔ نیز ابن حبیب کی کتاب المحبر کا باب ''قریش کے حکم''

[۱۷] ابن کثیر کتاب مذکور ج ۲، ص ۲۰۷۔ ابن ہشام ص ۷۹ تا ۸۰ (بخران کے ایک عیسائی سردار کی عدالتی مراجعیت کے لئے اشتقاق ابن درید ص ۲۱۸

[۱۸] ابن حبیب کی کتاب المحبر (مطبوعہ حیدرآباد) ص ۱۳۴ نیز تاریخ یعقوبی جلد اول، حکام العرب۔

[۱۹] مزید تفصیلوں کے لئے دیکھئے Emil Tyan Histoire del, organisation Judiciaet En Pays Dslam, Paris, 1983 Vol. I inloco درخت تحکیم کے لئے نقائض جریر وفرزدق ص ۴۳۸۔ حکم کی اونی پوشاک کے لئے بیان جاحظ (۳/۶۶: الحکم لایفارق) ''السید المعمم'' اور ''العمائم تیجان العرب'' سے بھی استنباط کیا جاسکتا ہے۔

[۲۰] تاریخ یعقوبی جلد (۱) ص ۲۹۹۔ خونی مقدمات کی مزید نظیروں کے لئے دیکھئے اشتقاق ابن درید، ص ۲۶۶۔ معارف ابن قتیبہ ص ۱۸۹۔ آغانی ۳/۱۹۔ مالی معاملات کے نظائر کے لئے نویری کی نہایۃ الارب ۳/۱۲۹۔ معارف ابن قتیبہ ص ۹۲، ۹۶ سیرۃ ابن ہشام ۷۷۔ آبرو، مفاخرہ وغیرہ کے لئے نویری ۳/۱۲۷، اغانی ۱/۱۷۳، مستطرف الشبیہی ۲/۷۳، بیان جاحظ ۱/۱۱۷۔ نیز عبدالمطلب کی مفاخرت اور جیت کے لئے محمد بن حبیب کی کتاب المحبر، ص ۱۷۳ اور کتاب المنمق برموقع۔

ایسی بھی نظیریں ملتی ہیں کہ لوگوں نے حکم بنائے جانے سے انکار کیا ہو اور یکے بعد دیگرے متعدد لوگوں سے درخواست کے بعد بالآخر کسی نے قبول کیا ہو مثلاً آغانی ۱۵/۵۷،

نقائض جریر ص ۱۳۹، اشتقاق ابن درید ص ۱۷۳۔

عورتیں بھی حکم بنتی رہی ہیں۔ عامر بن الظرب کی بیٹی، ''من حکیمات العرب'' کہلاتی تھی۔ عورتیں کاہنہ بھی ہوتیں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

یہاں کے اکثر حوالوں کے لئے میں امیل تیان کی مذکورہ فرانسیسی تالیف کا ممنون ہوں۔

[۲۱] یاد رہے کہ دخیل، مولا اور حلیف افراد کا یہ طبقہ (جسے دیگر اصلی افراد قبیلہ سے عام حقوق کچھ کم حاصل ہوتے مثلاً وہ کسی اجنبی کو اپنی پناہ میں نہ لے سکتا جیسا کہ ابن ہشام نے سیرۃ رسول اللہ کے ص ۲۵۱ پر بیان کیا ہے) صرف ان فرار شدہ پناہ گزینوں ہی پر مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں آزاد شدہ غلام اور غیر قبائل بلکہ غیر عرب کے عام افراد بھی باہمی رضامندی سے شریک ہوتے تھے۔ اور یہ رواج اسلام نے بھی بہت کچھ باقی رکھا اور غیر کو عرب بنانے میں اس سے عرب مسلمانوں نے بڑی مدد لی۔

[۲۲] ابن ہشام ص ۳۴۱ تا ۳۴۴۔ کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۵۱۷ ص ۲۰۲ تا ۲۰۵ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶۔ نیز ابن سید الناس وغیرہ۔

[۲۳] ہابس، روسو وغیرہ کے ''معاہدہ عمرانی'' میں بادشاہت اور مملکت کا آغاز بیعت کے ذریعے سے ہونا قیاس کیا گیا ہے بیعت عقبہ اور زیر ذکر معاہدے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ چاہے اور بستیوں میں بھی یہی طریقہ رہا ہو یا نہ ہو، اسلام میں واقعی یہی ہوا۔ کوئی تعجب نہیں جو ان اہل یورپ کے قیاس کا ماخذ یہی اسلامی بیعتیں رہی ہوں۔

[۲۴] ملاحظہ ہو یہ کہا گیا کہ ''انھیں چاہیئے کہ مطالبہ نہ کریں'' اور یہ نہیں کہا گیا کہ ''وہ مطالبہ نہیں کر سکتے'' اس پر طویل اور اہم بحث کہ غیر مسلم ذمی کے قصاص میں مسلمان کو قتل کیا جا سکتا ہے اور خود فعل نبوی بھی ابن رشد کی ھدایۃ المجتھد میں ''کتاب القصاص'' میں مذکور ہیں حنفی مذہب بھی یہی ہے اور مذکورہ ممانعت حربیوں سے متعلق کی جاتی ہے۔

[۲۵] اس کے ساتھ ملاحظہ ہو قرآن مجید (۳۳:۳۶) وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ

فقد ضل ضلا لا مبيناً (یہ سورہ احزاب کی آیت ہے جو مدنی ہے) قبیلہ واری، افراتفری کی جگہ مرکزیت پیدا کرنے کے لئے علاوہ ایک خاص شخص کو ہمہ گیر حکمران تسلیم کرنے کے۔ مرکزی حکومت کو زکات (جائدادی ٹیکس) دینا اور مرکزی حکومت کی جبری فوجی خدمت (بذریعہ جہاد) اور مرکزی حکومت کے تمام قوانین کی تعمیل یہ تین اہم اصول اختیار کئے گئے تھے۔ نتیجہ کی کامیابی کسی تذکرے کی محتاج نہیں۔

[۲۶] اس دستاویز کی غیر معمولی اہمیت کے باعث متعدد مولفوں نے اس سے خصوصی بحث کی ہے۔ جس کی تفصیل اوپر متعلقہ باب میں دی جا چکی ہے اس لئے یہاں حذف کی جاتی ہے۔

[۲۷] پہلے مقدمے کے لئے دیکھئے بخاری ۶۱: ۲۶۔ ۹۵: ۵۱. ابن ہشام ص۳۹۳ تا ۳۹۵ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۴ .التنبیہ للمسعودی ص ۲۴۷. دوسرے مقدمے کے لئے تفسیر طبری ج ۲۷ ص ۴۴ تا ۵۰۔ نیز بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی دارمی، احمد بن حنبل وغیرہ جن کے صفحوں کے حوالے فنسنک کی مفتاح کنوز السنہ میں لفظ قصاص کے تحت مل جائیں گے۔ اول الذکر مقدمے میں مسلمان مولفوں نے اس الزام کو دہرایا ہے کہ یہودیوں نے توریت کی تحریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ زنا پر رجم کی سزا کا حکم یہودیوں نے چھپا دیا تھا۔ اس کا ثبوت اب دیگر ذرائع سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ایک یہودی شرقیاتی پروفیسر (ٹارے کی تالیف جوئش فاؤنڈیشن آف اسلام) ہی نے یہ ناقابل تردید ثبوت ڈھونڈ نکالا ہے کہ ایک زانیہ کے گرفتار ہوکر آنے پر حواریوں نے حضرت عیسیٰ سے پوچھا توریت میں تو اس کی سزا رجم ہے اب آپ کیا حکم دیتے ہیں (دیکھئے انجیل یوحنا ۸/۵) توریت کے موجودہ ایڈیشن اس حکم رجم سے یکسر خالی ہیں۔

نجران کے عیسائیوں سے آنحضرت نے جو معاہدہ کیا تھا (اور جس کا متن ابن سعد وغیرہ میں ہے)اس میں بھی ان کی داخلی عدالتی خودمختاری برقرار رکھی گئی تھی۔

[۲۸] قرآن مجید ۵: ۴۲ تا ۵۰۔

[۲۹] کارالفسکی کا مضمون فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا ''قاموس تاریخ و جغرافیہ کلیسا'' عنوان انطاکیہ عمود ۵۹۲ تا ۵۹۴''۔

[۳۰] Assemani, Bible.. Orient. III, 2, P. XCVI. نیز دخویے کی فرانسیی'' یادداشت فتوح الشام'' ص ۱۰۶

[۳۱] یہ روما کے ڈے کورین سے مشابہ معلوم ہوتا ہے. اور نقیب سنوررین کے مماثل کہا جاسکتا ہے. عہد نبوی میں دس کا افسر عریف کہلاتا تھا تاریخ طبری ص ۲۲۲۴۔

[۳۲] سیرت نبوی کی کسی کتاب میں جنگ ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کا واقعہ ملاحظہ ہو۔ اس وقت نقیبوں اور عریفوں سے مدد لی گئی تھی

[۳۳] ''قد کان القاضی فی الصدر الاول یسمی مفتیا (المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۱۰۹)

[۳۴] ''التراتیب الاداریہ للکتانی ج ۱ ص ۵۶ بحوالہ ابن جوزی

[۳۵] ایضا بحوالہ موطا

[۳۶] مثلاً مبسوط سرخسی جلد ۱۶ ص ۶۷ میں ہے کہ'' ایک مرتبہ آنحضرت نے حضرت عمرو بن العاص سے فرمایا کہ ان دونوں کا قضیہ چکاؤ۔ کہا کہ کیا آپ کی موجودگی میں میں فیصلہ کروں؟ فرمایا کہ ہاں ۔ تو کہا کہ کس صورت پر؟ فرمایا کہ اس طور پر کہ اگر اجتہاد کرو اور صحیح چیز پر پہنچو تو دس نیکیوں کا ثواب ہوگا اور اگر خطا کر جاؤ تو ایک نیکی شمار ہوگی''

[۳۷] مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۸۷۔ ج ۴ ص ۲۰۵۔ ج ۵ ص ۲۶

[۳۸] مثلاً الاستیعاب نمبر ۱۴۵۵ [۳۹] مثلاً الاستیعاب نمبر ۱۰۰۱

[۴۰] ترمذی ۱۳: ۰۳ ابو داؤد کتاب الاقضیہ ۲۳: ۱۱ ۔ اعلام الموقعین لابن القیم ج ۱ ص ۷۳۔ طبقات ابن سعد ج ۲/۲ ص ۱۰۷ تا ۱۰۸۔

[۴۱] '' من عمل عملا لیس علیه امرنا فهورو'' (مسلم ۳۰: ۱۷ تا ۱۸) من استعملناه علی عمل فلیات بقلیله و کثیره فماادتی منه اخذ وما نهی عنه انتهی۔'' (ابوداؤد ۲۳: ۵)

[۴۲] متن کے لئے دیکھئے ابن ہشام ص ۹۶۱ تا ۶۲ طبری ص ۱۷۲۷ تا ۲۹۔

[۴۳] موطا باب العقول۔ نیز سنن نسائی بر موقع۔

[۴۴] بخاری باب کتاب العلم۔

[۴۵] قانون حمورابی دفعات ۱۱۶، ۲۱۰، ۲۳۰ (یہ بابل کا بادشاہ تھا اس کا قانون ایک کتبے پر ملا ہے۔

[۴۶] ایضا دفعات ۱۹۶ و ۱۹۷، ۲۰۰۔ [۴۷] تائید کے لئے قرآن مجید ۵: ۴۵ نیز

Hammrabi. Code, P, IX, III. 143. anleya. Cook, The Moses and The Code of nmurapi, in Loco, The (Reviewed in o12, Berlin 904, by) kohler)

[۴۸] خطبہ حجۃ الوداع میں بھی، اس کا ذکر ہے

[۴۹] حدیث:۔ انما الاعمال بالنیات، صحاح ستہ میں

[۵۰] موطاء وغیرہ میں باب العقول ملاحظہ ہو۔

[۵۱] ان اللہ یا مر بالعدل والا حسان (قرآن مجید ۵.۴۵) نیز استحسان اور استصلاح کا ذکر اصول فقہ کی کسی کتاب میں

[۵۲] قرآن مجید (لاتزرُ وازر ۃ وزر اخریٰ) ۶: ۱۶۴، ۱۷: ۱۵، ۳۵: ۱۸، ۳۹: ۷، ۳۵: ۲۸)

[۵۳] حدیث: ''ادروا الحد ود بالشبہات'' (بدایۃ المجتہد لابن رشد'' کتاب القصاص'') نیز ''ادروا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلو اسبیله فان الامام ان یخطی فی العفو خیر من ان یخطی فی العقوبة'۔ (ترمذی ۲/۱۵)

[۵۴] انگلستان میں ابھی گزشتہ انیسویں صدی کے وسط تک کسی گاڑی، کسی درخت اور کسی دوسرے جاندار'' قاتل'' کو بھی قانونا سزائے قتل دی جاتی تھی دیکھئے۔ باب بادز کی انگریزی'' اخلاق ارتقاء کی حالت میں'' ''باب'' قانون وانصاف۔ اس طرح جاہل عرب ہی کا زیادہ معقولیت پسند ہونا معلوم ہوتا ہے

[۵۵] کتاب الخراج ص ۱۳

[۵۶] استصواب کے سلسلے میں عتاب بن اسید گورنر مکہ نے جو مسلموں کو سابقہ قرض کا واجب الاداسود دلانے یا نہ دلانے کے متعلق آنخضرت سے دریافت کیا تھا (تفسیر طبری و خازن میں آیت ''ماتقی من الربوا'' کے تحت) اسی طرح استصواب، مرافعہ، نگرانی یا تصیح (معلوم نہ ہوسکا کس) کے سلسلے میں آنخضرت نے ایک افسر الضحاک بن سفیان کو لکھ بھیجا کہ اشیم ضعیابی کی بیوی کو اس کے شوہر کے خون بہا میں سے ورثہ دلائے (الوثائق السیاسیہ)

[۵۷] مسند ابن حنبل ج ا ص ۳۴۳،۳۶۳

[۵۸] ورنہ قدیم عرب میں ملزم کا کھوج لگانے کے ''روحانی'' قوتوں سے مدد لی جاتی اور فال، قرعہ، جادو، ٹوٹکے، دیوبانی، ہاتھی جیسے غیر یقینی ذرائع برت میں آتے یا غیب دانی کے مدعی عراف، کاہنوں وغیرہ کی من گھڑت باتوں پر عمل کیا جاتا

[۵۹] اس مسئلے پر ایک مختصر بحث اور حضرت ابوبکر و عمر کے اقوال و اعمال کے لئے دیکھئے الطرق الحکمۃ لابن القیم ص ۴۷ تا ۶۷

[۶۰] بخاری ۳۰: ۴تا۷۔ ترمذی ۳: ۱۱تا۷۔ ابوداؤد ۲۳: ۷ ابن ماجہ ۱۲: ۵ نسائی ۴۹: ۱۳،۲۳۔ ابن حنبل ج ۱۱ ص ۹۰ تا ۹۱۔ نیز اقفیہ رسول اللہ للقرطبی ص ۸۲۔ ابن القیم، الطرق الحکمہ ص ۲۶۶۔

[۶۱] ترمذی ۱۳: ۵۔ ابوداؤد ۲۳: ۶۔ ابن حنبل ج ا ص ۱۱۱، ۱۴۹، ۱۵۰، ۹۰، ۹۶۔ کتانی ج ا ص ۲۵۷ تا ۶۱ [۶۲] ابن حنبل ج ا ص ۲۸۸۔

[۶۳] البینة علی المدعی و الیمین علی المدعی علیه (والیمین علی من انکر) بخاری ۴۸: ۶، ۵۲: ۲۰۔ مسلم ۳۰: ۱، ۲۔ ابوداؤد ۲۱: ۱۳، ۲۳: ۲۳، ۲۴ ترمذی ۱۳: ۱۲ نسائی ۴۹: ۳۶، ابن ماجہ ۳۶: ۸ ابن حنبل ج ا ص ۳۴۲، ۳۵۱، ۳۵۶، ۳۶۳۔ المبسوط للسرخسی ج ۱۷ ص ۲۸۔ الطرق الحکمیۃ لابن القیم ص ۹۴)

[۶۴] مسلم ۳۰: ۱. ترمذی ۱۳: ۱۳. ابوداؤد ۲۳: ۲۱ (چنانچہ قضی بشاہد و یمین)

[۶۵] الطرق الحکمیۃ ص ۱۲۸

[۶۶] المبسوط للسرخسی ج ۱۶ ص ۹۱. نیز محاضرة الاوائل ص ۹۷

[٦٧] الطرق الحمکمیة لابن القیم ص ٦٠

[٦٨] سنن نسائی میں کتاب آداب القضاة دیکھئے

[٦٩] المعارف لابن قتیبہ ص ٢٢١، وفیات لابن خلکان برموقع. استیعاب لابن عبدالبر، نمبر ٣١٥٩

[٧٠] اعلام لموقعین لابن القیم ج ١ ص ٣٠. بعض اور تفصیلوں کے لئے دیکھئے المبسوط ج ١٦ ص ٦٦. کنز العمال ج ٣ ص ١٧٥)

[٧١] اعلام ج ١ ص ٣٧ تا ٤٧ آخری جملے کی تائید کے لئے دیکھئے، سنن نسائی کتاب آداب القضاة۔ نیز المقارنات ص ٧٢

[٧٢] بحوالہ السیاستہ الشرعیہ بعبد الوھاب الخلاف ص ٤٧

[٧٣] تفصیل کے لئے امیل تیان کی مذکورہ بالا فرانسیسی تالیف، برموقع

[٧٤] بنام حضرت ابوعبیدہ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ٦٧) بنام حضرت معاویہ (المبسوط للسرخسی ج ١٦ ص ٦٥. العقد الفرید لابن عبدربہ ج ١ ص ٢٥). دیگر بنام شریح (مبسوط ج ١٦ ص ٦٦. کنز العمال ج ٣ ص ١٧٥) بنام حضرت ابوموسیٰ علاوہ اس کے جس کا آگے ذکر ہے، (العقد الفرید ج ١ ص ٢٦)

[٧٥] مبسوط ج ١٦ ص ٦٠

[٧٦] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن ١٩١٠ء ص ٣٠٧ تا ٣٢٣

[٧٧] مثلاً السرخسی نے مبسوط ج ١٦ ص ٦٠ و مابعد میں اور ابن القیم نے اعلام الموقعین جلد اول میں

[٧٨] عربی متن اور جلد عربی ماخذوں کے لئے دیکھئے مارگو لیوث کا مذکورہ مضمون نیز میری تالیف الوثائق السیاستہ، دستاویز، ص ٣٢٧

[٧٩] کتانی ج ١ ص ٢٦٤ بحوالہ ہدایہ۔ (" وفرض له اربعین اوقیته من فضة" المنتقی فی اخبار ام القری للفاکھی ص ٤٠

[٨٠] مبسوط ج ١٦ ص ١٢٢

[٨١] ابوداؤد ٢٣: ٢٨. قرطبی ص ٤ تا ٥. کتانی ج ١ ص ٢٩٦)

[۸۲] مبسوط ج ۲۰ ص ۷۵ [۸۳] مبسوط ج ۲۰ ص ۸۸ قاموس وغیرہ میں مادہ حبس

[۸۴] ابن ہشام ص ۴۴۴. ابن الاثیر ج ۲ ص ۲۴۱، مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ ۸۲ تا ۸۴

[۸۵] مبسوط ج ۱۶ ص ۷۳، ۷۴، ۱۲۴۔ طبقات ابن سعد ۱/۲ ص ۹۷۔ کتاب الخراج لابی یوسف ص ۶۵

[۸۶] ولاۃ مصر للکندی ص ۳۵۶ تا ۳۵۷۔ الحکم بن ہشام بن عبد الرحمٰن الداخل کے لئے دیکھئے مقری کی نفح الطیب۔ طبع یورپ، جلد ۱، ص ۵۵۷ میں اس حوالے کے لئے پروفیسر جمیل الرحمٰن مرحوم کا ممنون ہوں اسی طرح ماوردی کی الاحکام السلطانیہ میں بھی مجھے کچھ واقعات ملے ہیں

[۸۷] کتاب الاذکیاء (مخطوطہ باڈلین) ورق ۳۳ ب نیز دیکھئے کتاب القارنات ص ۲۹

[۸۸] بحوالہ کتانی ج ۱ ص ۲۷۱ تا ۲۷۲

[۸۹] بصیر بالبناء) کتانی ج ۱ ص ۲۸۰ تا ۸۱

[۹۰] (خراص) کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۱۴۳۵ تا ۸۶. نیز بکثرت دیگر حوالے

[۹۱] الطرق الحکمیہ لابن القیم ص ۱۹۶ مزید حوالوں کے لئے مفتاح کنوز السنہ عنوان قائف

[۹۲] الکتانی، التراتیب الاداریہ، ج ۱، ص ۲۶۰

[۹۳] ہر فقہی کتاب میں باب آداب القضاء ملے گا۔ نیز دیکھئے شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ ص ۱۲۴ تا ۲۷ اور مفتاح کنوز السنۃ مولفہ فنسک میں متعلقہ احادیث کے لئے تحت لفظ ''قضاء''

[۹۴] قرآن سورۃ نجم آیت ۳۔ [۹۵] لفظ کتاب کے معنے فرض مقررہ کے بھی ہیں

[۹۶] قرآن ۲۳:۲۱۔ ۵۹:۷. وغیرہ۔

[۹۷] پورے متن کے لئے دیکھئے ابن ہشام ص ۹۶۸ تا ۷۰. تاریخ طبری ص ۱۷۵۳ تا ۵۵. البیان والتبیین للجاحظ ج ۲ ص ۲۴ تا ۲۶. تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۲ تا ۲۳. العقد الفرید لابن عبد ربہ باب خطب وغیرہ وغیرہ نیز میری عربی تالیف الوثائق السیاسیۃ برموقع

عہد نبوی کا نظام تعلیم

عرب اور خاص کر مکہ معظمہ کی معاشرتی حالت کا جو قبل اسلام پائی جاتی تھی، اگر قریب سے مطالعہ کیا جائے، تو ناگزیر اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ اس زمانے کے عربوں میں غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ جب اسلامی تعلیمات نے ان صلاحیتوں کو صیقل کیا، تو عربوں نے اپنی اپج اور کارکردگی کی قابلیت سے دنیا کو حیران کر دیا۔ اور جب ''وحدت اور حرکت کے مذہب'' یعنی اسلام نے ان کی توانائیوں کو ایک مرکز پر جمع کیا، اور اس طرح ان میں مزید قوت پیدا کر دی تو یہی عرب اس قابل ہو گئے کہ پوری دنیا کو مبارزت دیں، اور وقت واحد میں اس وقت کی دونوں عالمگیر شہنشاہیوں یعنی ایران اور روم (بیزنطیہ) سے جنگ کریں۔

میں نے اپنے بعض مقالوں میں کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے، کہ زمانہ جاہلیت کی عربی خانہ جنگیاں عربوں کے کردار کو بنانے اور ان میں حیرت انگیز قوت برداشت اور دیگر اعلیٰ مہمات پسند قابلیتیں پیدا کرنے میں ممد و معاون ہیں جن پر خود نپولین [۱] کو رشک تھا۔ عرب میں معینہ اوقات پر لگنے والے بازاروں اور کاروانوں کی حفاظت کے لئے بدرقوں یا خفاروں کا انتظام کچھ اتنا مکمل اور وسیع ہو گیا تھا کہ اس نے پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی ''وفاق'' قائم کر دیا تھا، [۲] جس سے عربوں میں وحدت کے خیالات پیدا ہونے لگ گئے تھے، اور اسلام کے تحت ان کی ''سیاسی وحدت'' کا

راستہ صاف ہوگیا تھا۔ اسی طرح شہری مملکت مکہ کا دستور بھی خاصا ترقی یافتہ تھا، جس سے وہاں کے باشندوں کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی، کہ ایک عالمگیر شہنشاہیت کے نظم ونسق کو چلا سکیں۔[۳]

یہاں میرے پیش نظر ایک اور مسئلہ ہے، اور وہ یہ کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کی علمی صلاحیتیں بھی اتنی خاصی تھیں، کہ ہجرت کی ابتدائی صدیوں میں عربوں نے علوم و فنون کی حیرت انگیز فصلیں کاٹیں، انھیں صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کی خفتہ قابلیتوں کو بیدار کرنا، اور ان کو مفید اغراض میں کام میں لانا، یہ البتہ اسلام کا کارنامہ ہے۔

عہد نبوی کے نظام تعلیم کا اس سے بہتر پس منظر کیا ہوگا، کہ اسلام سے پہلے عرب میں علمی حالت جیسی کچھ تھی، اس کا خاکہ پیش کیا جائے۔

عرب میں زمانہ جاہلیت میں تعلیم:

بدقسمتی سے ہمارے پاس زمانہ جاہلیت کے تعلیمی معاملات کے متعلق بہت کم معلومات محفوظ ہیں۔ اس کی کچھ تو یہ وجہ ہے، کہ اس زمانے میں وہاں لکھنے کا زیادہ رواج نہ تھا، اور کچھ یہ کہ لاکھوں کروڑوں کتابیں ہلاکو خاں وغیرہ نے بغداد، قرطبہ اور دیگر مقامات پر ایسے زمانے میں تباہ کردیں، جب کہ ابھی فنِ طباعت سے کتابیں چھاپنے کا کام نہیں لیا جانے لگا تھا۔ اس دشواری کے باوجود کچھ تھوڑا بہت مواد ہم تک پہنچ سکا ہے، اس کی مدد سے زمانہ جاہلیت کی تعلیمی حالت کا پتہ چلتا ہے، جس سے ہمیں حیرت ہوتی ہے، اور اس قوم کے متعلق رشک ہونے لگتا ہے جو ان پڑھ ہونے پر اتراتی تھی۔[۴]

اولاً ان کی زبان کو لیجئے، یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ کوئی زبان اپنے لغات، محاورات اور ادبی کمالات میں اس زمانے میں ترقی کرتی ہے، جب اس کے بولنے والوں کا تمدن عروج پر ہو، اور اس سے پہلے اس زبان کی حالت اتنی پست ہوتی ہے،

کہ اس کو جانوروں کی آواز سے کچھ ہی بلند قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس وقت اس زبان میں نہ تو اونچے خیالات ادا کئے جاسکتے ہیں، اور نہ معمولی روزمرہ کی ضرورتوں کے سوا اس میں کوئی علوم وفنون ملتے ہیں۔ اگر اس معیار پر اسلام سے عین پہلے کی عربی زبان کو جانچا جائے، تو ہم زبان کی نزاکت، لغات کی کثرت، قواعد صرف ونحو کے استحکام، اور خاصے بلند معیار کے نظم کے ذخیرے کے باعث حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ مستند عربی زبان زمانہ جاہلیت کی سمجھی جاتی ہے، اسلامی تمدن کے عہد زرین کی زبان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اگر ہم زمانہ حال کی کوئی زبان مثلاً جرمن، روسی، فرانسیسی یا انگریزی کو لیں تو ان کے دو مولف جن میں مثلاً ڈیڑھ ہزار سال کا زمانہ حائل ہوتو ایک ہی زبان کے یہ مؤلف ایک دوسرے کو بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے برخلاف امرالقیس کی زبان اور قواعد صرف ونحو بالکل وہی ہیں، جو مثلاً زمانہ حال کے مصری شعراء شوقی اور حافظ کے ہیں۔ قرآن اور حدیث اس ''جاہلی زبان'' میں ہیں جس پر عربی شہنشاہیت کے تمدن نے کوئی اثر قائم کرنے کا موقع نہیں پایا تھا۔ قرآن اور حدیث زمانہ جاہلیت کے بدویوں کو بھی اسی سہولت سے سمجھ میں آتے تھے، جتنا آج کسی جدید عربی کے متعلم کو۔ اسی زمانے میں عربی زبان، لغات کی حد تک اتنی وسیع اور متمول ہوگئی تھی، کہ اس کا مقابلہ زمانہ حال کی انتہائی ترقی یافتہ مغربی زبانوں سے بھی بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ ان چیزوں کی مجھے تفصیل بیان کرنی غیر ضروری ہے، کیونکہ ہر عربی داں اس سے واقف ہے، میرا منشاء صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے، کہ اسلام سے پہلے عربوں کی زبان جس پختگی اور وسعت سے بہرہ ور ہو چکی تھی، وہ یقیناً اس بات کے بغیر ممکن نہیں، کہ اس سے پہلے اس زبان کے بولنے والوں میں ادبیات کی بڑی صلاحیتیں اور بڑے چرچے رہے ہوں۔

بے شمار نظمیں زمانہ جاہلیت کی طرف منسوب ہیں۔ خود نثر میں بہت سے خطبوں، تقریروں ضرب المثلوں، کہانیوں، کاہنوں، اور محکموں (پنچ) کے فیصلوں وغیرہ

کی صورت میں ہم تک ان کی یادگاریں پہنچی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے ہر ناظر یہ اندازہ کرے گا، کہ اس زمانے کے عربوں میں بلاغت، ظرافت، حسن ذوق اور وقت نظر کا معیار کتنا بلند تھا!

خود لفظ ''عرب'' کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنا مطلب اچھے طور سے واضح کر سکتا ہو۔ تمام غیر عرب ''عجم'' کہلاتے ہیں، جس کے معنی گونگے کے ہیں۔

یہاں تک تو استنباطات اور قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ خود تاریخی واقعات بھی مفقود نہیں ہیں۔

مدرسوں کے سلسلے میں کسے یقین آئے گا کہ اس زمانے میں وہاں نہ صرف تعلیم گاہیں تھیں بلکہ ایسی تعلیم گاہیں جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم پاتے ہوں؟ بہرحال ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (جلد ۴، ص ۱۰۳) میں بیان کیا ہے کہ مکے کے قریب رہنے والے قبیلہ ہذیل کی ضرب المثل فاحشہ عورت ظلمہ جب بچی تھی، تو ایک مدرسہ جاتی تھی، جہاں اس کا سب سے دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ دواتوں میں قلم ڈال اور نکال کر کھیلا کرے اس دلچسپ واقعہ سے اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قبیلہ قریش کے رشتہ دار قبیلہ ہذیل میں ایسے مدرسے تھے، جو چاہے کتنے ہی ابتدائی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، !ان میں لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پانے کے لئے جاتی تھیں۔

بازار عکاظ میں ہر سال جو ادبی چرچا ہوا کرتا تھا اس کے باعث اسے ایک ''بین العرب لٹریری کانگریس'' کہنا بے جا نہ ہوگا۔ عکاظ نے مورخین اور مؤلفین کو ہمیشہ سے ہی لبھا رکھا ہے۔ حال میں جامعہ مصریہ کے پروفیسر احمد امین نے مجلّہ کلیۃ الآداب میں اس موضوع پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے، مجھے یہاں عکاظ کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس قدر کافی ہے کہ اس ادارے کا صرف نام لے لیا جائے جس نے عربی زبان کو معیاری بنانے کے لئے اتنا نمایاں حصہ لیا ہے۔

غیلان بن سلمہ ثقفی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے،[۵] کہ وہ ہفتے میں ایک دن علمی جلسہ منعقد کرتا جس میں نظمیں پڑھی جاتیں، اور ان پر تنقید ہوتی۔ ہفتے کے باقی دنوں میں وہ کسی دن عدل گستری کا کام انجام دیتا اور کسی دن دوسرے فرائض میں مشغول ہوتا۔ اس واقعے سے معلوم ہوسکتا ہے، کہ جاہلیت میں طائف والوں کا علمی ذوق بھی کتنا بلند تھا!

اس زمانے میں مکے کی علم دوستی اس سے بھی کچھ زیادہ ہی بلند تھی سبع معلقات مکے ہی کے معبد، کعبے میں لٹکائے جاتے رہے، اور اسی اعزاز و امتیاز نے ان سات نظموں کو عربی ادبیات میں ایک لافانی زندگی عطا کردی ہے!

ورقہ بن نوفل مکے کا ایک باشندہ تھا۔ اس نے زمانے جاہلیت میں توریت اور انجیل کو عربی میں منتقل کیا تھا۔

غالباً یہ مکے والے ہی تھے، جنھوں نے عربی زبان کو سب سے پہلے ایک تحریری زبان کی حیثیت عطا کی تھی۔[۶] غالبا یہی وجہ تھی کہ یہاں کے اجڈ سپاہی بھی لکھے پڑھے ہوا کرتے تھے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

قصہ نویسی، ناول اور ڈرامہ زمانہ حال میں ادبیات میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مکے والوں کو بھی اس کا بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ چاندنی راتوں میں خاندانی اجتماع گاہوں پر یا شہر کے مرکزی دارالندوہ میں یہ لوگ جمع ہوتے، اور پیشہ ور قصہ گو وغیرہ وہاں برجستہ یا سنے ہوئے قصے بیان کرکے دلچسپی کا سامان مہیا کرتے، اس کے کچھ حوالے باب ''شہری مملکت مکہ'' میں ملیں گے۔ اصطلاحاً یہ ''مسامرہ'' کہلاتا۔

ادبی ذوق جاہلیت میں صرف عربوں ہی میں نہ تھا، بلکہ عرب میں رہنے والی دوسری قوموں میں بھی اس کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ یہودی سموال بن عادیا اور دیگر یہودی اور نصرانی شعراء کے دیوان بھی پائے جاتے تھے۔ مدینہ منورہ کے یہودیوں نے ایک بیت المدراس قائم کر رکھا تھا، جو نیم عدالتی اور نیم تعلیمی ادارہ ہوا کرتا تھا۔

اور اسلام کے آغاز تک اس کا پتہ چلتا ہے، (دیکھئے سیرۃ ابن ہشام میں غزوہ بنی قینیقاع وغیرہ)۔

زمانہ جاہلیت میں عربی زبان میں لکھنے پڑھنے کی چیزوں کے لئے بڑی کثرت سے الفاظ ملتے ہیں، چنانچہ صرف قرآن مجید میں ہی حسب ذیل الفاظ کا ذکر ہے:۔

رق اور قرطاس (کاغذ کے لئے) قلم، نون (دوات) نستنسخ، مرقوم مسطور، مستطر، مکتوب، تخطّہ، تملّی، یمّلل (لکھنے کے معنی میں جو مختلف افعال پائے جاتے ہیں، یہ ان کے صیغے ہیں) سَفَرہ، کاتب، مداد (سیاہی) اسفار، زبر، کتب، صحف (کتابوں اور تحریری چیزوں کے معنوں میں) وغیرہ۔ عہد نبوی میں تبلیغی اور دیگر خطوط سیکڑوں کی تعداد میں عرب کے طول وعرض کے قبائل کے نام جاتے رہے (میری الوثائق السیاستہ ملاحظہ ہو) اس سے بہ آسانی اس کا ثبوت مل جاتا ہے کہ لکھنا پڑھنا عرب کے ہر حصے میں رائج تھا۔ غرض ان اور اسی طرح کی مماثل بنیادوں پر علوم وفنون کی وہ بلند عمارتیں بعد میں زمانہ اسلام کے عربوں نے کھڑی کیں، جن پر پورے کرۂ ارض کی علمی دنیا فخر کرسکتی ہے۔

قبل ہجرت اسلام:

یہ چیز عام طور سے معلوم ہے کہ اسلام کا آغاز اس وقت سے ہوا جب حضرت محمد صلعم پر چالیس سال کی عمر میں وحی اتری۔ اس بات کا کوئی پتہ نہیں چلتا، کہ نوعمری میں آپ نے لکھنے اور پڑھنے کے فن میں حصہ لیا ہو۔ آپ عمر بھر امی ہی رہے۔ اس کے باوجود یہ کس قدر اثر انگیز واقعہ ہے، کہ خدا کے پاس سے آپ کو جو سب سے پہلے وحی آئی اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو حکم تھا کہ ''اقرء'' یعنی پڑھ، اور قلم کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی تھی، کہ جملہ انسانی علم اسی سے ہے:۔

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جو خالق ہے جس نے انسان کو ایک جمے

ہوئے قطرۂ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ یہ تیرا بزرگ رب ہی ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی اور انسان کو وہ چیز بتائی، جسے وہ نہیں جانتا تھا۔"

(قرآن مجید سورہ ۹۶۔ آیات ۱ تا ۴)

ایک حدیث میں رسول کریم صلعم نے بیان فرمایا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے قلم ہی کو پیدا کیا۔[۷]

سہولت کے لئے ہم بھی وہی مشہور تقسیم اختیار کر سکتے ہیں، جو قبل ہجرت و بعد ہجرت کے نام سے رسول کریم صلعم کی زندگی کے متعلق استعمال کی گئی ہے۔ اور اسی تقسیم سے وہ زمانے بھی متعین ہو جاتے ہیں، جب آپ کے ہاتھ میں دنیاوی اقتدار تھا یا نہ تھا۔ یہ امر نمایاں کئے جانے کے قابل ہے کہ قریب قریب وہ تمام آیتیں جن میں لکھنے پڑھنے یا علم سیکھنے کا ذکر ہے، وہ مکی آیتیں ہیں، اسکے برخلاف مدنی آیتوں میں کام کرنے اور تعمیل کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے، چنانچہ:۔

(۱) کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے، برابر ہو سکتے ہیں؟

(قرآن مجید ۳۹:۹)

(۲) تم کو علم سے تھوڑی مقدار دی گئی ہے۔ (قرآن مجید ۱۷:۸۵)

(۳) اللہ سے، اس کے بندوں میں صرف عالم ہی ڈرتے ہیں۔ (قرآن مجید ۳۵:۲۸)

(۴) اور کہہ میرے آقا مجھے علم میں زیادتی عطا کر۔ (قرآن مجید ۲۰:۱۱۴)

(۵) تمھیں وہ چیز سکھائی گئی، جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمھارے آباء واجداد۔

(قرآن مجید ۶:۹۲)

(۶) اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں، اور سمندر سات دیگر سمندروں کے ساتھ سیاہی بن جائے تو بھی خدا کے کلمات ختم نہ ہو سکیں۔ (قرآن مجید ۳۱:۲۷)

(۷) قسم ہے پہاڑ کی، اور قسم ہے ایک کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے ایک جھلی پر جو پھیلائی گئی ہے۔ (قرآن مجید ۵۲:۱ تا ۳)

(۸) قسم ہے دوات کی اور قلم کی اور اس چیز کی جو تم لکھتے ہو۔ (قرآن مجید ۶۸:۱)
(۹) اگر ہم نے تجھ پر ایک واقعی تحریری چیز کاغذ پر لکھی ہوئی بھیجی ہوتی۔
(قرآن مجید ۶:۷)
(۱۰) اگر تمھیں معلوم نہ ہو، تو یہ یاد رکھنے والوں سے پوچھ لو یہ تمام کلی آیتیں ہیں۔
(قرآن مجید ۱۶:۴۳)

کسی قوم میں کسی پیغمبر کا مبعوث ہونا تعلیم کے سوا کسی اور غرض کے لئے نہیں ہوتا، چنانچہ ہمیں حیرت نہ ہو کہ حدیث میں رسول کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ میں ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ [۸] اس کی تائید قرآنی آیتوں سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا ہے:۔

۱۔ (ابراہیم اور اسمٰعیل نے دعا کی): اے ہمارے آقا ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھیج، جو انھیں تیری آیتیں سنائے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے، اور ان کا تزکیہ کرے، تو ہی طاقتور اور عقلمند ہے۔ (قرآن مجید ۲:۱۲۹)

۲۔ وہی ہے جس نے امیوں میں انھیں میں کا ایک رسول بھیجا تا کہ انھیں اس کی ''آیتیں سنائے'' ان کا تزکیہ کرے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے، اگر چہ اس سے پہلے وہ فاش گمراہی میں مبتلا تھے۔ (ایضا ۶۲:۲)

۳۔ بیشک خدا نے ایمان والوں پر مہربانی کی جب اس نے ان کے پاس انہیں میں کا ایک رسول بھیجا، جو انھیں اس کی آتیں سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر چہ اس سے پہلے وہ فاش گمراہی میں مبتلا تھے۔ (ایضا ۳:۱۶۴)

حقیقت میں تبلیغ اور تعلیم ایک ہی چیز ہیں، خاص کر ایسے شخص کے لئے جو مذہب و سیاست کو بالکل ایک دوسرے سے الگ اور آزاد چیزیں نہ سمجھتا ہو، اور جس کا مطمح نظر یہ ہو کہ:۔ ''اے ہمارے رب! ہمیں اس دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت

میں بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا''۔ (قرآن مجید ۲:۲۰۱)

بیعت عقبہ ثانیہ جیسے ابتدائی زمانے میں، جو ہجرت سے بھی دو سال پہلے منعقد ہوئی تھی، کوئی ایک درجن مدینے والوں نے اسلام قبول کیا تھا، تو ان کی خواہش پر رسول صلعم نے ان کے ساتھ مکے سے ایک تربیت یافتہ معلم روانہ کردیا تھا[۹] روانہ کردیا تھا جو انھیں قرآن مجید کی تعلیم دے سکے، اور دینیات اسلام سے واقف کرا سکے۔ بے شبہ اس ابتدائی زمانے میں تعلیم سے مراد صرف مبادی دین اور عبادت کے طریقوں کی تعلیم ہی ہوسکتی تھی۔

زمانہ قبل ہجرت کی سب سے اہم چیز جو اس سلسلے میں بیان کی جاسکتی ہے، یہ تھی کہ آنحضرت صلعم نے کاتبوں کو مقرر کر رکھا تھا، جن کا کام یہ تھا کہ جیسے جیسے وحی نازل ہوتی جائے۔ اس کو لکھ لیں، اور اس کی نقلیں کریں۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرت عمر اسلام لانے لگے، تو انھیں قرآن مجید کی چند سورتیں اپنی بہن کے گھر میں لکھی ہوئی ملی تھیں اور بظاہر ان کی بہن بھی پڑھنا جانتی تھیں۔

اس سلسلے میں سب سے آخر میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو قرآن شریف کی ایک مکی سورت (کہف) میں مذکور ہے، کہ کس طرح وہ طلب علم کے لئے گھر سے نکلے، سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، اور دل دہلانے والے تجربے حاصل کئے۔ اس قصے کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہوجائے، ہر چیز نہیں جان سکتا، اور یہ کہ علم میں زیادتی کی خواہش ہو تو بیرونی ممالک کا سفر ناگزیر ہے۔[۱۰]

بعد ہجرت:

ہمارے پاس بعد ہجرت زمانے کے متعلق جو مواد ہے، اس کو سنہ وار ترتیب کی جگہ، فن وار مرتب کرنا زیادہ سہولت بخش ہوگا۔ مثلاً مدرسوں کا انتظام، امتحانات،

اقامت خانے، ابتدائی تعلیم اور لکھنا پڑھنا سکھانے کا بندوبست، اجنبی زبانوں کی تعلیم، نصاب تعلیم، عورتوں کی تعلیم، صوبہ جات میں تعلیمی انتظام، صوبہ جات میں دورہ اور تنقیح کرنے والے افسر وغیرہ۔

ہم ابھی اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے ہجرت سے بھی پہلے ایک معلم کو مدینہ منورہ روانہ کیا تھا جس کے کارنامے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ جب ہجرت کے بعد رسول کریم صلعم خود مدینہ منورہ پہنچے تو بیشمار اور بیحد اہم جنگی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود آپ اس کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے، کہ مدینہ منورہ سے ناخواندگی کو دور کرنے کے کام کی شخصی طور سے نگرانی کرسکیں، چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے سعید بن العاصؓ کا تقرر کیا تھا، کہ لوگوں کو لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم دیں، یہ بہت خوشنویس [۱۱] بھی تھے ایک دوسرے راوی کے الفاظ میں ان کو ''معلم حکمت'' بنایا گیا تھا۔ [۱۲] جس سے لکھنے پڑھنے کو جو عظیم اہمیت دی جاتی ہے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے رسول کریم صلعم کو خواندگی سے اتنی دلچسپی تھی، کہ ہجرت کے ڈیڑھ ہی سال بعد جب ساٹھ ستر مکے والے جنگ بدر میں گرفتار ہوکر مدینہ لائے گئے تو آپ نے ان لوگوں کو جو مال دار نہ تھے، ان کی رہائی کے لئے یہ فدیہ مقرر کیا تھا کہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھائیں۔ [۱۳] حضرت عبادۃ ابن الصامت کہتے ہیں، کہ رسول کریم صلعم نے مجھے صفے میں اس غرض سے مامور کیا تھا، کہ لوگوں کو لکھنے کی اور قرآن مجید کی تعلیم دوں۔ [۱۴]

صفے سے مراد مکان کا ملحق حصہ ہوتا ہے، یہ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا جو اس غرض کے لئے مختص کردیا گیا تھا، کہ باہر سے تعلیم کے لئے آنے والوں بلکہ خود مقامی بے گھر طالب علموں کے لئے دارالاقامے کا بھی کام دے اور مدرسے کا بھی۔ اس اقامتی درسگاہ میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں، فن تجوید سکھایا جاتا تھا اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم کا

بندوبست تھا، جس کی نگرانی خود رسول کریم صلعم شخصی طور سے فرمایا کرتے تھے ، اور وہاں رہنے والوں کی غذا وغیرہ کا بھی بندوبست کیا کرتے تھے، یہ طلبا اپنی فرصت کے گھنٹوں میں طلب روزگار میں بھی مصروف ہوا کرتے تھے۔[۱۵]

درس گاہ صفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا، بلکہ ایسے بھی بہت سے لوگ آتے تھے، جن کے مدینے میں گھر تھے، اور وہ صرف درس کے لئے وہاں حاضر ہوا کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً عارضی طور سے درس گاہ میں شریک ہونے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ان کی تعداد ستر بھی تھی۔[۱۶]

مقامی طلبہ کے علاوہ دور دراز کے قبائل سے بھی طلبہ آتے ، اور اپنا ضروری نصاب تکمیل کر کے اپنے وطنوں کو واپس ہو جاتے۔[۱۷] رسول کریم صلعم اکثر اپنے کسی تربیت یافتہ صحابی کو قبائلی وفود کے ساتھ ان کے مسکنوں کو روانہ کر دیتے ، تا کہ وہ اس علاقے میں دینیات کی تعلیم کا بند و بست کریں، جس کے بعد وہ مدینہ واپس آ جاتے۔[۱۸]

ہجرت کے ابتدائی سالوں میں معلوم ہوتا ہے، کہ رسول کریم صلعم کی یہ مستقل سیاست تھی کہ جب مدینے کے باہر کے لوگ مسلمان ہوتے، تو ان کو حکم دیا جاتا کہ ترک وطن کر کے مرکز اسلام کے قریب آ بسیں [۱۹] جہاں بعض وقت ان کو اپنی نو آبادی بسانے کے لئے سرکاری زمینیں بھی دی جاتیں۔[۲۰]

ترک وطن کے اس حکم میں فوجی، سیاسی اور تمدنی جو اغراض پوشیدہ تھے وہ ظاہر ہیں۔ ابن سعد [۲۱] نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے ایک قبیلے میں جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا ایک معلم روانہ کیا، معلوں کو ہجرت کے متعلق جو عام ہدایتیں تھیں، اس کی انھوں نے لفظی تعمیل کی ، اور کہنا شروع کیا کہ جو ہجرت نہ کرے وہ مسلمان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ قبیلے والے پریشان ہوئے مگر وہ سمجھ دار تھے۔ انھوں

نے اپنا وفد مدینہ روانہ کیا، تا کہ براہ راست جناب رسول اکرم صلعم سے معلوم کریں، کہ ہجرت کے حکم کا کیا منشاء ہے؟ اور یہ عرض کریں کہ انھیں اپنا وطن چھوڑنے میں کس قدر عظیم معاشی نقصان ہے۔ رسول کریم صلعم نے ان کی مشکلات کو سن کر انھیں اجازت دی کہ وہ اپنے وطن ہی میں رہیں۔ اور ان کے ساتھ وہی سلوک ملحوظ رکھا جائے گا جو اسلامی سرزمین میں ہجرت کرنے والوں کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔

مدنی زندگی میں رسول کریم صلعم کی یہ مستقل سیاست تھی کہ قبائل میں تعلیم و تربیت کے لئے معلم روانہ کریں، بیر معونہ کے مشہور واقعے میں ستر قاریان قرآن بھیجے گئے تھے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے، کہ انھیں نجد کے ایک آباد علاقے میں اور کثیر قبائل میں کام کرنا تھا۔

قبائلی نمایندوں کا تعلیم کی غرض سے مدینہ آنا بھی کوئی شاذ ونادر واقعہ نہ تھا،[۲۲] اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ایسے لوگوں کے قیام و طعام اور تعلم و تربیت کی رسول کریم صلعم خود شخصی طور سے نگرانی فرماتے تھے۔ اور یہ لوگ عموماً صفے میں ٹھہرائے جاتے تھے۔

مدینہ منورہ میں صفہ واحد درسگاہ نہ تھی، بلکہ یہاں کم ازکم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں تھیں،[۲۳] اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہر مسجد اپنے آس پاس کے محلے والوں کے لئے درس گاہ کا بھی کام دیتی تھی، خاص کر بچے وہاں پڑھنے آیا کرتے تھے۔ قبا، مدینہ منورہ کے جنوب میں مسجد نبوی سے کوئی دو ڈھائی میل پر واقع ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ وقتاً فوقتاً رسول کریم صلعم وہاں تشریف لے جاتے، اور وہاں کی مسجد کے مدرسے کی شخصی طور سے نگرانی فرماتے،[۲۴] بعض احادیث میں رسول کریم صلعم کے عام حکم ان لوگوں کے متعلق محفوظ ہیں، جو اپنے محلے کی مسجد کے مدرسے میں تعلیم پاتے تھے۔[۲۵] آنحضرت صلعم نے یہ بھی احکام صادر کئے تھے کہ لوگ اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کیا کریں۔[۲۶] ایک دلچسپ واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص

نے بیان کیا ہے،[۲۷] کہ ایک دن جب رسول کریم صلعم مسجد نبوی میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ وہاں دو قسم کے لوگ موجود ہیں، کچھ لوگ نوافل اور خدا کی عبادت میں مشغول تھے اور کچھ لوگ فقہ کی تعلیم میں منہمک۔ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ دونوں ہی لوگ اچھا کام کررہے ہیں، البتہ ایک کا کام زیادہ اچھا ہے جو لوگ خدا سے کچھ مانگ رہے ہیں، ان کے متعلق خدا کی مرضی ہے، کہ چاہے تو دے چاہے تو نہ دے، البتہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو علم حاصل کررہے ہیں اور جہالت کو دور کررہے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ خود میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں یہ کہتے ہوئے آپ نے اس حلقے میں اپنے لئے جگہ بنائی جہاں درس ہورہا تھا۔

یہاں اس مشہور اور اکثر حوالہ دی جانے والی حدیث کا ذکر کیا جاسکتا ہے کہ شیطان پر ایک عالم، ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت گزرتا ہے۔[۲۸]

رسول کریم صلعم خود بھی شخصی طور سے اعلیٰ تعلیم دیا کرتے تھے حضرت عمر وغیرہ بڑے صحابہ ان درسوں میں شریک رہا کرتے تھے، جہاں قرآن وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آنحضرت صلعم مسجد نبوی کے حلقہائے درس کا اکثر معائنہ کیا کرتے تھے۔ اگر وہاں کوئی بے عنوانی نظر آتی، تو فورا تدارک فرمادیا کرتے، چنانچہ ترمذی میں ہے،[۲۹] کہ ایک مرتبہ مسجدی نبوی میں رسول کریم صلعم نے قضاوقدر کے متعلق کچھ مباحثہ ہوتے سنا، آپ اپنے حجرے سے باہر آئے۔ مارے غصے کے آپ کا چہرہ تمتمارہا تھا۔ اور راوی کے لفاظ میں، ایسا معلوم ہورہا تھا کہ انار کا رس آپ کے رخساروں اور پیشانی پر نچوڑ دیا گیا ہے۔ آپ نے اس موضوع پر بحث مباحثے سے منع کردیا اور ارشاد فرمایا کہ بہت سی گزشتہ امتیں اسی مسلے میں الجھ کر گمراہ ہوگئی تھیں۔

یہ رسول کریم صلعم کی ایک طے شدہ سیاست تھی کہ صرف وہی لوگ قوم کی سیادت، سرداری اور راہنمائی کریں اور نتیجتاً مسجدوں میں امام بنیں جو قرآن مجید اور سنت کے زیادہ سے زیادہ ماہر ہوں، جیسا کہ صحیح مسلم میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کوششیں

بیکار نہ گئیں، اور خواندگی میں اس قدر تیزی سے ترقی ہوئی کہ ہجرت کو چند ہی دن گذرے تھے، کہ قرآن مجید نے حکم دیا کہ ہر وہ تجارتی معاملہ جس میں رقم اُدھار ہو، صرف تحریری طور سے انجام پائے، اور ایسی دستاویز پر کم از کم دو اشخاص کی گواہی لی جایا کرے۔ اس کا منشاء قرآن کے الفاظ میں یہ تھا کہ اس طرح کی تحریری گواہی ''خدا کے نزدیک زیادہ منصفانہ ہے، اور شہادت کے اغراض کے لئے زیادہ مستحکم وسیلہ ہے، اور شبہات پیدا ہونے کی صورت میں رفع شک کا بہترین ذریعہ ہے۔[۳۰]

مدینے میں خواندگی کی کثرت ہو جانے کے باعث اس حکم سے کوئی دشواری پیش نہیں آئی ظاہر ہے کہ ملک میں خواندگی کی وسعت کے بغیر ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا تھا، گو اس میں شک نہیں کہ پیشہ ور کاتبوں کا بھی اس زمانے میں پتہ چلتا ہے۔[۳۱]

ہجرت کے بعد سے ہی سیاسی معاہدات، سرکاری خط و کتابت، ہر فوجی مہم میں جانے والے رضا کاروں کے ناموں کی فہرستیں،[۳۲] مختلف مقامات مثلاً مکہ، نجد، خیبر او طاس، وغیرہ میں خفیہ نامہ نگار[۳۳] جو عموماً تحریری طور سے آنحضرت صلعم کو اپنے مقام کے حالات سے اطلاع دیا کرتے تھے، نیز مردم شماری[۳۴] اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں اس بات میں ممد و معاون ہوئیں، کہ خواندگی روز بروز بڑھتی ہی جائے۔ تاریخ نے رسول کریم صلعم کے کوئی ڈھائی تین سو خطوط محفوظ رکھے ہیں[۳۵] صحیح تعداد اس سے بہت زیادہ ہونی چاہیئے، کیونکہ آنحضرت صلعم کی حکومت دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر چلتی تھی، اور دس سال تک حکمرانی کے فرائض آپ کو انجام دینے پڑے تھے۔

عرب میں خطوط پر مہر کرنے کا رواج سب سے پہلے جناب رسالت صلعم ہی سے شروع ہوا۔[۳۶] آپ کو خط کی صفائی اور وضاحت کا جس قدر لحاظ رہتا تھا، اس کا اندازہ ان چند احادیث سے ایک حد تک ہو سکتا ہے جن میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے، کہ کاغذ کو موڑنے سے پہلے اس کی سیاہی کو ریگ ڈالکر خشک کرلو[۳۷] یا یہ کہ

حرف ''س'' کے تینوں شوشے برابر دیا کرو اور اس کو بغیر شوشوں کے نہ لکھا کرو [۳۸]
یعنی (س) غالباً یہ حکم اس لئے تھا کہ شوشے نہ دینا احتیاط پسندی کے فقدان اور سستی پر دلالت کرتا ہے، یا یہ کہ لکھتے ہوئے اگر کچھ رکنا پڑے تو کاتب کو چاہیئے، کہ قلم اپنے کان پر رکھ لے، کیونکہ اس سے لکھوانے والے کی زیادہ آسانی سے یاد دہانی ہو جاتی ہے، [۳۹] بولنے میں ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔

عہد نبوی ہی میں یک فنی ذوق یا تخصص بھی ترقی کر گیا تھا اور خود جناب رسالت مآب صلعم اس کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے، کہ جس کو قرآن سیکھنا ہو، وہ فلاں صحابی کے پاس جائے، جس کو تجوید یا تقسیم ترکہ کا حساب سیکھنا ہو، وہ فلاں کے پاس جائے وغیرہ۔ [۴۰]

متعدد حدیثوں میں معلموں کو معاوضہ قبول کرنے کی ممانعت کی گئی ہے [۴۱] عبادہ بن صامت کی روایت ہے، کہ وہ درس گاہ صفہ میں قرآن اور فن تحریر کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شاگرد نے انھیں ایک کمان نذر کی، مگر رسول کریم صلعم نے انھیں اس کے قبول کرنے سے روک دیا۔ [۴۲]

ایک مملکت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے جناب رسالت مآب صلعم کو مترجمین کی بھی ضرورت ہوا کرتی تھی، جو غیر زبانیں جانتے ہوں۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت جو دربار رسالت کے میر منشی کہے جاسکتے ہیں، فارسی، حبشی، عبرانی اور رومی (یونانی) جانتے تھے۔ [۴۳] آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ ان کو حکم دیا تھا کہ وہ عبرانی خط لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھ لیں، اور چند ہفتوں میں وہ اس میں طاق ہو گئے تھے، [۴۴] چنانچہ یہودیوں کو اگر کوئی خط بھیجا جاتا یا ان کے پاس سے کوئی خط آتا، تو حضرت زید بن ثابت [۴۵] اس کو لکھ یا پڑھ لیا کرتے تھے حضرت عبداللہ بن الزبیر کے متعلق بھی مشہور ہے کہ کثیر زبانیں جانتے تھے، معلوم نہیں مبالغہ ہے یا واقعہ کہ ان کے پاس ایک سو غلام ایسے تھے جن میں سے ہر ایک کی بولی الگ الگ تھی اور حضرت عبداللہ ان میں سے ہر

ایک سے اسی کی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

نصاب کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر پوری صحت کے ساتھ بیان کرنا دشواری سے خالی نہیں۔ ہمارے پاس جو مختصر و محدود مواد ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ ہر جگہ ایک ہی نصاب جاری نہ تھا۔ معینہ کتب کو پڑھانے کی جگہ معینہ معلم کے پاس لوگ جاتے، اور وہ جو پڑھا سکتا، اس سے پڑھتے۔ بہرحال اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ قرآن وسنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ آنحضرت صلعم نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی، [۴۶] پیرا کی [۴۷] تقسیم ترکہ کی ریاضی، [۴۸] مبادی طب [۴۹] علم ہیئت، [۵۰] علم انساب، [۵۱] اور علم تجوید قرآن [۵۲] کی تعلیم دی جایا کرے۔ ایک حدیث میں یہ بھی حکم ہے کہ استاذ کی عزت کی جائے [۵۳] یا علم بغیر عمل کے بے سود ہے، وغیرہ۔

مکے کے باشندوں کو زبان کی صفائی کا بیحد لحاظ رہتا تھا، اور یہ بھی چاہتے تھے، کہ ان کے بچے صحرا کی آزاد زندگی میں پرورش پائیں، اور مکے کی رنگارنگ کی آبادی میں مل کر متاثر نہ ہوں. اسی لئے وہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو مختلف قبائل میں بھیج دیتے تھے، جہاں وہ کئی سال رہ کر والدین کے پاس واپس آتے .خود رسول کریم صلعم کو بھی اس سے سابقہ رہا تھا، اور آئندہ زندگی میں آپ اسے یاد کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں، کہ معززین مکہ میں اس کا رواج آج چودھویں صدی ہجری کے وسط میں بھی چلا آتا ہے۔

تربیت دلانے کا ایک دوسرا طریقہ مکے والوں نے یہ اختیار کیا تھا کہ تجارت کے لئے جو کارواں جایا کرتے تھے، اس میں کسی معمر کے ساتھ نوعمروں کو بھیج دیا کریں۔ چونکہ مکے کی معاشی زندگی کا دارمدار بہت بڑی حد تک تجارت پر تھا اس لئے تربیت کے اس طریقے کی اہمیت مکے والوں کے لئے جیسی کچھ تھی ظاہر ہے. سفر کے تجارب کا فائدہ ماسوا تھا۔

اس زمانے میں نوعمروں اور معمروں کی تعلیمی ضرورتوں کے فرق کو محسوس کرلیا گیا تھا، چنانچہ احادیث میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے، کہ بچوں کو کن چیزوں کی تعلیم

دینی چاہیے۔ نشانہ اندازی اور پیرا کی خاص طور سے بچپن ہی سے سکھائی جاتی تھی۔ اسی طرح پڑھنے کا طریقہ بھی بچپن ہی سے بچوں کو سکھایا جاتا تھا، اور سات برس کی عمر کے بعد بچے نماز نہ پڑھیں تو انھیں سزا دینے کا حکم تھا۔[۵۴]

عورتوں کے ساتھ علیحدہ سلوک کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے ہفتے میں ایک دن مقرر کرلیا تھا، جب آپ عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لیجاتے ان کو تعلیم دیتے، اور ان کے سوالات کا جواب دیتے۔[۵۵] آنحضرت صلعم نے عورتوں لے لئے چرخہ کاتنا، سب سے اچھا مشغلہ قرار دیا تھا۔[۵۶] ایک حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک خاتون سے خواہش کی کہ وہ آپ کی ایک بیوی کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔[۵۷] آنحضرت صلعم کی زوجہ مطہرہ بی بی عائشہ کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم، نیز ادب، شاعری اور طب میں بڑا دخل تھا۔[۵۸] یہاں تک کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلعم نے فرمایا، کہ آدھا علم عائشہ سے حاصل کرو،[۵۹] قرآن نے بھی رسول کریم صلعم کی بیویوں پر ایک خصوصی فریضہ عاید کیا ہے، کہ وہ دوسروں کو تعلیم دیا کریں،[۶۰] ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جس کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اسے تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے، اور اس کی تربیت کرے، اور اچھی تربیت کرے، پھر اس کو آزاد کر کے باضابطہ نکاح کرے، تو اسے دگنا ثواب ملے گا۔[۶۱]

رفتہ رفتہ مملکت اسلامیہ جو ابتداً ایک شہر مدینہ کے کچھ حصہ پر مشتمل تھی، پھیلتی گئی، اور نہ صرف خانہ بدوش بددی، بلکہ شہروں میں مستقل طور سے سکونت کرنے والے عربوں نے بھی بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ ایک نئے دین کے قبول کرنے کا ناگزیر نتیجہ تھا، کہ ایک وسیع تعلیماتی نظام قایم ہو، جو دس لاکھ مربع میل کے رقبہ کی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ عہد نبوی کے اختتام پر حکومت اسلامی باوجو اس قدر وسیع رقبے پر مشتمل ہونے کے دینیات کی تعلیم کی ضرورتوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے لگی تھی۔ کچھ تو مرکز مدینہ سے بڑے بڑے مقامات پر تربیت یافتہ معلم بھیج

دئے جاتے تھے، اور کچھ صوبہ دار گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کردیا جاتا تھا، کہ وہ اپنے ماتحت علاقے کی تعلیمی ضرورتوں کا مناسب انتظام کریں۔ [۶۲] یمن کے گورنر عمرو بن حزم کے نام جو طویل تقرر نامہ یا ہدایت نامہ جناب رسالت مآب صلعم نے لکھا تھا، اسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ [۶۳] اس میں بھی گورنر کو ہدایت ہے، کہ لوگوں کے لئے قرآن، حدیث فقہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ اسی دستاویز میں ایک دلچسپ جملہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم میں کس طرح فرق کرنا چاہئے اور وہ جملہ یہ ہے کہ ''لوگوں کو اس بات کی نرمی سے ترغیب [۶۴] دو کہ وہ دینیات کی تعلیم حاصل کریں''۔ ''گورنروں'' کو جس تعلیم کے رائج کرنے کا حکم تھا، اس میں دینیاتی ضرورتوں میں سے وضو، جمعہ کا غسل، نماز باجماعت، روزہ اور حج کعبہ کے احکام شامل تھے۔

صوبائی درس گاہوں کا معیار بلند کرنے کے لئے رسول کریم صلعم نے صوبہ یمن میں ایک صدر ناظر تعلیمات مقرر کیا تھا، جس کا کام یہ تھا، کہ مختلف اضلاع و تعلقات میں ہمیشہ دورہ کرتا رہے، اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے۔ [۶۵] کوئی تعجب نہیں جو اور صوبہ جات میں بھی اس طرح کے افسر مامور کئے گئے ہوں۔

آخر میں تعلیم کی نظری حیثیت کے متعلق قرآن و حدیث کے بعض احکام کی جانب اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں، کہ شروع سے آخر تک بار بار اور صاف وصریح الفاظ میں اندھی تقلید کو برا ٹھیرایا گیا ہے۔ [۶۶] اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے طور پر غور وفکر کرے، اور کسی رسم ورواج کی پیروی محض آبائی وموروثی ہونے کی بناء پر نہ کرے۔ [۶۷] کسی اور مذہبی کتاب میں فطرت کے مطالعہ پر اتنا زور نہیں دیا گیا ہوگا۔ جتنا قرآن مجید میں ہے۔ کہ سورج، چاند، سمندر کی موجیں، دن اور رات، چمکتے ستارے، دمکتی فجر، پودے اور حیوانات

تمام ہی قوانین فطرت کے تابع بنائے گئے ہیں، جن سے ان کے خالق کی قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔قرآن مجید کے مطابق علم لامتناہی ہے [۶۸] اور بڑے سے بڑے عالم کا علم بھی تھوڑا ہی ہوتا ہے، یہ کہ سارا عالم انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اور انسان جو زمین میں خدا کا نائب ہے، اپنے برتاؤاور کردار کے مطابق جانچا جائیگا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اس کا بھی بار بار ذکر ہے، کہ حق وصداقت کی پیروی کی جانی چاہئے ، اور موروثی عقاید ورواجات سے متاثر نہیں ہونا چاہئے۔

احادیث میں بھی علماء کی بڑی تعریف کی گئی ہے، اور ان کو سب سے بہتر انسان قرار دیا گیا ہے، [۶۹] حتی کہ ان کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے۔[۷۰] آخر میں ایک حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جس کا اکثر حوالہ آتا ہے، اگر چہ ماہرین اس کو اس کے موجودہ الفاظ میں صحیح حدیث نہیں سمجھتے ، لیکن اس کا مفہوم قرآن و حدیث کی عام تعلیمی پالیسی سے بالکل متفق ہے، یعنی ''علم حاصل کرو اگر چہ چین ہی میں کیوں نہ ہو''، کیونکہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد عورت کا فریضہ ہے۔[۷۱]

ایک حدیث میں یہ دعا ماثور ہے اور اسی پر یہ تبصرہ ختم کیا جاتا ہے کہ ''اے خدا میں تجھ سے علم نافع اور رزق طیب اور عمل مقبول کی استدعا کرتا ہوں۔'' [۷۲]

اَللّٰھمّ اِنی اَسلکُ عِلمًانا فِعاً وّرزقاً طیَباً وعملاً متقبلا، آمین!

(مطبوعہ معارف، اعظم گڑھ نومبر ۱۹۴۱ء)

حواشی:

[۱] سینٹ ہیلینا کی یادداشتیں (فرانسیسی) جلد۳ ص ۱۸۳۔

[۲] باب ''زمانہ جاہلیت کا معاشی نظام'' دیکھئے

[۳] باب ''شہری مملکت مکہ'' دیکھئے

[۴] خود ایک حدیث میں ہے ''ہم ایک امی قوم ہیں، لکھنا اور حساب کرنا ہمیں نہیں آتا''۔(انا امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب) مختصر جامع بیان العلم ص ۳۵ یہ حدیث صحیح بخاری وغیرہ میں

بھی ہے اس میں اصل میں تو زمانہ اسلام میں قمری مہینوں کے اختیار کی وجہ بتائی گئی ہے، لیکن ضمناً اس سے شاید زمانہ جاہلیت کے تصورات کا اندازہ کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے

[۵] الازمنہ والامکنہ، مؤلفہ مرزوقی جلد۲، ص۷۹ تا ۸۰، نیز معارف از ابن قتیبہ بر موقع

[۶] فہرست ابن ندیم ص ۷، نیز کتاب الخراج مؤلفہ قدامہ بن جعفر کا ٹکڑا جو آکسفرڈ میں ہے (مگر غلطی سے قلاقہ کی طرف منسوب ہے)

[۷] ترمذی ۴۴: ۶۸، ابوداؤد ۳۹: ۱۶۔ ابن حنبل جلد ۵ ص ۳۱۵۔ طیالسی ص ۵۷۷۔

[۸] ابن عبد البر کی مختصر جامع بیان العلم ص ۲۵ نیز ابن ماجہ باب فضل العلماء۔

[۹] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۸۹

[۱۰] طلب علم کے لئے سفر کے سلسلے میں دیکھئے مقدمہ دارمی ص ۴۶۔

[۱۱] استیعاب ابن عبد البر ص ۳۹۳، نیز نظام الحکومتہ النبویہ مولفہ کتانی ۱: ۴۸ بحوالہ ابوداؤد

[۱۲] کتاب المحبر مولفہ ابن حبیب ورق ۱۵۹

[۱۳] ابن سعد ۲: ۱، ص ۴ سہیلی ۲: ۹۲، مسند ابن حنبل ۱: ۲۴۷، کتانی کتاب مذکور ۱: ۴۸۔

[۱۴] کتانی ۱: ۴۸ بحوالہ ابوداؤد، کتاب البیوع باب کسب المعلم وغیرہ۔

[۱۵] بخاری باب سریہ بیر معونہ۔ [۱۶] مسند ابن حنبل جلد ۳، ص ۱۷۱۔

[۱۷] بخاری باب رحمتہ البہائم نیز تفسیر طبری جلد ۱۱ ص ۵۰ نیز تفسیر خازن میں سورہ (۹) آیت ۱۲۲ کی تفسیر جہاں قرآن مجید میں حکم ہے...... جائے، بلکہ چند لوگ تعلیم حاصل کر کے رہنمائی کا فریضہ انجام دیں نیز ابن عبد اللہ کی کتاب العلم ص ۲۰ تا ۲۱۔

[۱۸] کتانی کی نظام الحکومتہ النبویہ جلد ۱ ص ۴۳ و مابعد۔

[۱۹] دیکھئے باب ہجرت یا نو آبادکاری [۲۰] ابوداؤد جلد ۲، ص ۳۲ وغیرہ

[۲۱] طبقات ابن سعد باب الوفود [۲۲] اس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے

[۲۳] ابوداود کتاب المرسل عینی شرح بخاری جلد ۲، ص ۴۶۸

[۲۴] ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۹۷ [۲۵] ابن عبد البر کتاب العلم ص ۱۴

[۲۶] کتانی کی نظام الحکومتہ النبویہ جلد۱، ص۴۱ نیز صحیح بخاری، بیان حضرت عمر۔

[۲۷] ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۱۵ نیز دیگر کتب حدیث

[۲۸] سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان ''عالم دفقیہ'' بحوالہ بخاری ودیلمی، نیز ترمذی، باب العلم۔

[۲۹] شمائل ترمذی برموقع [۳۰] قرآن مجید۲:۲۸۲۔

[۳۱] کتانی کی نظام الحکومتہ النبویہ، جلد ا ص ۲۷۵ تا ۲۷۷۔

[۳۲] کتانی کتاب مذکور جلد ا، ص۲۲۱، بحوالہ صحیح مسلم

[۳۳] کتانی جلد ا ص۳۶۲ تا ۳۶۳، اگرچہ مولانا سلیمان ندوی کے خیال میں خفیہ نامہ نگار کی اصطلاح صحیح نہیں بلکہ ممکن ہے کسی نے اتفاقاً کوئی اطلاع بھیج دی ہو لیکن کتانی کا یہ بیان متعدد اور صریح تذکروں پر مبنی ہے

[۳۴] صحیح بخاری ۵۶:۱۸۱ کے مطابق ایک مرتبہ مسلم شاری کی فہرستوں سے پندرہ سو اندراجات شہر مدینہ میں ہونے معلوم ہوئے تھے، جو ظاہر ہے کہ ابتدائے ہجرت کا زمانہ ہوگا

[۳۵] اس پر جدید ترین تالیف الوثائق السیاسیہ کے نام سے میں نے شائع کی ہے

[۳۶] کتانی ا:۱۷۷، فتوح البلدان مولفہ بلاذری باب الخاتم

[۳۷] کتانی ا:۱۲۹ [۳۸] ایضا ا:۱۲۵ و مابعد

[۳۹] کتانی ا:۱۲۵ و مابعد، (اگرچہ اوپر کی تینوں باتیں مجھے صحیح حدیثوں میں نہیں ملیں لیکن یہ ناممکن یا غیر معقول چیزیں نہیں ہیں) [۴۰] طبقات ابن سعد برموقع۔

[۴۱] سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان ''علما'' بحوالہ طبرانی نیز بخاری ۳۷:۱۶، ابوداؤد ۲۲:۳۶

[۴۲] ابوداؤد جلد۲، ص ۱۳۹، اس کا ذکر شبلی کی سیرۃ النبی طباعت دوم، جلد۲ ص ۸۸ میں بھی ہے۔

[۴۳] کتانی ا:۲۰۲ بحوالہ، العقد الفرید مولفہ ابن عبدربہ وغیرہ

[۴۴] ایضا ا:۲۰۳ بحوالہ بخاری وغیرہ

[۴۵] کتانی ا:۲۰۷ (بحوالہ مرآۃ الزماں ابن الجوزی و تاریخ الخلفاء السیوطی ص۸۳

[۴۶] جمع الجوامع مولفہ سیوطی تحت عنوان ''عملوا'' بحوالہ ابن مندہ، ابونعیم ودیلمی نیز تحت تعلموا

[۴۷] ایضاً تحت عنوان ''عملوا'' بحوالہ ابونعیم وابن مندہ.

[۴۸] ایضاً تحت عنوان ''تعلموا'' بحوالہ طبرانی دارقطنی وغیرہ نیز ابن عبدالبر کی کتاب العلم، ص ۸۰ ابوداؤد ۱۸:۱، ابن ماجہ ۲۳:۱

[۴۹] سیوطی کی جامع الجوامع تحت عنوان تعلمن بحوالہ مالک۔

[۵۰] ایضاً تحت عنوان تعلموا من امر النجوم بحوالہ ابن سنی وغیرہ۔

[۵۱] ایضاً تحت عنوان تعلموا من انسابکم بحوالہ مالک وترمذی وبیہقی وطبری۔

[۵۲] ایضاً تحت عنوان تعلموا من امر النجوم بحوالہ دیلمی.

[۵۳] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان ''تعلموا'' بحوالہ طبرانی فی الاوسط.

[۵۴] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان علمو الصبی بحوالہ ابن حنبل وترمذی و بغوی۔

[۵۵] صحیح بخاری کتاب العلم

[۵۶] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان علّموا (نعم لھو المومنۃ فی بیتھا الغزل) بحوالہ ابونعیم و ابن مندہ

[۵۷] کتانی ۱: ۴۹ تا ۵۵ بحوالہ قاضی عیاض وابوداؤد

[۵۸] سیرۃ النبی مولفہ شبلی طبع دوم ۲: ۴۰۷

[۵۹] احادیث فضیلت عائشہ کسی کتاب حدیث میں دیکھی جاسکتی ہیں

[۶۰] قرآن مجید ۳۳: ۳۴

[۶۱] ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۴۶۔

[۶۲] کتانی ۱: ۴۳ ومابعد

[۶۳] سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۱ تا ۹۶۲، تاریخ طبری ص ۱۷۲۷ تا ۱۷۲۹، کتانی ۱: ۲۴۸ تا ۲۴۹ وغیرہ

[۶۴] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان ''علّموا'' (علموا ولا تصفوا فان العلم خیر میں

العنف علمو اویسروا والا تعسروا) بحوالہ ابن سعد و بیہقی و ابن حنبل

[۶۵] تاریخ طبری ص۱۸۵۲ تا ۱۸۵۳، ص۱۹۸۳، (احوال ۱۱ھ)

[۶۶] ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۱۶۷ باب ذم التقلید بحوالہ آیت '' اتخذوا احبارھم ورھبا نھم اربابا من دون اللہ ''

[۶۷] طلب علم کی فضیلت کے لئے دیکھو ابوداؤد ۲۴:۳۰۱ ،مقدمہ ابن ماجہ ص ۱۷، مقدمہ داری ،ص ۳۷ وغیرہ ترمذی ۳۹:۲ و۱۹۔

[۶۸] قرآن مجید ۱۷ ۵۸ قرآن مجید میں قصہ موسیٰ و خضر کا مقصد بھی طلب علم کی فضیلت اور علم انسانی کی قلت کو نمایاں کرتا ہے

[۶۹] من یرواللہ بہ خیر یفقھہ فی الدین (بخاری ،۳:۱۳۱، ۹۶:۱ ترمذی ۳۹:۱ مقدمہ ابن ماجہ ۱۷ مقدمہ دارمی ۲۳ ،ابن عبدالبر کی کتاب العلم ۱۶ تا ۱۷، حدیث خیر الناس العلماء و المتعلمون (مقدمہ دارمی ۲۵،۳۱) ابوداؤد ۲۴:۳۱)

[۷۰] العلماورثۃ الانبیاء (بخاری ۳:۱۰، ترمذی ۳۹ :۹ ،ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۲۱

[۷۱] اطلبوا العلم ولو کان باصین فان طلب العلم فریضتہ علی ا کل مسلم ومسلمۃ (ابن عبدالبر کی کتاب العلم ،بیہقی کی شعب الایمان ،ابن عدی کی الکامل اور سیوطی کی جمع الجوامع میں یہ حدیث ہے۔

[۷۲] حدیث نبوی بحوالہ کتاب العلم مولفہ ابن عبدالبر ص ۸۴

جاہلیت عرب کے معاشی نظام کا اثر
پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام پر

تمہید:

خدائے تعالیٰ نے قادر مطلق ہونے کے باوجود کم از کم انسانی دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے اور مشیتِ ایزدی کا کوئی کرشمہ یہاں جب پوری طرح جلوہ گر ہو کر اپنا مظاہرہ دکھاتا ہے تو اس کے پس منظر میں اسباب و مسببات اور علل و معلولات کا ایک کثیر و طویل سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

مشیتِ ایزدی یہ ہوئی تھی کہ اب سے پورے پونے چودہ سو سال پہلے پرانی دنیا کے جغرافی مرکز (اور اس طرح ناف زمین) یعنی مکّہ معظمہ سے انسان و خدا کے تعلقات میں ایک نئی مرکزیت پیدا کرائے۔ اور عرب سے شروع ہو کر اسلام اقصائے عالم تک پہنچ جائے۔ عہدِ نبوی میں جو پہلی اسلامی مملکت قائم ہوئی اس کے بیسیوں اسباب تھے۔ اخلاقی بھی۔ سماجی بھی، سیاسی بھی۔ معاشی بھی۔ اور ظاہری طور پر اس تحریک کی کامیابی میں جہاں سرورِ کائنات پیغمبرِ اسلام کی قابلیتوں اور کوششوں کو دخل تھا وہیں ان آلوں اور ہتھیاروں میں بھی صلاحیت کی ضرورت تھی جن سے رسول کریم کو کام لینا تھا۔ گیہوں سے روٹی بیشک بنتی ہے لیکن محض گیہوں سے نہیں۔ پہلے اسے کھلا کرنا اور پچھوڑنا ہوتا ہے پھر پیسنا، اور محض پسے ہوئے سوکھے آٹے سے بھی روٹی نہیں

بنتی۔ اسے بھگونا اور گوندنا اور بیلنا اور توے پر ڈال کر سیکنا بھی ہوتا ہے۔

پہلی مملکت اسلامیہ کو اگر ایک پکی پکائی روٹی سمجھا جائے اور حجازی عربوں کو گیہوں، تو اب یہ دیکھنا ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اس گیہوں کو کھلا کس طرح کیا گیا، پچھوڑا کس طرح گیا، پیسا کس طرح گیا، چھانا کس طرح گیا، گوندھا کس طرح گیا، بیلا کس طرح گیا، بھونا، الٹا پلٹا اور پھیرا کس طرح گیا، کتنا پانی ڈالا گیا، کتنا نمک ڈالا گیا، کتنی دیر کتنی تپش پر سینکا گیا، کسی کونے کو داغ نہ لگنے دینے کے لئے کیا کیا احتیاطیں ملحوظ رہیں وغیرہ۔

پہلی مملکت اسلامیہ کے لئے ایک نئی دنیا نہیں پیدا کی گئی بلکہ موجودہ دنیا کے موجودہ لوگوں ہی کو ان کے موجودہ مروج طرز زندگی کے ساتھ مملکت اسلامیہ میں مبدل کیا گیا تھا۔ یہ لوگ اسلام سے پہلے بھی کھانا کھاتے، پانی پیتے، چلتے پھرتے، سوتے، مرتے، اور پیدا ہوتے تھے۔ اور اسلام کے بعد بھی ان امور میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کچھ چیزیں مثلاً بت پرستی، شراب خوری، سودخواری وغیرہ گھٹیں، کچھ چیزیں مثلاً نماز، روزہ، زکات بڑھیں۔ لیکن انسانی زندگی میں یہ سب جزئیات ہیں۔ انسان کی پیدائش کا طریقہ، زندگی گزارنے کا طریقہ اور مرنے کا طریقہ کبھی بدل نہ سکے۔ تصورحیات بدل دیا گیا، اس ایک تصور حیات کے بدلنے سے انسانوں کے افعال میں وہی فرق ہوگیا جو ایک رہزن ٹھگ کی خونریزی اور ایک سپاہی کے قتل و غارت گری میں ہوتا ہے کہ رہزن کو تو سماج کا بدترین مجرم اور سپاہی کو محسنِ اعظم ہیرو خیال کیا جاتا ہے۔ گو دونوں کرتے ایک ہی قسم کا کام ہیں۔ اس تصورِ حیات کے بدلنے سے پہلے کعبے کے سامنے سجدہ بدترین قسم کی بت پرستی اور جہالت تھی تو اب کعبہ کے سامنے سجدہ وحدانیت اور خدا پرستی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ بن گیا۔

تصورحیات کی اس تبدیلی میں مختلف امور اثر دکھاتے ہیں۔ پہلے ''کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ'' منتہائے مال اور منشائے اعمال تھا تو اب، اور تو اور کھانے پینے کا

مقصد بھی یہ ہوگیا کہ اپنے بلند نصب العین اور مفوضہ مشن کی تکمیل کے لئے صحت و طاقت کے ساتھ جی سکیں۔

اس نئے مقصد حیات کا تعلق نہ صرف روحانی زندگی سے تھا بلکہ دنیاوی زندگی سے بھی۔ اور نہ صرف انفرادی زندگی سے تھا، بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی۔ نہ صرف اپنی زندگی سے تھا بلکہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو اس نئے تصور سے بہرہ ور کرنے سے بھی۔

ان گوناگوں مقاصد کے لئے جہاں اور وسائل کے اختیار کرنے کے ضرورت تھی وہیں ایک مملکت کا قیام بھی درکار تھا، تاکہ یہ بتایا جاسکے کہ اس جدید تصورِ حیات یعنی اسلام یا ''خدا کی مرضی پر چلنے کے اصول'' کا اطلاق حکمرانی اور سیاستِ مدن پر کس طرح کیا جائے۔ جنگ و صلح، عدل گستری، محصول گیری، راعی و رعایا کے حقوق و واجبات، اجتماعی و انفرادی آزادیاں اور پابندیاں سب ہی میں ایک نئی مرکزیت، ایک نیا ولولہ، ایک نئی زندگی، ایک ہر جہتی اور بے پناہ انقلاب کس طرح برپا کردیا جائے؟

کسی مملکت کے قیام کے لئے آدمیوں کی ضرورت ہے لیکن اسی طرح جس طرح روٹی کے لیے گیہوں کی۔ پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام کے لیے جن نفسیاتی، سیاسی، سماجی، جغرافیائی، تمدنی، معاشی اور دیگر موثرات کی ضرورت تھی ان سب کی تفصیل طویل ہوگی۔ یہاں صرف ایک امر یعنی معاشی ضرورت کی تحلیل مقصود ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کا معاشی نظام کیا تھا اور اس نظام نے پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام میں کیا حصہ لیا؟

عرب کے مختلف علاقے:

اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اسلام سے پہلے عرب کے جزیرہ نما میں کبھی بھی ایک

ملک گیر اور مرکزی حکومت قائم ہوئی ہو۔اور قریب قریب ہندوستان کے برابر وسعت رکھنے والے اس صحرائی براعظم میں تمدنی ترقی چوطرف یکساں بھی نہیں رہی ۔ ربع خالی آج چودھویں صدی ہجری میں بھی خالی ہی پڑا ہے۔تو یمن وغیرہ میں حضرت مسیح سے بھی ہزاروں سال پہلے متمدن اور طاقتور مملکتوں کا پایا جانا ایک امر واقعہ ہے ۔کبھی کبھی خاصی وسیع سلطنتیں وجود میں آئیں مثلاً کندہ والوں نے حضر موت سے صراط ماجا سب[۱]۔ وحیرہ تک یعنی عرب کے جنوب سے شمال تک کچھ دنوں ایک حکومت قائم کر لی تھی لیکن حجاز وغیرہ کے وسیع علاقے اس سے آزاد رہے ۔بحرین ،عمان وغیرہ کے ساحلی علاقے بھی خاصے قدیم زمانے سے خانہ بدوش قبائل کی جگہ حضری زندگی رکھنے والی بستیوں پر مشتمل نظر آتے ہیں۔

بہر حال آغاز اسلام پر صورت حال یہ دکھائی دیتی ہے کہ کوئی مرکزی مملکت عربی قوم یا ملک عرب میں نہ تھی ۔سینکڑوں قبیلے تھے جو نیم حضری اور نیم بدوی زندگی گزارتے ہوئے مکمل خود مختارانہ طور سے رہتے تھے ۔ ہر قبیلہ جنگ کا خود اعلان کرسکتا تھا ۔صلح نامہ خود طے کرسکتا تھا ۔اس کے خلاف کوئی بیرونی حاکم کسی طرح کا اختیار سماعت نہ رکھتا تھا ۔ان قبائل کے علاوہ بیسیوں شہر بھی تھے، مکہ، مدینہ، طائف، ینبوع (حجاز میں) جرش ،صنعا،عدن (یمن میں) صحار اور دباء (عمان میں)ہجر (بحرین میں) یمامہ ،فید (نجد میں) دومتہ الجندل ،خیبر ،فدک ،وادی القریٰ (شمالی عرب میں) ایلہ، مقناء صحرائے سینا کے مشرقی ساحل پر اچھی خاصی بستیاں تھیں جو کم و بیش شہری مملکتیں کہی جاسکتی ہیں ۔ یمامہ ،یمن وغیرہ بعض علاقوں میں غلے کی کاشت ہوتی تھی اور آس پاس کے عربی علاقوں میں برآمد بھی ہوتی تھی لیکن نہ اتنی کہ پورے ملک کی ضرورتیں پوری ہوسکیں ۔کھجور اور اونٹ بکریاں ایک حد تک بدوؤں کی غذائی ضرورتیں پوری کردیتی تھیں ۔لیکن لباس ، برتن ،ہتھیار[۲] ،زیور اور دیگر ضرورتوں کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے ۔صحرائے گوبی وترکستان اور جرمنی کے کالے جنگل کی طرح عرب بھی

تا حال نا معلوم وجوہ سے بڑا مردم خیز خطہ ہے۔اور توالد و تناسل کی کثرت مقامی ذرائع معیشت سے اتنی کچھ زیادہ ہے کہ باوجود خانہ جنگیوں وغیرہ کے جلد ہی زندگی آبادی کے کثرت سے اضافے کے باعث ناقابل برداشت ہوجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ چار ہزار سال قبل مسیح سے عرب مہاجرین کا واحد خشکی کے راستے یعنی شمال سے پھیلنا اور عراق و شام اور مصر تک میں جا جا کر آباد ہونا، سب جانتے ہیں ہجرت کے باوجود بھی جو آبادی بچ رہتی ہے وہ بیرونی درآمد کی محتاج ہوتی ہے۔قدرت نے عرب میں کچھ ایسے زیادہ خام مواد بھی نہیں مہیا کئے ہیں اور آب وہوا کی عمدگی ہے کہ بیرون والے یہاں آئیں اور غلہ وغیرہ پہنچائیں۔مجبوراً بیچارے عربوں ہی کو باہر جانا اور اپنی پونجی کے عوض ضروریات زندگی کا لانا ضروری تھا۔بحرین و عمان کا بلوچستان اور سندھ سے اتنا قریبی جغرافی تعلق ہے کہ یہ لوگ ہندوستان اور ایران کے سوا کہیں اور جا نہیں سکتے۔حجازی عربوں کے متعلق قرآن مجید کی شہادت رحلۃ الشتاء والصیف سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہر سال دو مرتبہ جاڑوں اور گرمیوں میں کئی کئی ماہ کے سفر پر مجبور تھے جاڑوں میں یمن جاتے اور گرمیوں میں شام و مصر، اونٹ، بکریاں، اونٹوں اور بکریوں کی کھالیں اور اون، گھوڑے، گوند، لوبان، روغن بلساں، عقیق وغیرہ کچھ قیمتی پتھر، اور اسی طرح کی کچھ چیزیں دساور کر سکتے تھے۔اور تبادلے میں غلے، برتن اور ہتھیار اور کپڑوں کی درآمد ہوسکتی تھی۔

عربوں کے دو بڑے حصے تھے اور بعض وقت ایک ہی قبیلے میں بھی یہ تقسیم نظر آتی تھی کہ کچھ لوگ خانہ بدوش بدویانہ زندگی بسر کرتے ہیں تو کچھ بستیوں میں مستقل حضری زندگی گزارتے ہیں بدویوں کی غذا کچھ تو شکار سے، کچھ ان کے اونٹ، بکریوں سے اور کچھ شہروں میں لگنے والے میلوں میں تبادلہ اشیاء کرنے کے ذریعے سے مہیا ہوتی تھی۔مزید برآں یہ کرائے پر حمل ونقل کا کام کرتے تھے لوٹ مار کی مہمیں بھی وقتاً فوقتاً اختیار کی جاتی تھیں دل جلے ابن خلدون نے ان میں سے بعض کی حالت یوں

بیان کی ہے کہ اگر انھیں چولھے کے لئے پتھر درکار ہوتا تو کسی مکان کا پایہ کھود ڈالتے اور جلانے کے لئے لکڑی درکار ہوتی تو مکان کی چھت توڑ ڈالتے۔[۳]

رہی شہری زندگی، سو اس میں بھی بڑی حد تک تمام عرب میں یکسانی نظر آتی ہے نخلستان چوطرف تھے۔ طائف، سوارقیہ وغیرہ میں انگور، انجیر، انار، شفتالو وغیرہ کے بکثرت باغ تھے۔ ۱۳۵۰ھ میں طائف میں میں نے انجیر کا ایک پرانا درخت دیکھا جو یقین نہ آئے گا کہ ہمارے ہاں کے کسی پورے تناور پیپل یا بڑ کے درخت کے برابر اونچا اور پھیلا ہوا تھا۔ چشموں کے ساتھ ترکاری۔ تربوز ککڑی وغیرہ کی کاشت بھی ہوتی تھی، کہیں کہیں غلہ جَو وغیرہ بھی بویا جاتا تھا مرغیاں پالی جاتیں جسے کوئی ٹھیٹ بدوی آج چودھویں صدی میں بھی بڑا نفرت انگیز اور کمینہ کام سمجھتا ہے۔

ان مقامی وسائل کے بعد بھی ضرورتیں پوری نہ ہوتیں تو مختلف میلوں، منڈیوں میں جا کر تبادلۂ اشیاء کرنا پڑتا۔ یہ کام سب ہی عربی شہر اور عربی قبیلے کرتے لیکن مکّے کے قریشیوں نے اسے ایک فن سے بھی گزار کر ایک علم بنا دیا تھا۔

مکّے کے امتیازات عرب شہروں پر:

عرب میں ہر جگہ بستیاں اور قریے تھے لیکن مکہ ام القریٰ (یعنی قریوں کی ماں) کہلاتا تھا۔ عرب کی ہر بستی میں معابد اور بت خانے تھے لیکن کعبے کے حج کے لئے جو لوگ آتے تھے ان میں بیعت عقبہ کے سال یمن کے لوگ بھی تھے، عمان کے لوگ بھی، بحرین کے لوگ بھی، طائف کے لوگ بھی، نجد کے لوگ بھی، طیّٔ اور کلب جیسے شمالی عرب کے لوگ بھی۔ عرب کی ہر بستی میں میلے لگتے تھے کہیں مقامی اور کہیں بین المقاماتی۔ چھوٹے ہاٹ ہفتہ وار لگتے۔ بڑے بین القبائل اور بین المقاماتی میلے سالانہ مقررہ ایام میں لگتے۔ لیکن جو اہمیت مکے کے عکاظ اور منیٰ کے میلوں کو حاصل تھی وہ انتہائی غیر جانبدار تحقیق وتلاش کے بعد بھی کسی اور میلے میں نظر نہیں آتی۔ عرب کی ہر

بستی والے اپنے کاروانوں کو باہر بھیجا کرتے تھے۔ لیکن لایلاف قریش کا مفہوم محمد بن حبیب، یعقوبی وغیرہ کسی پرانے اور واقف کار شخص کی تالیف [۴] میں دیکھو تو معلوم ہوتا ہے۔ قریش کے ایلاف یعنی معاہدات قیصر روم سے، کسرائے ایران سے، نجاشی حبش سے، اور اقیال یمن سے تھے اور ان حکمرانوں نے رسول کریمؐ کے دادا ہاشم کو منشور اور اجازت نامے عطا کر رکھے تھے کہ ان کے عاقوں میں وہ تجارت کے لئے آزادانہ کارواں لایا کریں۔

عرب کی ہر بستی والے اپنے تجارتی کاروانوں کی حفاظت کے لئے کچھ تو خود ہتھیار بند ہو کر بطور محافظ دستہ جاتے اور کچھ ان علاقوں کے جہاں سے انھیں گزرنا ہوتا، قبائل سے حلیفی اور دوستی پیدا کر لیتے۔ لیکن قریشی کاروبار شمال، جنوب، مشرق، مغرب، سب طرف پھیلے ہوئے تھے۔ وہ عراق بھی جاتے، یمن بھی، حبش بھی، شام بھی اور اندرون عرب بحرین و عمان، نجد و خیبر بھی۔ ان کا نظام ناگزیر وسیع ہونا چاہیئے۔ اور واقعہ بھی یہی تھا۔ انھوں نے ایک فوج قائمہ نوکر رکھ لی تھی [۵] جو تمام بدوی عرب میں اچھوتی چیز تھی۔ انھوں نے خفارے یا بدرقے کے ضروریات کے لئے معاہدات کا جو وسیع اور ملک گیر جال پھیلا دیا تھا اس کا ذکر ابن قتیبہ کے استاد محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) سے سنئے جو کہتا ہے کہ:۔

> ''جو تاجر بھی یمن اور حجاز سے نکلتا تو وہ اس وقت تک قریشی خفارے یعنی محافظ دستے کا محتاج رہتا جب تک کہ وہ مضری قبائل کے علاقے میں رہے کیونکہ ایک مضری قبیلہ، دوسرے مضری قبیلے کے تاجروں کو نہ ستاتا۔ مزید برآں مضریوں کی حلیفی جن جن قبائل سے تھی ان کے ہاں بھی ان کو امن رہتا۔ اور یہ ''باہمی امن'' کے اصول پر مبنی تھا۔ چنانچہ قبائل کلب ان کو مضری قبیلہ بنو تمیم سے حلیفی کے باعث نہ ستاتے اور قبائل طئی بھی ان کو مضری قبیلہ بنو اسد سے حلیفی کے باعث نہ چھیڑتے۔ اور مضری قبائل کہا

کرتے تھے کہ قریش نے ہمارا وہ قرض ادا کردیا جو حضرت اسماعیل سے ہم کو وراثتاً مذمت کی صورت میں ملا تھا۔ جب یہ آگے بڑھ کر عراقی سمت میں جاتے اور بنی عمرو بن مرثد سے کفارہ حاصل کرلیتے تو تمام قبائل ربیعہ میں وہ کافی ہوتا۔۔۔ جو تاجر دومۃ الجندل جاتے ان کو بھی قریش ہی سے کفارہ حاصل کرنا ہوتا۔۔۔ رابیہ جو حضرموت میں واقع ہے اگر وہاں جانا ہوتا تو قریش وہاں کے قبیلہ بنو آکل المرار سے خفارہ حاصل کرتے اور باقی لوگ آل مسروق سے لیکن قریشی حلیفی کے باعث آکل المرار نے غلبہ اور حکومت وسطوت حاصل کرلی اور سب کو زیر کرلیا۔''

(کتاب المحبر ص ۲۶۳، ۱ لخ)

اس دلچسپ اقتباس سے معلوم ہوگا کہ خفارہ جو ایک معنے میں بین الاقوامی اجازت نامہ رہ گزر کا مہیا کرنا تھا، عربوں کے ہاں ایک مستقل ادارہ بن گیا تھا جس کی قیمت مقرر تھی، عدنان وقحطان کے قبائل، مضر وربیعہ کے قبائل سب اس میں داخل تھے اور عملاً پورا عرب اس نظام میں منسلک ہوگیا تھا، جو قریشی مواصلات کے لئے ضروری تھا۔ قریش نہ صرف اس نظام اور سلسلہ حلیفی سے خود فائدہ اٹھاتے بلکہ تاریخی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کو بھی بخوشی معاوضہ لے کر اپنا خفارہ مہیا کرتے۔ اسی نظام کی برکت تھی کہ ہندوستان کا سامان عرب کی راہ یورپ میں پہنچ سکتا تھا مگر خود یورپ کا حال عرب کے اس ہمعصر زمانے ہی میں نہیں بلکہ اٹھارویں صدی تک یہ تھا کہ وینس اور جینوا ہو کہ اسپین و پرتگال، تجارت پر قومی اجارہ داری ضروری سمجھی جاتی تھی اور طوفان زدہ مصیبت کا مارا تک اگر اسپینی مقبوضات میں پہنچتا تو وہ نہ صرف مال سے ہاتھ دھو بیٹھتا، بلکہ جان کر صرف غلام بنتا، تو اسے ایک نعمت غیر مترقبہ ملتی۔ [۶]
قریش نے خفارے کے اغراض کے لئے حلیفیوں کی جو طرح ڈالی تھی وہ مختلف اصول پر مبنی ہوتی، کبھی تو باہم امن کی شرط کافی ہوتی کبھی قریش یہ کرتے نظر آتے ہیں کہ کسی

غریب قبیلے کا مال بطور کارندہ تجارت کے لئے لے جاتے اور کوئی کمیشن لئے بغیر نفع مالکوں کے سپرد کرتے اور کبھی خفاروں پر نقد معاوضہ رقم یا جنس کی صورت میں دیتے۔ بہت سے قبیلوں کا روزگار ہی اس خفارکاری سے نکلتا۔ وہ رہبر مہیا کرتے جو راستے میں چوکس اور سینہ سپر رہتے اور عربوں ہی نہیں بلکہ حیرہ کے بادشاہ اور دیگر اجنبیوں کا تک مناسب معاوضہ لے کر ''تطیمہ'' یعنی تجارتی سامان منڈی تک بحفاظت لے جانے اور واپس لانے کا ذمہ لیتے اور یہ ذمہ داری علی العموم پوری ہوا کرتی ہوگی جبھی تو یہ ادارہ بقا واستحکام میں نظر آتا ہے۔

اسواق العرب پر محمد بن حبیب کی کتاب کا ایک اقتباس ہم ابھی سن چکے ہیں۔ اسی کتاب کا ایک اور اقتباس سننے کے قابل ہے، جس میں کہیں کہیں ایک ہم ماخذ مؤلف، مرزوقی، کے بیان سے تکملہ کیا گیا ہے:۔

''دومۃ الجندل میں جو شام و حجاز کے مابین ہے یکم ربیع الاول کو میلہ لگتا اور مہینہ بھر چلتا پھر برخاست ہو کر آیندہ سال اسی زمانے میں لگتا۔ (قریش کے سے اس کے لئے جاتے)۔۔۔۔ پھر یہاں سے لوگ چل کر بحرین میں مشقر آتے جہاں یکم سے آخر جمادی الآخرہ تک میلہ لگتا اور دومۃ الجندل کی طرح بھی مقامی حکمران کو عشر یعنی دس فیصدی چنگی وصول ہوتی۔ ایران تک سے تاجر سامان لے کر یہاں آتے۔ اس کے بعد یہاں سے یکم رجب کو چلتے تو عمان کے شہر صحار کو آتے آتے بیس دن لگتے اور جو پہلے نہ آسکے ہوتے وہ اب آتے اور یہاں پانچ دن تک میلا لگتا۔ یہاں کا عشر بادشاہ جلندیٰ کو ملتا۔ اس کے بعد دبا کا میلا رجب کے آخر میں لگتا۔ یہ عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا، یہاں سندھ اور ہند اور چین اور مشرق اور مغرب کے لوگ آیا کرتے اور خشکی اور سمندر سے سامان لاتے۔ یہاں کا عشر بھی بادشاہ جلندی کو ملتا۔ اس کے بعد مہرہ کے شہر شحر میں ۔۔۔۔۔ جو آج کل ہمارے سلطان مُکلّا وشحر کے علاقے میں ہے۔ وسط شعبان سے میلہ لگتا، جہاں بری اور بحری تاجر سب دبا سے چل

کر آتے یہاں کھالیں، کپڑے وغیرہ فروخت کئے جاتے اور ایلوہ، لوبان وغیرہ جو مقامی پیداوار تھے خرید کئے جاتے پھر عدن میں یکم رمضان سے بیس دن میلہ لگتا۔ یہاں بڑا اچھا انتظام تھا۔ کسی محافظ دستے کی یہاں ضرورت نہ رہتی تھی۔ یہاں کا عشر ایرانی نوآبادکار افسر لے لیتے۔ یہاں سمندری راہ سے آنے والے لوگ جو دبا اور مہرہ آتے وہ نہ آتے بجز اس کے کہ کسی کے پاس کچھ سامان بچ رہا ہو اور اس سے پہلے کے میلوں میں اسے شرکت کا موقع نہ ملا ہو۔ عدن میں جو عطر بنتا اس کی دور دور تک شہرت تھی۔ سمندری راہ سے آنے والے تک اسے بطور تحفہ سندھ اور ہند تک لے جاتے اور اس پر فخر کیا جاتا، اور خشکی کی راہ آنے والے اسے ایران و روم تک لے جاتے۔۔۔۔ (عطر سازی کے متعلق مرزوقی نے اپنی ۴۵۳ھ کی تالیف میں لکھا ہے کہ اس وقت تک وہ صنعت وہاں کمال پر ہے۔ عدن کے بعد صنعاء کا میلہ تھا جو وسط سے آخر رمضان تک ہر سال لگتا۔ یہاں روئی، زعفران، مختلف قسم کے رنگ، لوہے وغیرہ کے سامان بکتے۔ یہاں کا عشر بھی ایرانی حکمراں افسر لیتے، ان مختلف میلوں میں لوگ وہ سامان خریدتے جن کی ان کے اپنے ملکوں میں مانگ ہوتی۔ اس کے بعد رابیہ واقع حضرموت اور عکاظ قریب عرفات و مکہ میں بیک وقت وسط ذیقعدہ سے آخر ماہ تک میلہ لگتا۔ کچھ لوگ عکاظ آتے اور کچھ رابیہ جاتے۔ عکاظ کے قریب ذی المجاز ہے چنانچہ عکاظ کے بعد یکم ذی الحجہ سے دس دن ذی المجاز میں میلہ لگتا پھر منیٰ میں جو مکے کے مضافات میں ہے، حج کے سلسلے میں میلہ جمتا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد لوگ خیبر یا یمامہ جاتے جہاں محرم کی دسویں سے میلے لگتے اس کے بعد جنوبی فلسطین میں بُصریٰ اور اذرعات کے میلے لگتے۔ (دیکھئے نقشہ ۵)

اس اقتباس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کس طرح شمال سے مشرق، مشرق سے جنوب، جنوب سے مغرب، اور مغرب سے شمال، غرض پورے عرب کا سال بھر میں دورہ ہو جاتا ہے۔ کس طرح پورے عرب میں سیاسی تو نہیں لیکن معاشی وفاق قائم ہو گیا تھا۔

عرب کے میلوں
کی
ترتیب زمانی و مکانی

بُصریٰ
اذرح
صحرائے سماوہ
دومۃ الجندل
قلزم (سویس)
ایلہ
خیبر
مدینہ
جدہ
مکہ
عکاظ منیٰ
شعیبہ (جدہ)
نجد
یمامہ
بحر فارس
مشقر
دبا
صحار
عمان
حباشہ
صنعاء
عدن
حضرموت
بحر مہرہ
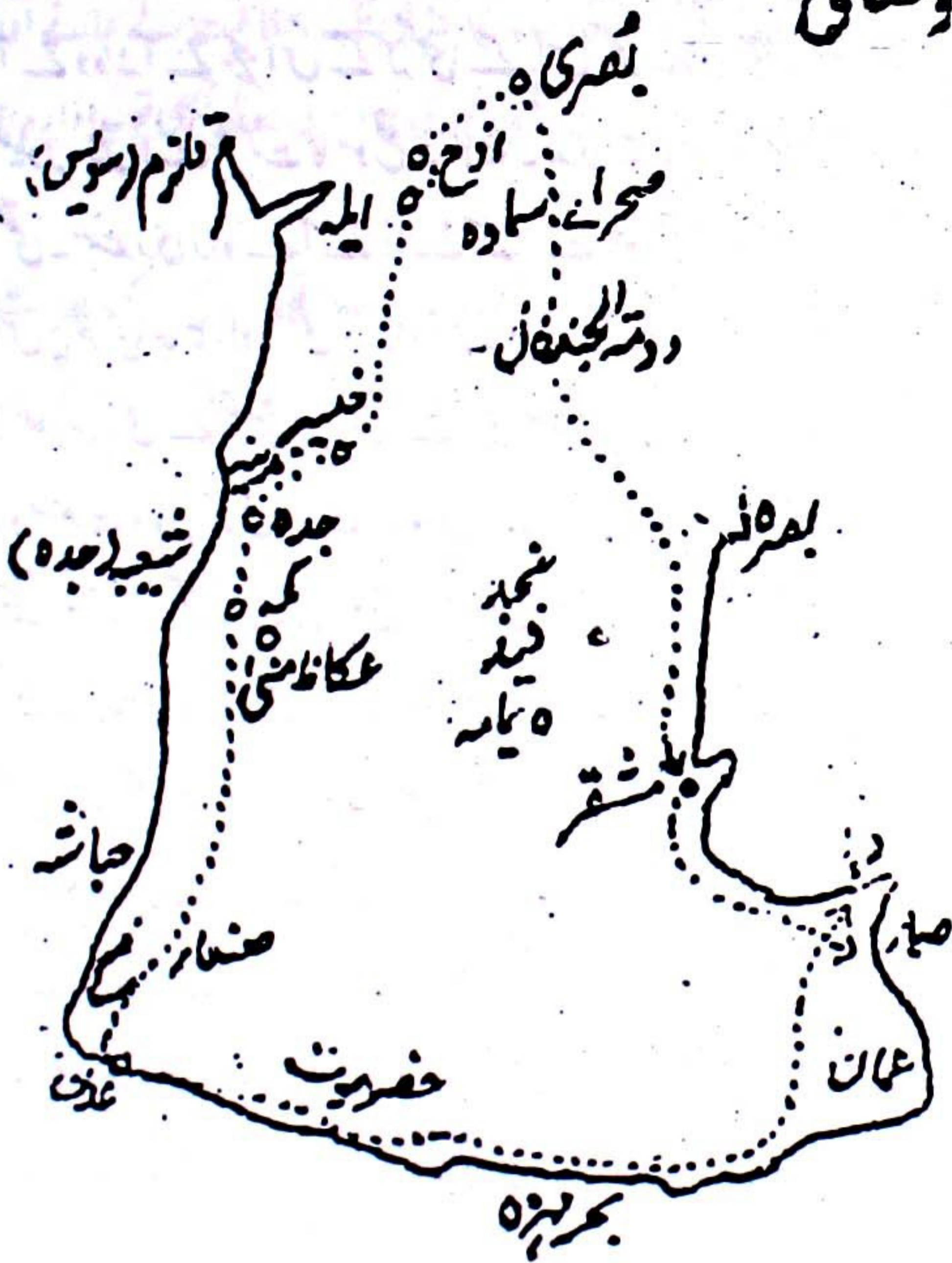
کس طرح ان میں ایک ربط و نظم پیدا ہوگیا تھا اور اگرچہ ہر جگہ مقامی خودمختاری اور محصول گیری وغیرہ رائج تھی لیکن پھر بھی کس طرح خفارے کے نظام اور میلوں میں حفاظت کے انتظام وغیرہ نے مرکز گریز اور افتراق پسند بدویوں میں بھی ایک یکجہتی پیدا کردی تھی۔

اوپر عکاظ کے میلے کی کچھ اہمیت ہم نے بیان کی کہ وہاں کس کس حصے سے لوگ آتے تھے۔ ہمارے مولفوں نے ایک اور اہم بات بھی بیان کی ہے کہ عکاظ میں عام نگرانی اور جھگڑوں کا فیصلہ، نیز اس کے بعد ہی ہونے والا موسم حج، قبیلہ تمیم کے اہتمام میں ہوتا۔ قمری سال کو کبیسہ گری کے ذریعے سے فصلی شمسی سال بنانا بھی قبیلہ تمیم کے قلمس کا فریضہ تھا جو مکہ معظمہ میں کعبے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کا اعلان کرتا۔ [۷] قبیلہ تمیم عرب کے انتہائی مشرق میں رہتا تھا اور عکاظ و مکہ انتہائی مغرب میں ہیں۔ حج کے زمانے میں مختلف فرائض مختلف قبائل میں چلے آتے تھے۔ علاوہ بنو تمیم کے آل صفوان، اجازہ یعنی عرفات سے روانگی کا حکم دینا بطور موروثی حق کے استعمال کرتے تھے کعبے کے اطراف جو تین سو ساٹھ بت تھے وہ عرب کے ہر حصے کے قبائل کے معبود تھے۔ کہتے ہیں ان میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ اور بی بی مریمؑ کے بھی بت تھے۔ کیا یہ سب کعبے کی مرکزیت اور مکے اور قریش کی خاموش مرجعیت پر دلالت نہیں کرتے؟

ان میلوں کے ساتھ ساتھ اشہر محرم یعنی محفوظ و محترم مہینوں کا ادارہ بھی قابل لحاظ اہمیت رکھتا ہے۔ نہ معلوم یہ عرب میں کیسے آیا اور کب سے رائج تھا۔ بہر حال حروب صلیبیہ کے زمانے میں فلسطین وغیرہ کے مسلمان عربوں سے اخذ کر کے پوپوں نے عیسائی یورپ کی نزاج کو کم کرنے کی اسی طرح کی ایک ناکام کوشش کی تھی جو خدائی امن (ٹروس آف گاڈ) کے نام سے مشہور ہے۔ عربوں کا یہ نظام زمانہ جاہلیت میں یوں تھا کہ ذی قعدہ، ذی حجہ اور محرم کے مسلسل تین مہینے اور رجب کا ایک مہینہ محترم و

محفوظ سمجھے جاتے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں ''رجب مضر'' کا جملہ آیا ہے، اس تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ مضر کے علاوہ قبائل ربیعہ کا بھی کوئی الگ زمانہ محفوظ مہینوں کا ہوتا ہوگا۔ اوپر پڑھی ہوئی باتوں کی یاد تازہ کی جائے گی تو نظر آئے گا کہ رجب میں صحار اور دبا کے اہم میلے لگتے۔ جہاں خود رسالت مآب صلعم کے نبوت سے پہلے جانے اور طویل مدت گزارنے کا مسند احمد بن حنبل میں اشارہ ملتا ہے۔[۸] اور ذی قعدہ، ذی حجہ، اور محرم میں عکاظ، منیٰ، خیبر، اور یمامہ کے زبردست اجتماع ہوتے، یمامہ کا غلہ مکے تک آتا۔ ذی حجہ کا مکہ معظمہ میں حج اور منیٰ کا میلہ خاص کر خوش نصیب تھے کہ دور دراز کے لوگوں کو پورے تین مہینے امن کا یقین رہتا کہ جا کر واپس آنے تک چاہے وہ عرب کے کسی حصے سے مکے تک کیوں نہ ہو، کوئی خطرہ نہیں۔ کیونکہ ذی حجہ کے علاوہ اس سے ایک مہینہ پہلے اور ایک مہینہ بعد حرام زمانہ رہتا جو عرب کے بعید ترین گوشوں سے آنے اور واپس جانے کے لئے کافی تھا۔ اس نے ناگزیر محافظین کعبہ یعنی قریش کی جو عظمت تمام عرب کے ذہنوں پر نقش کردی ہوگی وہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ سیرۃ ابن ہشام[۹] کے مطابق اشہر حرم کے ساتھ ایک ادارہ بسل بھی تھا جس کے تحت قریش کے چند خاندانوں کو پورے عرب میں تین مہینے نہیں بلکہ مسلسل آٹھ مہینے محفوظ و مامون حالت میں ملتے۔

اس نظام کا اثر:

تمام عرب سے لوگوں کا مکہ آنا اور مکے والوں کا عرب اور عرب کے باہر عراق و شام اور مصر و حبشہ تک مسلسل آیا جایا کرنا ۔۔۔۔ اس کے اثرات پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہی ہوگا۔ اس نے پورے عرب کی مختلف علاقہ وار بولیوں میں قربت پیدا کر کے ایک مشترکہ معیاری بولی پیدا کرنے میں حصہ لیا ہوگا۔ اس نے عربوں میں احساس یگانگی کو تقویت دی ہوگی، اس نے تمام عرب کے رسم و رواج اور اخلاق و

عادات میں مماثلت پیدا کی ہوگی۔ اس نے ان میں محنت پسندی اور کوچ کی عادت اور تمام دنیا کو اپنا وطن سمجھنے کا میلان پیدا کیا ہوگا۔ اس نے ان کو عراق، شام اور مصر کی خاص کر جغرافی اور طبیعی حالت سے واقف کرادیا ہوگا جس کے باعث عہد نبوی اور خلافت راشدہ کی فاتحانہ پیش قدمی کسی اجنبی امداد کی محتاج نہ رہی ہوگی۔ اسی نے بیرون، خاص کر متمدن ممالک کے آئے دن کے سفر سے ان میں روشن خیالی، جذبات اور امنگیں پیدا کی ہوں گی۔ ایرانی اور رومی دونوں ان کے ساتھ سخت بدسلوکی کرتے تھے۔ خاص کر رومی علاقوں میں عرب کے کاروانوں کی جس سختی سے جھڑتی لی جاتی اور ان کے ساتھ جرائم پیشہ اقوام سمجھ کر جس توہین اور درشتی کا سلوک کیا جاتا اور جس طرح ان کے لئے مختلف علاقے مقرر کردیئے جاتے کہ ان کے سوا وہ شام و فلسطین میں کہیں اور نہ جائیں، اور سامان مقرر کردیئے جاتے کہ ان کے سوائے اور چیزیں خرید کر نہ لے جائیں، ان پر شدید محصول چنگی عائد کئے جاتے [۱۰] وغیرہ وغیرہ، تو ان چیزوں کا اثر حساس دماغوں اور سوچنے والے ذہنوں پر جو کچھ پڑ سکتا ہے وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایرانی بدسلوکیاں بھی کم نہ تھیں۔ ذی قار کے معرکے میں چند عرب قبائل نے ایرانی لشکر کو ایک دفعہ شکست دی تو اس کے متعلق خود جناب رسالت مآب صلعم نے فرمایا تھا کہ اس دن پہلی مرتبہ عربوں نے ایرانیوں سے بدلہ لینے میں کامیابی حاصل کی ہے، متاخر کسرایان ایران کی عرب کش سیاست نے ایرانیائے ہوئے حیرہ کے عربوں اور شیبانیوں کو ایران کا جانی دشمن بنا دیا تھا اور زیادہ تر انھیں عربوں نے تاج کیانی کو مدینے کے گلی کوچوں میں لاڑکایا تھا۔

اسلام کی آمد:

عرب کے معاشی نظام کی یہ عام کیفیت تھی کہ ربیع الاول ۱ھ میں تاریخ عالم کا ایک اہم اور عہد آفریں واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ تیرہ سال تک بے غرضانہ ایثار

اور رضا کارانہ زحمت کشی کے ذریعے سے اہل مکہ کی اخلاقی و دینی اصلاح کی جو کوشش انھیں کے ایک ہم وطن یعنی حضرت محمد ﷺ کر رہے تھے، اس کا انجام یہ نکلا کہ بیسیوں ساتھی مال و عیال کو چھوڑ کر بیک بنی و دو گوش ترک وطن کو غنیمت سمجھ چکے تھے اور خود اس بے غرض مصلح کو جان کے لالے پڑے تو غاروں میں چھپتے، نامانوس اور دشوار گزار راستوں سے چلتے، وطن سے سینکڑوں میل دور مدینہ چلا آنا پڑا تھا۔ قریش مکہ نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ ایک تو جلا وطن مسلمانوں کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ پر مکے میں غاصبانہ قبضہ جما لیا تھا، [۱۱] دوسرے اپنے معاشی اثرات کے تحت اہل مدینہ کو دھمکا کر لکھ بھیجا کہ آنحضرت صلعم کو اپنے ہاں سے نکال دیں [۱۲] اور بزور اس کو منوانے کے لئے مدینے پر حملہ کرنے کا انتظام کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ہجرت کے اس ابتدائی زمانے میں تارکین وطن مسلمان ہتھیار بند سویا کرتے تھے۔

مدینہ آنے کے چند ہی ہفتوں کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ اس شہر کی کایا پلٹ ہوگئی یہاں کی قدیم آبادی میں جو خانۂ جنگی اور چوکھا لڑائی ہو رہی تھے وہ ختم ہوگئی مہاجرین مکہ، مسلمانان مدینہ، مدینے کے غیر مسلم عرب اور یہودی قبائل ۔۔۔۔ ان چاروں عناصر نے ایک وفاقی شہری مملکت قائم کی جس کا تحریری دستور خوش قسمتی سے ہم تک محفوظ چلا آیا ہے۔ باون ۵۲ دفعات کے اس وفاقی دستور میں آخری اختیار سماعت مرافعہ، اور اعلی اختیاوات جنگ و صلح دونوں امور جناب رسالت مآب صلعم کو دے دینے پر سبھوں نے اتفاق کیا اور اس پر بھی سب راضی ہوگئے کے قریش سے نہ تو کوئی تعلقات رکھے جائیں اور نہ انہیں یا ان کے دوستوں کو کوئی مدد یا حفاظت مہیا کی جائے۔ اس سلسلے میں یہ امر شاید درخور التفات سمجھا جائے گا کہ اس زمانے میں جب یہود نہ صرف مدینے کے مقامی کاروبار پر چھائے ہوئے تھے بلکہ شام سے یمن و عمان تک ان کی نو آبادیوں کا ایک زنجیرہ پڑا ہوا تھا اور بین الیہود باہمی تعاون خاصا مستحکم تھا تو مدینے کے یہودیوں سے اشتراک عمل نو خیز اسلامی مملکت کے لئے کم از کم یہ

فائدہ ضرور رکھتا تھا کہ یہ معاشی قوت اس ابتدائی بے کسی کے زمانے میں مخالف پلڑے میں نہیں داخل ہوگئی۔ گھر سے فراغت ہوتے ہی آنحضرتؐ مدینے سے ینبوع کا کئی بار سفر فرماتے ہیں ان مختلف قبائل سے جو اس راستے پر بستے تھے یا تو حلیفی کے نئے معاہدے کرتے ہیں یا اہل مدینہ کے ان کے ساتھ جو قدیم معاہدے تھے ان کی تجدید عمل میں لاتے ہیں۔ ایسے بعض معاہدوں میں مدامی فوجی حلیفی اور باہمی امداد کا ذکر ہے اور بعض میں باہم دوستی اور ایک کی جنگ میں دوسرے کی غیر جانبداری اور دشمن کو مدد نہ دینے کا حکم ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک معاشی قصہ ہے۔ قریش کا شام، مصر اور عراق جانے والا راستہ مدینے اور ینبوع کے بیچ میں سے ساحل کے کنارے کنارے گزرتا تھا۔ قریشی مواصلات تجارت اور روزگار کی یہ شہ رگ اب بیک جنبش لب کٹ گئی اور ادھر سے قریشی کاروانوں کا جانا بند کر دیا گیا۔ قریش نے تھوڑی سی کشمکش کی۔ بدر، احد اور خندق کے معرکے پیش آئے لیکن قریش کے رحلتہ الشتاء کا شمالی راستہ کھلنا تو کیا، اس کے لئے نجد وغیرہ سے ہو کر جانے والے نئے نو ساختہ راستے بھی بند ہی ہوتے چلے گئے۔ [۱۳] قریش کی تجارت مفلوج ہوئی تو وہ بیسیوں قبائل جو انھیں کے کاروبار پر پل رہے تھے، خواہی نخواہی قریش سے ٹوٹ کر مدینے سے جڑنے پر مجبور ہوتے چلے گئے اور تاریخوں میں صراحت سے ایسے نظائر کا ذکر آیا ہے۔ [۱۴] آنحضرتؐ کی سیاست قریش کو تباہ و نابود کرنے پر نہیں بلکہ بالکل محفوظ رکھ کر بے بس اور مغلوب کر دینے پر مشتمل تھی۔ پانچ چھ ہی سال کی کوشش میں مکے کے شمال، مکے کے مشرق، بلکہ مکے کے جنوب کے قبائل بھی اسلام کے زیر نگیں بنا لئے گئے۔ اور جب یہ گھیرا مکمل ہو گیا تو بجائے شرائط منوانے کے آنحضرت صلعم نے قریش کی منہ مانگی شرطیں حدیبیہ میں منظور کیں۔ یہ سیاست کاری کا شہ کار تھا۔ قریش کا چڑھتا ہوا جوش اور بخار اس صلح کے سیفٹی ثالث (SAFTY VALVE) سے خارج ہو گیا۔ عین اس لمحے خیبر کے

یہودیوں اور مکے کے قریشیوں میں اتحاد ہو کر ایک نئے طاقتور محاصرہ مدینہ کی جو تجویز تیار ہو چکی تھی وہ روک دی گئی۔ کیونکہ قریش نے اپنی منہ مانگی شرطوں کے ملنے اور تجارت کا شمالی راستہ کھلنے پر وعدہ کیا تھا کی وہ دس سال تک آنحضرتؐ سے نہ تو خود جنگ کریں گے اور نہ کسی اور کو کوئی خفیہ یا علانیہ مدد دیں گے بلکہ مسلمانوں کی جنگوں میں کامل ناطرفدار رہیں گے۔ اسی صلح سے آنحضرت صلعم کو یہ فائدہ ہوا کہ خارجہ سیاست کے لئے ہاتھ کھل گئے۔ خطرے کے مرکز خیبر کو مہینے بھر میں ہمیشہ کے لئے مٹا دیا گیا۔ نینوئ میں رومیوں کو ایران پر جو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر بحرین، عمان، وغیرہ کا ایران سے انقطاع اور مدینے سے الحاق کرالیا اور قریش کے رہے سہے وسائل اور رفیق ان سے بچھڑا دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ۲ ہی سال گزرے اور قریش نے ایک چھوٹا سا قصور کر کے معاہدہ شکنی کی اور مدینے سے دس ۱۰ ہزار قدوسیوں کا لشکر آیا تو مغرور قریش نے اپنے آپ کو اتنا بے بس پایا کے بغیر ایک ہتھیار چلائے اطاعت قبول کرنے ہی میں خیر دیکھی، اور آنحضرتؐ نے بھی قریش کو محفوظ رکھ کر مغلوب بنانے کی جو سیاست ملحوظ رکھی تھی اس کے باعث ان کے بیس سالہ مظالم کا جواب اس تاریخی جملے سے دیا کہ ''آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو''۔

ہم دیکھ چکے ہیں کے عرب کے بین الممالک کاروبار کا پورا ڈھانچہ قریشی کاروبار کے سنگ زاویہ پر ٹکا ہوا تھا۔ اور جب قریش ایک مرتبہ ہم نوا ہو گئے [۱۵] تو دو ہی سال کے اندر پورا جزیرہ نمائے عرب ایلہ واذرح سے لے کر عمان تک اور سماوہ سے لے کر معافر تک ایک ہی قبلہ کی طرف جھک رہا تھا، اور ایک ہی مرکز سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اور جب ذی حجہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر جبل الرحمۃ سے آنحضرت صلعم نے اپنے شہرہ آفاق طویل الوداعی خطبے [۱۶] میں ایک منشور انسانیت پیش کیا کہ عرب کو عجم پر کوئی فضیلت نہیں، سب انسان آدمؑ سے پیدا ہوئے اور آدمؑ مٹی

سے بنے تھے، اور قومیتیں اور قبائل صرف تعارف اور پہچاننے کی علامتیں ہیں ورنہ اصل عزت تو خدا سے ڈرنے کے مدارج پر مبنی ہے۔ جب یہ منشور عبدیت و انسانیت نہ صرف پیش کیا گیا بلکہ اس پر کامیاب عمل بھی کر کے دکھادیا گیا تو پھر نبی عربی صلعم کا کام ختم ہوگیا اور تین ہی ماہ بعد آپ رفیق اعلی سے جا ملے۔

اس اولین مملکت اسلامیہ کے قیام میں خود جناب رسالت مآبؐ کا جو کردار کارفرما رہا اور اس کے جو سیاسی، جغرافی، تمدنی، تاریخی، اخلاقی، نفسیاتی، وغیرہ وغیرہ عوامل رہے جنہوں نے عربوں کو اس زمانے میں اس انقلاب کے لئے تیار کیا اور اس انقلاب کے لئے مواقع فراہم کئے اور پھر عربوں کے کردار کی قبل اسلام کی صدیوں میں پرورش و پختگی اور عہد اسلام میں اس کا صیقل و جلا کاری وغیرہ وغیرہ یہ بیسیوں مسائل ہیں جو مستقل مقالوں کے محتاج ہیں یہاں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی کہ کس طرح ایک ملک کا معاشی پس منظر اس کی قسمت سازی میں حصہ لیتا ہے اور کس طرح ایک ادارے کی سب سے بڑی قوت ہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ اور کس طرح اس کمزوری سے بروقت اور صحیح فائدہ اٹھانا اپنے مقصد کو پورا کراتا ہے اور کس طرح حریف کی صلاحیتوں کو تباہ و تاراج کرنے کی جگہ اس قوت کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا جائے تو دنیا میں وہ کارنامے انجام پاتے ہیں جو معجزہ اور عجوبہ کہے جاتے ہیں کہ عہد نبوی میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ نراج اور طوائف الملوکی چھوڑ کر مرکزیت اختیار کرتا ہے اور اس کے بعد کے پندرہ سالوں میں انھیں اصول پر عمل کر کے اس وقت کی دو عالمگیر سلطنتوں کو بیک وقت اپنے حملے کا ہدف بنا کر ۲۷ ہجری تک اپنا جھنڈا حضرت سیدنا عثمانؓ کے زمانے میں مغرب میں شمالی افریقہ سے گزر کر اسپین میں اور مشرق میں ترکستان سے گزر کر چین میں اور جنوب میں خراسان سے گزر کر بھروچ و تھانہ یعنی بمبئی میں اور شمال میں آرمینیا اور ممالک خزر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور یہ انسانیت کی شہنشاہت **Imperialism of Humanity** تھی جس

میں ہر حاجت مند فردِ رعیت کو حکومت روٹی مہیا کرتی اور کسی کی آزادی عمل میں کوئی رکاوٹ ڈالے بغیر اجتماعیت کا مظاہرہ کرتی تھی جس میں حکومت اور رعایا ایک ہی چیز تھے چنانچہ دونوں ایک دوسرے کے ظاہر و باطن میں بہی خواہ و معاون تھے۔

یہ چند اشارے ہیں جن سے سوچنے والے دماغ کچھ نہ کچھ غذائے فکر پا سکتے ہیں۔

حواشی:

[۱] المحبر لابن حبیب ص ۳۶۹

[۲] مشرفی یعنی مشارف شام کی تلواریں عربی ادبیات میں ضرب المثل ہیں۔ دیکھئے ڈاکٹر عنایت اللہ کی ''جیوگرافیکل ڈاکٹرس ان ارے بین لائف اینڈ ہسٹری'' (طبع لاہور) نیز میرا مضمون ''عربوں کے تعلقات بیزنطینی حکومت سے'' (مجلہ تحقیقات علیہ جامعہ عثانیہ ۱۹۳۵ء)

[۳] تفصیل کے لئے دیکھئے پروفیسر مارسےؒ کا افتتاحی مقالہ فرنچ اکاڈیمی میں ''اسلامی اور حضری زندگی'' کا ترجمہ (مطبوعہ روزنامہ رہبر دکن حیدرآباد ۱۹ تا ۲۲ رجب ۱۳۵۵)

[۴] ایلاف کے معنی بھی معاہدے کے ہیں (محبر محمد بن حبیب ص ۱۶۲ الخ)

[۵] تفصیل اوپر باب ''شہری مملکت مکہ'' میں۔

[۶] نیس کی فرانسیسی تالیف ''جدید قانون بین المما لک کا آغاز'' ص ۶۶۶، ۶۲۴ (مترجمہ دارالترجمہ، جامعہ عثانیہ)

[۷] محبر محمد بن حبیب، ص ۱۵۷

[۸] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۰۶

[۹] ص ۶۶ نیز قاموس فیروز آبادی تحت کلمہ ''بسل''

[۱۰] تفصیل کے لئے میرا مذکورہ مضمون ''عربوں کے تعلقات بیزنطینی حکومت سے''

[۱۱] دیکھئے باب ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور''

[۱۲] ابن حبیب (محبر ص ۱۷۱ تا ۱۷۳)۔ ابن ہشام ص ۲۹ تا ۹۹

[۱۳] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۴۷

[۱۴] طبقات ابن سعد ۲/۱ ص ۴۹ (اشجع)

[۱۵] قریش کی ہموائی سے قبل جو علاقے مملکت اسلامیہ میں داخل ہوئے تھے، ان کو اس الحاق کی تشویق مختلف وجوہ سے ہوئی۔ چنانچہ اس کے مذہبی و روحانی وجوہ بھی ہیں، سیاسی اور فوجی وجوہ بھی ہیں، اور معاشی وجوہ بھی، ایک اہم معاشی وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کی ہر بستی اور ہر میلے اور بازار میں محصول چنگی لیا جاتا اور بیرون عرب جو کاروان عرب لے جاتے، ان سے بھی سخت شرح سے محصول لیا جاتا۔ عہد نبوی میں مختلف قبائل سے مملکت اسلامیہ کے جو معاہدے ہوئے ان میں سے اکثر میں صراحت سے عشر یعنی اس اندرونی محصول چنگی کی برخاستگی کا ذکر ہے۔ چنگی کے اس اتحاد سے اندرونی گردش مال اور تجارت کو غیر معمولی فروغ ہوا اور اس کے برکات نے سیاسی اتحاد کو قریب تر اور مستحکم تر کرنے میں یقیناً بڑا حصہ لیا ہوگا۔ جیسا کہ دیگر ممالک کی تاریخ میں مماثل امور نظر آتے ہیں، اور جس سلسلے میں جرمن مملکتوں اور قبیلوں کے (Zollverein) چنگی کے اتحاد کی طرف اشارہ کافی ہوگا

[۱٦] اس کے متن کے لئے دیکھئے میری ''الوثائق السیاسیہ'' بر موقع

(مجموعہ مقالات علمیہ حیدرآباد اکاڈیمی)

۱۳٦۲ھ/۱۹۴۳ء

عہدِ نبویؐ کی سیاست کاری کے اصول

ایک شخص جس کو وطن میں جان کے لالے پڑے ہوں، صرف ایک رفیق کے ساتھ غاروں میں چھپتا، نامانوس اور دشوار گزار راستوں پر چلتا، سینکڑوں میل دور جا پناہ گزیں ہوا ہو، وہ دس ہی سال بعد جب انتقال کرتا ہے تو دس لاکھ مربع میل[۱] کے علاقے پر حکمراں ہو چکا تھا۔

پھر اس علاقے میں جہاں اس سے پہلے کبھی سیاسی مرکزیت آئی ہی نہ ہو اور ملک قبائلی سطح تمدن سے بلند نہ ہو سکا ہو، اس نراج میں ایک راج قائم کرے اور بغیر کسی نمونے کے سامنے رکھے ایک باقاعدہ مملکت کی ضرورت کی ہر چیز رائج کرے اور ایک ایسی حکومت قائم کرے جس کا آغاز ایک شہر کے چند محلوں سے ہو اور جو (۲۷) ہی سال میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہتوں [۲] سے وقت واحد میں لڑ کر اور بیسیوں دیگر سلطنتوں کو شکست دے کر ایشیاء افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں پر پھیل جائے۔ جیسا کہ اوپر باب شہری مملکت مکہ میں بیان ہوا۔

اس سیاست کا مطالعہ صرف ایک عظمت ماضیہ کا مطالعہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی شخصیت کے کارناموں کا مطالعہ ہے جس کے ہر قول وفعل کو اب بھی دنیا کی چوتھائی آبادی اپنا قانون اور اپنے لئے اسوہ حسنہ سمجھتی ہے۔ اگرچہ انسانوں کا یہ گروہ دنیا کی چوتھائی آبادی پر مشتمل ہے لیکن ایک تو یہ ''مشارق الارض'' سے ''مغارب الارض''

تک پھیلا ہوا ہے، [۳] (دیکھئے نقشہ نمبر ٦) دوسرے پرانی دنیا کی اکثر اہم شاہراہوں پر سیاسۃً نہیں تو سکونۃً قابض ہے، [۴] تیسرے زیادہ تر جنگی نسلوں پر مشتمل ہے، [۵] چوتھے عظیم الشان اور قابل رشک تاریخ رکھتا ہے جس کے پچھلے کارہائے نمایاں ہمیشہ امکانات کے خوش آیند ارادے اور ولولے پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے، پانچویں یک نسلی نہ رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ اس کا کوئی نہ کوئی جز ''میقاتی انحطاط'' کو ختم کر کے نئی زندگی کا ثبوت دیتا رہتا ہے، چھٹے ابھی تک اس کا پھیلاؤ رکا نہیں اور انتہائی ناسازگار مقاموں میں زبردست ترین اور منظم حریفوں [٦] کو شکست دے رہا ہے اور اس کے پرانے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے قاعدے متمدن ممالک میں بھی ضروریات حاضرہ کے مطابق خیال کئے جا رہے ہیں۔ [۷] وغیرہ وغیرہ۔

عہد نبوی کی سیاست خارجہ کے اصول دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ بعض ایسے تھے جو عام اور ہمہ گیر تھے اور ہر حال میں اور ہر کسی کے ساتھ ملحوظ رہتے تھے اور بعض ہر انفرادی وحدت کے ساتھ بدلے ہوئے تھے اور یہ ناگزیر بھی تھا کہ:۔

۱۔ اپنے ظالم وطن مکہ۔

۲۔ عرب کے غیر عربی عناصر خاص کر یہودی قبائل۔

۳۔ خانہ بدوش عرب قبائل۔

۴۔ عرب کے حضری زندگی رکھنے والے شہر یا شہری مملکتیں مثلا طائف۔

۵۔ عرب میں بیرونی دخل انداز یعنی ایرانی اور رومی صوبے، محفوظات، نو آبادیاں وغیرہ۔

٦۔ عرب کے ہمسایہ ملک۔

وغیرہ وغیرہ میں سے ہر ایک کے ساتھ آنحضرت صلعم کی ''سیاست کاری'' [۸] خصوصی مسائل سے دوچار ہو اور ان کو حل کرنے لئے وہ ہر جگہ الگ اور بدلی ہوئی رہے۔ سطور ذیل میں آنحضرت صلعم کی شہر مکہ سے برتاؤ کی سیاست پر بحث کی جائیگی۔

علامات

آبنائے		
ا۔ جبل الطارق	۱۔ مراکش	۱۲۔ عرب
ب۔ آبنائے طرابلس	۲۔ الجزائر	۱۳۔ ایران
ج۔ باسفورس	۳۔ تونس	۱۴۔ افغانستان
د۔ سویز	۴۔ طرابلس	۱۵۔ بلوچستان
ہ۔ باب المندب	۵۔ مصر	۱۶۔ کشمیر و پنجاب
و۔ آبنائے عمان	۶۔ سوڈان	۱۷۔ سندھ
ز۔ آبنائے ملاقہ	۷۔ ترکی	۱۸۔ بخارا
	۸۔ شام	۱۹۔ ترکستان
	۹۔ فلسطین	۲۰۔ بنگال و آسام
	۱۰۔ عراق	۲۱۔ یُنان
	۱۱۔ قفقاز	۲۲۔ ملایا و جاوا

عرب کے اہم شہر

مکہ کی اہمیت:

شہر مکہ کا، قدیم جغرافیہ نگاروں کے الفاظ میں ''ناف زمین'' پر ہوتا، چاہے اسلام کی عالمگیر توسیع میں کتنا ہی ممد و معاون رہا ہو، لیکن یہاں زمانہ ہائے مابعد سے ہمیں کوئی بحث نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ عہد نبوی میں اس کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ ہمیں ان مشنری پادریوں کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جو مصلحتاً مکہ اور مکے والوں کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ اسی طرح ان روحانی عظمتوں یا دیگر لا حاصل قصوں سے بھی یہاں سروکار نہیں جو کرہ ارض کے بننے میں مکے کے حصے وغیرہ سے متعلق ہیں۔

شہر مکہ میں جو عرب بستے تھے وہ قریش کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کے تجارتی تعلقات کی اہمیت کا اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور ہر قبیلہ اپنے رہنے سہنے کے جنگلوں، پہاڑوں میں انتہائی خودمختاری برتتا تھا اور اس کے علاقے سے گزرنے کے لئے زمانہ حال کے پاسپورٹوں سے بھی زیادہ دشواریاں تھیں، اس لئے کاروانوں کے سفر کرنے اور بین الممالک تاجروں کے عرب سے گزرنے کے لئے خفاروں اور بدرقوں کا ایک وسیع اور ترقی یافتہ نظام وجود میں آ گیا تھا۔ اس نظام نے عرب میں سیاسی تو نہیں لیکن ایک معاشی وفاق ضرور قائم کر دیا تھا، اس وفاق میں قریش کے موقف کا اندازہ مشہور مورخ محمد بن حبیب (متوفی ۲۴۵ھ) کے اس بیان سے ہوسکتا ہے:۔

''ہر تاجر جو یمن یا حجاز سے وہاں (دومۃ الجندل جو عرب کے شمال میں ہے) جانا چاہتا ہے تو جب تک قبائل مضر کے علاقے سے گزرنا ہو، قریشی خفارے کے خدمات حاصل کرتا کیونکہ نہ تو کوئی مضر میں اور نہ مضریوں کا کوئی حلیف قریشی خفارے کو تکلیف دیتا۔ چنانچہ قبائل کلب (بنی الجشم سے حلیفی کے باعث) اور قبائل طے [۹] (بنی اسد سے حلیفی کے باعث) قریشیوں کو نہیں چھیڑتے تھے۔ قبائل ربیعہ کے پورے علاقے میں تاجر اپنے لئے بنی عمرو بن مرثد کا خفارہ حاصل کرتے تھے۔۔۔۔ بحرین

کے صدر مقام المشقر کو جانے کے لئے بھی قریشی خفارہ حاصل کیا جاتا تھا۔۔۔۔ جنوبی عرب میں مہرو جانے کے لئے بنی محارب کا خفارہ لیا جاتا تھا۔۔۔۔ حضرموت کے سوق رابیہ جانے کے لئے قریشی کاروان بنی آکل المرار کے خدمات حاصل کرتے تھے۔۔۔ جس کے باعث آکل المرار جلد اپنے حریفوں پر غالب ہو گیا۔۔۔ عکاظ عرب کا سب سے بڑا سالانہ میلہ تھا جس میں تمام عرب کے قبائل سامان لاتے تھے مثلاً قریش، ہوازن، غطفان، عضل، ولیش، حیاء، مصطلق، احابیش وغیرہ۔'' [۱۰]

اس کے سوا زمانہ جاہلیت میں قریش اپنے حج کے سلسلے میں مکے کے مضافات میں منیٰ میں جمع ہوتے تھے۔ ۳ق ھ میں بیعت عقبہ کے سلسلے میں مورخین نے ذکر کیا ہے کہ اہل مدینہ سے ملنے سے پہلے آنحضرت صلعم پندرہ قبائل کے پڑاؤوں میں تبلیغ کے لئے گئے تھے۔ ان میں سے کندہ عرب کے انتہائی جنوب میں رہتے تھے۔ کلب انتہائی شمال میں دومۃ الجندل میں بستے تھے۔ بنی حنیفہ بحرین کے پاس انتہائی مشرق میں آباد تھے۔ ان کے علاوہ وہاں یمن کے، مدینے کے، غرض عرب کے ہر حصے کے لوگ آتے تھے اور یہ ہر سال ہوتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو ۹ھ تاریخ اسلام میں ''عام الوفود'' (سفارتوں کا سال) کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ عرب کے ہر حصے سے مدینے میں سفارتیں ٹوٹ پڑیں اور فاتح مکہ کے مذہب اور فاتح مکہ کی حکومت کو ماننے کا اعلان کرتی گئیں اور یہ سفارتیں بھی عرب کے ہر حصے سے آئی تھیں۔

جیسا کہ اوپر عرض ہوا سیاست نبویؐ کے چند اصول عام اور ہمہ گیر تھے، پہلے انھیں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ مکے سے مقابلہ کرنے میں بھی اتنے ہی ملحوظ رہے جتنے دیگر سیاسی وحدتوں کے سلسلے میں۔

۱۔ تبلیغ رسالت :

سب سے پہلا اصول جو ہر حالت میں پیش نظر رہا وہ یہ تھا کہ جس مشن اور

مقصد کو لے کر آپؐ آئے تھے اس کی اشاعت ہو۔ اس غرض کے لئے ذاتی یا مالی منفعت اور خواہش انتقام کو نظر انداز کرنا بھی گوارا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب آنحضرت صلعم نے شہر مکہ کو بلا شرط اور بزور فتح کرلیا تو یہ بہت آسان تھا کہ اس مالدار شہر کو آپ لوٹ لیتے اور مہاجرین کی مغصوبہ جائیدادوں اور دیگر کثیر جسمانی اور مالی نقصانوں کا بدلہ لیتے۔ ابوسفیان گرفتار ہوکر ہاتھ آئے تو کچھ نہیں تو ان سے چند ہزار کا فدیہ ہی طلب کرتے قریش کی پیشکش پر آپ نے فرمایا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج توڑ کر لا رکھو تو بھی تبلیغ دین سے باز نہیں آسکتا"۔

۲۔ اندرونی استحکام :

کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی جو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو، اکثر حقیر اور کمزور دشمنوں تک کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ تاریخ عالم اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں اس اصول مسلمہ کا بیان مقصود نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ناگزیر باہمی اختلافات کو کس طرح روکا یا دور کیا جاتا تھا اور کس طرح اختلافات کو مٹانے سے اپنی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔

جس وقت آنحضرت صلعم ہجرت کرکے مدینہ آگئے ہیں تو مسلمانان مدینہ اوس اور خزرج کے دو رقیب اور خون کے پیاسے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ابھی بعاث کی معرکہ آرائی کا خون بھی خشک نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں متصادم قوتوں کی سرداری کوئی قابل رشک حالت نہیں کہی جاسکتی جس طرح آج اسلامی مبلغین کو ممالک متحدہ امریکہ میں ایک حل نہ ہونے والی گتھی سے سابقہ ہے کہ وہاں حبشیوں میں تبلیغ کرو تو وہ کہتے ہیں آمنا لیکن آپ گوروں کی، لنچنگ پر اترانے والی ننگ انسانیت، قوم کو اسلام کے برکات سے ہرگز متمتع نہ ہونے دیجئے۔ اور گورے نومسلم نہیں چاہتے کہ حبشی بھی مسلمان ہوکر ان سے سماجی مساوات حاصل کرلیں۔

عرب کے خانہ بدوش بدو آج بھی اپنے حضری اور بستیوں میں رہنے والے بھائیوں کو سخت حقارت سے دیکھتے ہیں عہد نبویؐ میں تو حضری آبادی آج سے بھی کم تھی۔ فوجی مہموں میں بدوی رضا کاروں کا ضبط جیسی صبر آزما چیز ہوگی محتاج بیان نہیں۔

سب سے مقدم یہ کہ ہجرت کر کے مدینے آئے تو وہاں ایک نراج تھا۔ ایک شہری مملکت تک نہیں پائی جاتی تھی۔ چند مدنی عرب قبائل مسلمان ہو گئے تھے اور چند میں ابھی تک اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ ان کے ساتھ ہمسائے میں ہزاروں کی تعداد میں یہودی رہتے تھے جو زراعت، تجارت، صنعت غرض جملہ معاشی زندگی پر حاوی تھے۔ ان میں بھی آپس میں خونریز اور انمٹ رقابتیں تھیں اور ان کا اپنا ایک مذہب اور تمدن تھا اور ان کے اسلام قبول کرنے کی اتنی بھی توقع نہ تھی جتنی لا مذہب بدوؤں کی۔ ان سب کے ساتھ سینکڑوں مہاجرین تھے جو مکے کے بیسیوں قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تمام عناصر میں ایک وفاقی وحدت پیدا کرنا اور مدینے میں ایک شہری مملکت قائم کر کے اس کا ایک دستور مرتب کرنا اور اس کے ذریعے سے راعی و رعایا کے حقوق و فرائض کا تعین کرنا اور پھر ان تمام متصادم اور ضائع ہونے والی توانائیوں کو ایک مرکز پر لا کر ان سے مفید کام لینا، یہ ابتداً سیاست خارجہ ہی کے مسائل تھے اور طے ہو چکنے کے بعد اندرونی مسائل بن چکے تھے۔

مدینے کی حفاظت کے لئے علاوہ، اس اندرونی استحکام کے اس کی ضرورت تھی کہ آس پاس کے قبائل سے دوستی کی جائے۔ چنانچہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی آنحضرت صلعم مدینے کے جنوب مغربی اور ساحل سے متصل علاقے کا بار بار دورہ شروع کرتے ہیں اور ینبوع وغیرہ میں رہنے والے قبائل سے حلیفی کرتے ہیں کہ ان پر کوئی حملہ کرے تو مسلمان ان کو مدد دیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ کرے تو یہ مدد کو آئیں گے۔ بعض معاہدات میں آنحضرت صلعم کے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنے شرط منظور کی گئی تھی، بعض میں اتنی پابندی بھی نہ تھی اور قبیلہ غیر جانبدار رہنے پر آمادہ ہوا

تھا، بعض میں مسلمانوں کی دینی لڑائیوں میں ان قبائل کو مدد دینے کی پابندی سے مستثنٰی کیا گیا تھا۔ بہر حال مدینے کے چاروں طرف دوستوں میں اضافہ اور مخالفوں میں کمی کی مسلسل کوشش جاری رہی، (تفصیلات کے لئے الوثائق السیاسیہ اور فرانسیسی مقالہ ''اسلامی سیاست خارجہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں'' ملاحظہ ہوں)۔

ایک اور اصول یہ قرار دیا گیا تھا کہ عرب میں جو شخص یا خاندان یا قبیلہ مسلمان ہو، وہ ہجرت کر کے مدینہ یا مضافات میں آ بسے۔ یہ سیاست فتح مکہ تک باقی رہی (لاھجرت بعد الفتح مشہور حدیث اسی سیاست کے اختتام کا اعلان تھی) اور بہت کم اس سے استثناء منظور کیا جاتا تھا۔ اس سیاست کا نتیجہ دو گونہ تھا مسلمان فوج کے لئے محفوظ رضا کاروں میں روز افزوں اضافہ اور ان نو مسلموں میں اسلام کی گہرائی۔

۳۔ انسانی خون کی عزت:

عہد نبویؐ میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا جس میں یقیناً کئی ملین آبادی تھی۔ اس طرح روزانہ تقریبا (۲۷۴) مربع میل کے اوسط سے دس ۱۰ سال تک فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کا ماہانہ ایک آدمی قتل ہوا، اسلامی فوج کا نقصان اس سے بھی کم ہے۔[۱۱] ایک حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے۔ انا نبی الرحمة انا نبی الملحمة (میں رحمت کا پیغمبر ہوں، میں جنگ کا پیغمبر ہوں) اس کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے دشمن کے (۷۰) آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے۔ یاد رہے کہ یہ عہد نبویؐ کی سب سے پہلی جنگ تھی۔

۴۔ فنون حرب کی ترقی و استفادہ:

دشمن کو بے بس کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو کم ترین حد تک گھٹا دینے

کے لئے ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ فنون حرب میں اتنا کمال حاصل کیا جائے کہ حریف مقابلہ ہی نہ کر سکے۔ اس غرض کے لئے ہر اچھی چیز، چاہے کسی ملک کی ہو، اختیار کی گئی۔

عربوں میں صف بندی کا رواج نہ تھا۔ جوش کا بے وقت اور بے محل استعمال اور اسلحہ کا بیکار خرچ بھی عام چیز تھی۔ جنگ بدر ہی سے آنحضرت صلعم نے اپنے سپاہیوں میں صف بندی شروع کر دی تھی اور معائنہ میں جو آگے پیچھے نظر آتا تھا اسے درست کیا جاتا تھا۔ (حوالہ ابن ہشام) فتح مکہ کے وقت تو صف آرائی ایک مخصوص افسر کے سپرد ہو گئی تھی جو وازع کہلاتا تھا (حوالہ طبری) ہر فوج کا مہم پر روانگی سے پہلے شہر کے باہر معائنہ (عرض) ہوتا تھا اور کم عمر رضا کار یا سواری یا اسلحہ نہ رکھنے والے یا اور طور پر نامناسب افراد (مثلاً مشرکین، یہودی وغیرہ) واپس کر دیئے جاتے تھے (حوالہ ابن سعد، ابن ہشام، طبری وغیرہ) جنگ بدر میں صف آرائی کے بعد جو جامع ہدایات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ ''جب تک میں حکم نہ دوں کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ دشمن دور ہو تو تیر چلا کر بے کار ضائع نہ کرے بلکہ زد پر آئے تو مارے۔ اس سے قریب آئے تو پتھر پھینک کر مارے۔ اس سے بھی قریب آئے تو نیزہ اور پھر تلوار چلائے''۔ وردی کی غیر موجودگی میں اور شب خون کی ضرورتوں کے لئے اسلامی سپاہیوں کے لئے شعار (واچ ورڈ) مقرر کئے گئے تھے اور ہر دو بدو مقابلے کے وقت سپاہی اسے دہراتا اور حریف وہ لفظ نہ دہراتا تو اطمینان ہو جاتا کہ وہ رفیق نہیں ہے بلکہ دشمن ہے (حوالے ایضاً)۔ خندق کے ذریعے سے محصور شہر کی مدافعت اسی اصول کی ایک دوسری مثال ہے چنانچہ جنگ خندق میں شہر مدینہ پر دشمن کو حملہ آور ہونے سے اسی کے ذریعے سے روک کرنا کام واپس کیا گیا۔

خیبر کی لڑائی میں منجنیق سے دشمن کے محصور قلعے میں پتھر برسائے گئے تھے طائف کے محاصرے میں مزید براں دبابے بھی استعمال کئے گئے تھے جو ترقی پا کر زمانہ

حال میں خود بخود حرکت کرنے والی ٹینک کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

دبابہ ایک پہیہ والی گاڑی ہوتی ہے جس کے اوپر بیل کا یا کوئی اور موٹا چمڑا منڈھ دیا جاتا تھا تاکہ تیروں سے اندر رہنے والے آدمیوں کو صدمہ نہ پہنچایا جا سکے۔ فصیلوں کو کھودنے اور مماثل کام کرنے کے لئے اسے کام میں لایا جاتا تھا۔ طائف میں منجنیق کے علاوہ عرّادہ بھی برتا گیا تھا جو منجنیق ہی کی طرح پتھر وغیرہ دور پھینکتا تھا۔

فوجوں کی مشقیں، گھوڑوں، اونٹوں، گدھوں، وغیرہ کی دوڑ، تیراندازی کے مقابلے اور فوجی اسپورٹ وغیرہ ایک مستقل مضمون کے محتاج ہیں، نماز دل کے ذریعے سے صف بندی، روزے کے ذریعے سے ہر موسم میں سپاہیوں کو بھوک پیاس کی مشق، حج کے ذریعے سے عرفات وغیرہ کے بے آب و گیاہ علاقوں میں کوچ اور قیام کی عادت وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ سرکاری اصطبلوں، محفوظ چراگاہوں اور اسلحہ خانوں کا قیام بھی اسی سلسلے میں قابل ذکر ہے۔

۵۔ خبر رسانی اور ناکہ بندی :

ایک اور چیز جو عام تو تھی لیکن جس کا قریش کے سلسلے میں بہت مکمل نظاہرہ ہوا وہ یہ ہے کہ دشمن کی ہر نقل وحرکت سے پوری طرح باخبر رہیں اور اپنی نقل وحرکت سے اسے آخر وقت تک بے خبر رکھیں۔

اس غرض کے لئے مکے میں بھی آپؐ کے نامہ نگار متعین تھے۔ خندق کے معرکے میں قریش نے مدینے کے شمال کے قبائل غطفان وغیرہ کے دس ہزار کے جم غفیر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اتنا بڑا لشکر عرب میں غیر معمولی بات تھی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں آنحضرتؐ عرب کے شمال میں دومۃ الجندل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ آپؐ کا آدھے راستے سے واپس آجانا اور محاصرہ کنندوں کے پہنچنے سے پہلے دو ہفتے کی مہلت پا کر خندق کی کھدائی کو مکمل کرنا خبر رسانی کے عمدہ انتظام پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح فتح مکہ کی مہم کی تیاری ایک شخص نے مدینے سے قریش کو لکھ بھیجی تو پیام رساں راستے پر پکڑا گیا۔ اپنی خبروں کو پھیلنے سے روکنے کے لئے ناکوں کی بندش (حبس طرق) جتنی مکمل ہو چکی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دس ہزار کا لشکر مدینہ سے مکے کے طرف چلتا ہے اور مضافات مکہ میں پڑاؤ ڈالنے سے پہلے دشمن کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک اور طریقہ غلط سمت میں جانے کی خبر مشہور کرنا تھا کہ دشمن مغالطے میں مبتلا ہو اور غلط سمت میں سفر کر کے چکر کھا کر منزل مقصود پر پہنچنا بھی ہر وقت زیر عمل تھا اور مورخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ ''صرف تبوک کی مہم میں سفر کی درازی اور موسم کی خرابی کے باعث سپاہیوں سے پہلے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ کہاں جانا ہے ورنہ ہمیشہ توریہ (دکھاوا) کیا جاتا تھا۔''

۶۔ معاشی دباؤ:

یہ سب جانتے ہیں کہ قریش نے آنحضرت اور آپ کے متبعین کو کس طرح تکلیفیں دے کر ترک وطن پر مجبور کیا تھا اور کس طرح ان مہاجرین کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح سب لوگ اس سے بھی واقف ہیں کہ قریش کا روزگار زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا اور تبادلہ اشیا کے ذریعے سے وہ نفع کمایا کرتے تھے اور اس غرض کے لئے سردیوں میں جنوب یعنی یمن وغیرہ کو کاروان لے جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام، فلسطین، مصر، عراق وغیرہ جایا کرتے تھے۔

شمالی راستہ اس علاقے سے گزرتا تھا جو مدینہ اور ینبوع کے مابین ہے اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی اس علاقے کے باشندوں سے آنحضرت صلعم نے محالفے پیدا کرنے شروع کر دیئے تھے اور جب اس کی ایک حد تک تکمیل ہوگئی تو قریشی کاروانوں کا راستہ بند کر دیا گیا اور جب وہ زور دکھا دکھا کر گزرنے لگے تو ان کاروان کو حق غنیم کے تحت لوٹ لیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے ساحلی

راستہ مجبوراً ترک کر دیا اور صحرا میں سے ہوکر عراق جانے لگے۔ لیکن جلدی ہی آنحضرت صلعم کا اثر نجد تک پھیل گیا تو وہ راستہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قریش کو بحرین اور یمامہ سے بھی غلہ ملتا تھا۔ ان علاقوں پر اسلامی اثر کے پھیلنے، خاص کر ثمامہ بن اثال کے مسلمان ہونے پر غلے کی برآمد مکے کو روک دی گئی تھی۔ (ابن ہشام) متعدد قیمتی کاروانوں کے لٹنے کے علاوہ ذرائع معیشت کا بند ہو جانا قریش کو مطیع کرنے کا سب سے مقدم اور سب سے موثر ہتھیار ثابت ہوا۔

۷۔ غنیم کے دوستوں کو توڑ لینا:

دوسری اہم تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ مختلف وسائل سے قریش کے دوستوں کو اس دوستی کے توڑنے اور مسلمانوں سے توڑنے پر آمادہ کیا جائے یہ طریقہ بہت آہستہ چلا مگر بلآخر بہت کارگر ثابت ہوا۔

بیعت عقبہ میں جو مدینے والے مسلمان ہوئے تھے وہ اصل میں قریش سے حلیفی کرنے آئے تھے۔ دستور مملکت مدینہ میں مدینے کے یہودیوں کو اس شرط پر کسی حملہ آور کے خلاف مدد دینا منظور کیا گیا تھا کہ وہ قریش کو کبھی کوئی مدد نہ دیں، نہ ان کے جان و مال کو کوئی پناہ۔ اسی دستور میں مدینے کے غیر مسلم عربوں کی حفاظت اس شرط سے منظور کی گئی تھی کہ وہ قریش کو نہ تو خود کوئی مدد دیں اور نہ ان کی جان و مال پر مسلمان حملہ کریں تو آڑے آئیں۔ اطراف مدینے کے قبائل سے بھی معاہدات میں اسے ملحوظ رکھا گیا۔

کاروانی اسٹیشنوں پر جو لوگ رہتے ہیں انھیں کاروانوں کے ٹھہرنے کے زمانے میں کھانے پینے کی چیزیں، پانی اور دیگر ضروریات کی فروخت سے روزگار نکلتا ہے۔ آج کل بھی حجاج کا قافلہ اونٹوں پر جائے تو کئی کئی دن پہلے سے منزلوں پر تیاریاں ہونے لگتی ہیں اور دور دور سے بدوی تربوز، گھی، بھیڑ، بکری وغیرہ وہاں لے جاتے

ہیں۔ قریشی کاروانوں کے رک جانے سے متعدد قبائل نے روزگار کے لئے آنحضرت صلعم سے مدد طلب کی تھی اور اشجع وغیرہ اسی طرح حلیف بنے تھے (حوالہ ابن سعد)۔

اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ [۱۲] صلح حدیبیہ ہے ۶ھ میں مدینہ میں مسلمانوں کو دو خطرے تھے، شمال میں خیبر اور جنوب میں مکہ، دونوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ ممکن نہ تھا۔ دونوں کی بڑھنے والی دوستی کو روکنا اور ہم خیالی کو ہم عملی کی صورت اختیار نہ کرنے دینا بھی ضروری تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ اگر مسلمان خیبر پر حملہ کرنے جائیں تو مدینے کو فوج سے خالی پا کر مکے والے آ کر نہ لوٹ لیں اور مکے پر حملہ کریں تو یہی خدشہ خیبر سے تھا۔ صلح حدیبیہ میں قریش کو اس بات پر آمادہ کر دینا کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں گے (اور اس کے معاوضے میں مسلمان قریش کا تجارتی راستہ کھول دیں گے اور دس سال تک باہم صلح رہے گی) ایک زبردست سیاسی فتح تھی جو مسلمانوں نے حاصل کی کیونکہ قریش کو اس وقت موثر مدد دے سکنے والے صرف خیبری ہی رہ گئے تھے۔ ان کو بچھڑا دینے اور پھر تباہ کر دینے سے قریش کا آئندہ کوئی مددگار نہ رہا۔

۸۔ دشمنوں سے گھرنا:

مذکورہ بالا اصول کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ قریش کے اطراف چاروں طرف مسلمان یا مسلمانوں کے حلیف ممالک اور قبائل جمع ہو جائیں۔ قبائل اسلم وخزاعہ اس کی بہت نمایاں مثال ہیں جو مکے کے اطراف رہتے تھے۔

آنحضرتؐ کا ابتدا سے یہ اصول تھا کہ بات کا پاس رہے اور حلیفوں کی مدد سے کبھی غفلت نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگی برتری، فتوحات کی دھاک، معاشی وسائل پر زبردست اقتدار ان تمام امور نے چو طرف کے چھوٹے چھوٹے قبائل کو آنحضرتؐ کا مطیع کر دیا تھا اور دشمن کو اسی کے دشمنوں سے گھیر لیا جاتا تھا۔

۹۔ دعایہ کاری:

دشمنوں میں پھوٹ ڈالنا بھی ایک مفید اصول کے طور پر اکثر عہد نبویؐ میں برتا گیا تھا۔ جنگ خندق اس سلسلے میں کئی نظیریں پیش کرتی ہے۔ محاصرہ کرنے والے متحدین میں سے قبیلہ غطفان کو اس پر آمادہ کرلیا گیا تھا کہ وہ بعض شرائط پر محاصرہ اٹھا کر اور قریش کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر ان شرائط پر خود مسلمان افسر آمادہ نہ ہوئے گو آنحضرتؐ ان پر راضی تھے۔

دوسری نظیر اسی جنگ خندق میں قریش اور مدینے کے یہودیوں میں پھوٹ ڈلوانا تھا۔ اس میں جتنی زبردست کامیابی ہوئی اس سے سب واقف ہیں کہ قریش نے بیزار ہوکر محاصرہ اٹھادیا اور بے نیل ومرام واپس چلے گئے (گو یہ بھی صحیح ہے کہ ذی قعدہ کا حرام مہینہ شروع ہورہا تھا جس میں قریش جنگ جائز نہیں سمجھتے تھے اور یہ بھی ممکن یا مناسب نہ تھا کہ حج کے زمانے میں مکے سے باہر رہ کر کمائی سے اپنے ہاتھوں محروم رہیں) بہرحال قریش اور یہودیوں میں غلط فہمی پیدا کرانے میں جناب رسالتؐ کا جملہ [۱۳] ''لعلنا امرنا هم'' بھی موثر رہا تھا مشہور حدیث ''الحرب خدعة'' کا بھی یہاں ذکر کیا جاسکتا ہے۔

۱۰۔ دشمن کے ایک طبقے کو موہ لینا:

یہ اصول بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اوپر بیان ہوا کہ قریش کے غلے کی منڈی جو یمامہ میں تھی بند کرادی گئی تھی۔ مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مکے میں قحط نمودار ہوگیا۔ اس سال عرب میں بارش نہ ہونے سے عام کال بھی تھا۔ اس دباؤ کی قوت کا جب قریش کو اندازہ ہوگیا تو پھر یہ بندش اٹھالی گئی، اور وہ بہت ممنون ہوئے۔ (ابن ہشام)

یہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں پانچ سو اشرفی کی خطیر رقم مکے کے سردار ابوسفیان

کو بھیجی گئی کہ مکے کے فقراء میں تقسیم کردے۔ (سرخسی کی مبسوط اور شرح سیر کبیر)

ان کاروائیوں سے مکے میں بیسیوں بہی خواہ پیدا ہو گئے اور اسی طرح کی سیاست سے مختلف مواقع پر اور مختلف ممالک میں مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔

۱۱۔ دشمن میں پھوٹ ڈلوانا:

ابن قتیبہ کے استاد، محمد بن حبیب (ف ۲۴۵) نے اپنی کتاب المنمق (مخطوطہ دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ ص ۱۵۴) میں اس قسم کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب ابو ازیہر کو کسی خانگی دشمنی سے ایک شخص نے مار ڈالا تو جناب رسالتمآبؐ کے اشارے سے حضرت حسان بن ثابت نے آتشیں اشعار کہنے شروع کیے۔ اس سے قریب تھا کہ مکے کے قریش میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی لیکن عین دم آخر ابوسفیان نے دخل دہی کی اور بڑے تدبر سے صورت حال کو یہ کہہ کر سنبھال لیا کہ دشمن (یعنی آنحضرتؐ) چوکس ہے، ایسے وقت خانہ جنگی کہاں کی عقلمندی ہے۔

اصول کا استنباط ہی ہمیں مقصود ہے، انفرادی موقع پر کامیابی یا ناکامی سے یہاں غرض نہیں۔

۱۲۔ معزز دشمنوں کا اسلام میں بھی اعزاز:

اس مختصر تبصرے کے آخر میں اس اصول کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو حدیث میں ہے کہ خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام اذافقھوا (غیر مسلم معزز اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے اگر وہ اسلامی قوانین سے بھی واقف ہو جائیں) یہی وجہ تھی کہ عمرو بن العاصؓ کے اسلام لانے پر انھیں سابقین اولین کا سردار بنا کر فوجی مہموں میں بھیجا گیا ابوسفیان نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف انھیں انعام واکرام دیا گیا بلکہ ان کا گھر امن گاہ قرار دیا گیا۔ انھیں لشکروں کی سرداری اور صوبوں کی گورنری بھی

فورا دی جانے لگی۔ خالد بن الولید کو (باوجود احد میں مسلمانوں کی شکست کا واحد سبب ہونے کے) اسلام لاتے ہی سیف اللہ کے قابل رشک خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

اگر سیرت النبی کا ان امور کی تلاش کے لئے مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف مذکورہ بالا اصولوں کی مزید نظیریں ملیں گی بلکہ اور نئے سیاست کاری کے اصول بھی نظر آسکتے ہیں۔ یقین ہے کہ اہل علم ان سے مستفید ہوکر اوروں کو محروم نہیں رکھیں گے۔

حواشی:

[۱] آنحضرت صلعم کی وفات کے وقت پورا جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین آپ کے زیر نگیں آچکا تھا۔ تفصیل کے لئے ملاخطہ ہو: میری فرانسیسی تالیف ''عہد نبوی اور خلافت راشدہ کی اسلامی سیاست کاری'' دو جلدیں۔

[۲] ایرانی اور بیزنطینی حکومتیں اس وقت کی دو عالمگیر سلطنتیں (World Powers) تھیں

[۳] دیکھئے نقشہ میں مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، مصر، سوڈان، ترکی و شام وحجاز، عراق و ایران، افغانستان، پنجاب وسندھ، ترکستان، بنگال، یونان، ملایا۔

[۴] دیکھئے نقشے میں آبنائے جبل الطارق، آبنائے طرابلس، آبنائے دردانیال و بوسفورس، نہر سوئز، آبنائے باب المندب، آبنائے عمان، آبنائے ملاقہ۔

[۵] عرب، ترک، پٹھان بلوچی، وغیرہ مراد ہیں جن کی تعداد بیس کروڑ سے کم نہیں ہے، ملایا میں سرکاری اعداد کے موافق ساڑھے چھے کروڑ مسلمان ہیں۔ ان کو خارج رکھا گیا ہے۔

[۶] مثلاً جنوبی ہند میں گوا جیسے متعصب کیتھلک علاقے میں نومسلم موجود ہیں۔ نومسلم نیپالی بھی نایاب نہیں ہیں۔

[۷] مثلاً ہندوستان میں یہ ایک عجیب نظارہ ہے کہ بعض قومیں قانون کے ذریعے اپنے مذہب کو بدل رہی ہیں تو مسلمان شریعت اپلیکیشن ایکٹ وغیرہ کے ذریعے رواج کے زنگار کو دور کر رہے ہیں۔ پاریس کے پروفیسر ماسیئوں نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا ہے کہ سرمایہ داری اور

اشتراکیت کا تصادم اس تمدن کے لئے امکانات بڑھا دیتا ہے جو سود کو حرام

[۸] سیاست کاری کی اصطلاح خود یوروپی زبانوں میں اپنے لغوی معنوں سے بہت دور جا پڑی ہے۔ بعض وقت اس سے مراد محض سفارتی تعلقات ہوتے ہیں، بعض وقت اس سے مراد سیاست خارجہ ہوتی ہے، اور بعض وقت سفیروں اور وزرائے خارجہ کی کارکردگی مراد ہوتی ہے اسی آخری مفہوم کے لئے ''سیاست کاری'' کا لفظ برتا گیا ہے جو مکرم ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب کا تجویز کردہ ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ یہ لفظ کام دے سکے لیکن لفظ قابل اشتقاق ہونے اور مفہوم کو اچھی طرح واضح کر سکنے کی بناء پر کافی کارآمد معلوم ہوتا ہے۔

[۹] عربی ادبیات میں قبیلہ طی لٹیروں کی حیثیت سے ضرب المثل ہے۔ یہ عربوں کے ''شہر حرم'' تک کی پروانہیں کرتا تھا۔ پروفیسر کرنیکو نے لکھا ہے کہ اس قبیلے کے لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اسی لئے عربی بدوؤں کے معتقدات کی وہ پابندی نہ کرنے پر قابل ملامت نہیں۔ لیکن لوٹ مار نہ کرنے کی مخالفت اچھی عیسائیت ہے

[۱۰] کتاب المحبر باب اسواق العرب۔

[۱۱] کچھ اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب قانون بین الممالک، ص ۲۰۔

[۱۲] دیکھئے میرا مقالہ مجلّہ ''سیاست'' حیدرآباد اپریل ۱۹۴۲ء میں ''عہد نبویؐ کی سیاست خارجہ کا شاہکار''

[۱۳] اصابہ ابن حجر ۴/ ۳۰۷، مسعود تمام۔

(رسالہ سیاست حیدرآباد دکن) جنوری ۱۹۴۰ء

عہد نبوی کے میدان جنگ

وجوہ جنگ:

عام طور سے معلوم ہے کہ ۱۳ق ھ/ ۶۱۰ء میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مکہ [۱] سے توحید کی دعوت دینی شروع کی چونکہ یہ بلاوا ایک تو ملک کے عام بت پرستانہ موروثی رسم و رواج کے خلاف تھا اور دوسرے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کے داعی کا اپنا سردار بنالینا تھا جو سرداری کو ایک جونیئر گھرانے میں منتقل کرنے کے مترادف ہونے کے باعث اور تو اور خود رسول اللہ کے خاندان (بنی ہاشم) کے متعدد معمر لوگوں کو سخت ناپسند تھا۔ سنیئر گھرانا عملی مخالفت پر اُتر آیا تو عوام بھی گھاس پھوس کی طرح ہوا کا ساتھ دینے اور اس کی رو کے رُخ جھک جانے پر مجبور تھے۔

دنیا کی ہر چیز سے منہ موڑ کر تن من دھن سے اس تحریک کو چلانے اور آٹھ دس سال گزر جانے کے باوجود مکے کا چھوٹا سا قصبہ بھی (جیسا کہ وہ اس وقت تھا) ہمنوا نہ ہوسکا، بلکہ مخالف سے جان ہی کے لالے پڑ گئے۔ شفیق بیوی اور بزرگ خاندان اور حامی و محافظ چچا (ابوطالب) کی ایک ساتھ وفات آپؐ کے لیے معمول سے زیادہ دشواریوں کا باعث بنی، کیوں کہ نئے بزرگ خاندان چچا (ابو لہب) سے شروع ہی سے مخالفت تھی، اور اب اس چچا نے بزرگ خاندان بننے پر ابتدأ تنبیہ کی اور پھر صاف صاف ''جات باہر'' کر دیا۔ مجبوراً آنحضرت کو نئے محافظ ڈھونڈنے پڑے۔ آپ کو

خیال آیا کہ آپ کے ماموؤں (أخوال) کا خاندان بنو عبد یالیل طائف میں بستا ہے [۲] آپ کے چھوٹے چچا اور ولی رفیق حضرت عباس طائف میں رقمی لین دین کر کے کافی رسوخ رکھتے تھے [۳] یہ مقام مکے سے زیادہ دور بھی نہ تھا۔ یہ پچاس میل ہوتا ہے آج بھی مکے سے عصر کے بعد پانچ بجے کے قریب گدھے پر سوار ہوں تو آدمی رات کو جبل کرا کے دامن میں پہنچ جاتے ہیں۔ فجر کو چڑھائی شروع کریں تو قبل ظہر گدھا طائف پہنچا دیتا ہے۔ اونٹ بیس پچیس میل روز طے کر کے طریق الجعرانہ پر دو دن لیتا ہے۔ جدید ''طریق السیارہ'' کے ستر میل ڈاک کی موٹر لاری تین چار گھنٹوں میں طے کر لیتی ہے، غرض طائف، جو عام اہل مکہ کے لیے اس زمانے میں بھی ہر سال گرما میں وہی کشش رکھتا تھا جو اب ہم نتھیا گلی یا مری کے لیے محسوس کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی کھینچتا ہے اور آپؐ بڑی امنگوں کے ساتھ ایک خادم کے ہمراہ وہاں پہنچتے اور وہاں کے رشتہ دار سرداروں میں پرچار کا آغاز کرتے ہیں۔ مکہ چونکہ طائف کے مال کے لیے نکاسی کی منڈی تھی اور ہر سال گرمیوں میں مکے کے مالدار تاجر طائف آ کر اس ''ٹورسٹ ٹرافک'' کے ذریعے سے وہاں کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ بنتے تھے۔ اس لیے طائف کے لیے مشکل تھا کہ مکے کو ناراض کرے۔ پھر یوں بھی توحید کی دعوت طائف میں بھی سیاسی اور مذہبی وجوہ سے وہ تمام شکلیں رکھتی تھی جو مکے میں تھیں۔

طائف میں آج تک وہ باغات اور مقامات محفوظ ہیں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر کے شریر بچوں اور ان کے پتھراؤ سے تنگ آ کر پناہ لی تھی اور بعض فراخ دل باغبانوں نے آپ کی میوے سے ضیافت کی تھی۔ یہ شہر پناہ کے باہر جنوب مغربی سمت میں دریائے وج کے کنارے کنارے جائیں تو انگور انجیر وغیرہ کے باغات میں چھوٹی چھوٹی مرمت طلب مسجدوں کی صورت میں ملتے ہیں۔

غرض طائف کا سفر اتنا بے نتیجہ رہا کہ باوجود جان کے خطرے کے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم مکہ ہی واپس ہونا پسند کرتے ہیں اور اپنے قبیلے سے بے تعلق ہو جانے کے باعث شہر کے باہر ٹھہر کر بعض شناساؤں کی مدد سے شہر کے متعدد فیاض سرداران قبائل سے یکے بعد دیگرے اپنی حفاظت میں لینے کی درخواست کرتے ہیں۔ عام حالتوں میں کوئی عرب کبھی ایسی درخواست کو رد نہیں کرتا مگر آنحضرتؐ کو اپنی پناہ (جوار) میں لینے کے لیے اس وقت غیر معمولی کردار کی ضرورت تھی کیونکہ پورا شہر آپ کا مخالف تھا اور دو تین آدمیوں کے انکار کے بعد آخر ایسا ایک شخص نکل ہی آیا[۴] مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس پناہ دہی کے معاوضے میں یہ اقرار کرنا پڑا کہ شہر میں تبلیغی تقریریں نہیں کی جائیں گی۔

مکے کے باہر تبلیغ پر پابندی نہ تھی اور حج کے زمانے میں مکے سے مشرق میں ڈھائی تین میل پر منیٰ کا اجتماع ایک مشکل سہی لیکن بہرحال کھلا میدان عمل تھا۔ چنانچہ طائف سے واپس آتے ہیں ذوالحجہ ۳ ق،ھ میں آپ نے منیٰ میں عرب کے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب سے آنے والے حجاج کی پندرہ جماعتوں کو یکے بعد دیگرے ٹٹولا [۵] اور ایک تو انہیں اپنی تحریک کے اصول اور غرض و غایت سمجھائی اور دوسرے ان سے درخواست کی کہ ''مجھے اپنے ملک میں لے چلو اور مجھے اپنی حفاظت میں اس تحریک کو چلانے دو۔ جلدی ہی تم نہ صرف پورے عرب کے سردار ہو جاؤ گے بلکہ قیصر و کسریٰ کے خزانے بھی تمہارے پانوں میں نچھاور ہو جائیں گے'' [۶] اس بہ ظاہر بڑے بول پر کسی نے مذاق کیا، کسی نے جھڑک دیا، کسی نے قریش کا ڈر بتا کر اخلاق سے معذرت کر لی۔ استقلال کا کیا ٹھکانہ ہے کہ یکے بعد دیگرے پندرہ جماعتوں سے یہی کوشش کی۔ ہر وقت قریش کا ایک خدائی فوج دار ساتھ لگا رہتا اور دور ہی سے اہل قبیلہ کو لگا بجھا کر کہہ دیتا کہ اس کو مدد دینا نہ صرف ایک مجنون اور جادوگر کا ساتھ دینا ہے بلکہ ہم قریش سے لڑائی مول لینی ہے۔[۷]

منیٰ کے قریب راستے کے دونوں طرف پہاڑوں کی ایک مسلسل دیوار ہے

مکے سے جائیں تو حدود منیٰ شروع ہونے کو بمشکل ایک فرلانگ رہتا ہے کہ بائیں ہاتھ پر اس پہاڑی دیوار میں ایک چھوٹا سا خماؤ آتا ہے جو کمان بلکہ نصف دائرے کی شکل کا ہے اور اتنا بڑا کہ لاہور کی جامع مسجد یا حیدر آباد کی مکہ مسجد مع اپنے صحنوں کے اس کے اندر سما سکیں ۔ یہ مقام عقبہ کہلاتا ہے [۸] اس کے اندر ایک بہت بڑا کنواں ہے اور اندر آج کل زراعت بھی ہوتی ہے اور جس مقام پر مشہور بیعت ہائے عقبہ ہوئی تھیں، وہاں ایک کافی بڑی مسجد بھی ہے جس پر گو چھت نہیں ہے لیکن قبلہ رخ اور منیٰ کی سمت کی بیرونی دیوار پر دو قدیم کوفی کتبے ہیں اسے آج کل مسجد العشرۃ کہتے ہیں ۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہی مسجد بیعت عقبہ ہے کیونکہ تاریخ مکہ کے مشہور ماہر تقی الدین الفاسی نے اپنی تاریخ مکہ کے آخری اڈیشن ''تحصیل المرام فی اخبار البلد الحرام'' (مخطوطۂ قردمین فاس) میں لکھا ہے :۔

''مسجد البیعتہ ...... وھذا المسجد بقرب عقبة منی و بینه وبین العقبه غلوۃ واکثر وھو علی یسار الذاهب الی منی و عمر فی سنته ۱۴۴ ثم ۶۲۹ من قبل المستنصر العباسی والعمارۃالسابقة من قبل المنصور''

ترجمہ :۔ (مسجد البیعہ ...... یہ مسجد منیٰ کی گھاٹی کے قریب ہے اتنا کہ اس کا اور گھاٹی کا فاصلہ پتھر پھینکنے کی زد یا اس سے کچھ زیادہ ہے اور یہ منیٰ کو جانے والے کے بائیں ہاتھ پر ہے ۔ یہ مسجد ۱۴۴ھ میں بنی اور پھر ۶۲۹ھ میں مستنصر باللہ عباسی نے تعمیر کی ۔ پہلی تعمیر منصور کے زمانے کی ہے)

غرض یہ عقبہ ایسا ہے کہ پچیس پچاس آدمی وہاں رہیں تو منیٰ آنے جانے والے اسے محسوس بھی نہیں کرتے ۔ مدینے کے پانچ چھ آدمیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہیں ملاقات ہوئی ۔ یہ واضح نہیں، آیا کہ یہ چھوٹی سی جماعت یہیں اپنا خیمہ لگا کر مقیم تھی ، یا کسی وجہ سے اس ملاقات کے وقت اس عقبہ میں آئی ہوئی تھی اس

جماعت نے اسلام اور توحید کی دعوت سنی تو شوق سے گفتگو کی اور ہر طرح امداد کا وعدہ کیا (ابن ہشام ص ۲۸۶ و مابعد)

اس جماعت کے؟ سے اس ذہنی فرق کا باعث معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ اصل میں یہ مدینے والے قبیلے خزرج کے لوگ تھے۔آنحضرت کی والدہ کا اسی قبیلے سے رشتہ تھا[۹] چنانچہ اس تقریب سے بچپن میں آنحضرت بھی ایک مرتبہ اپنی والدہ کے ساتھ مدینہ ہو آئے تھے اور اتنے دن رہے تھے کہ وہاں اچھی طرح تیرنا بھی سیکھ لیا تھا۔[۱۰] آنحضرت کے چچا اور رفیق حضرت عباس بھی جب کبھی کاروبار کے سلسلے میں شام وغیرہ جاتے یا وہاں سے آتے تو راستے میں ضرور مدینے میں ٹھہرتے اور ان رشتہ داروں سے ملتے۔[۱۱] ان لوگوں کی مدینے کے بعض یہودی قبائل سے حلیفی اور بعض سے حریفی تھی اور یہ ان یہودیوں سے اکثر سنا کرتے تھے کہ جب مسیح موعود آئے گا تو ہم اس کی مدد سے اپنے تمام دشمنوں کو مغلوب کر لیں گے۔[۱۲] نوفل اور عبدالمطلب کے جھگڑے کے وقت یہ لوگ آنحضرت کے دادا کی فوجی مدد بھی کر چکے تھے۔[۱۳] اس لیے ممکن ہے کہ اب آنحضرت کے خاندان کی مدد کی وہ توقع رکھتے ہوں۔ بہرحال ان کی ذاتی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان کے اسلام لانے میں یہ محرکات بھی کام کرتے رہے ہوں گے۔

مدینے میں دو رشتہ دار قبائل اوس و خزرج میں نسلوں سے خونریزیاں ہوتی چلی آرہی تھیں اور اب دونوں اس قدر تھک گئے تھے کہ کسی بھی قیمت پر باہم دوستی کر لینے پر آمادہ تھے۔[۱۴] ان کی خودداری اور غیرت و رقابت کے باعث کسی غیر مدنی کے لیے دونوں کا مشترکہ سردار بننے کی زیادہ توقع تھی جب مذکورہ چھے (۶) خزرجی مدینہ واپس آئے اور اسلام کا چرچا کیا تو سال بھر بعد حج کے موقع پر اوس اور خزرج دونوں کے دس بارہ آدمی آنحضرت سے ملنے کی ٹھان چکے تھے۔ چنانچہ پھر اسی عقبہ میں ان کی آنحضرت سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ

اپنے اپنے خاندان کے بھی اسلام اور آنحضرت کی اطاعت کا اظہار کیا۔آنحضرت نے ان سے علاوہ توحید، پاکبازی وغیرہ کے ہر اچھی بات (معروف) میں اپنی اطاعت کا وعدہ لیا[۱۵] اور اس طرح اوس اور خزرج کے بارہ خاندانوں کے مشترکہ سردار بن گئے۔ایک تربیت یافتہ مبلغ مکے سے ان کے ہمراہ مدینے بھیجا گیا[۱۶]اور اس نے نہ صرف اوس اور خزرج کے متعدد سر برآوردہ لوگوں کو اسلام کا حامی بنایا بلکہ اس بات میں بھی بدقت مگر مکمل کامیابی حاصل کی کہ اوس و خزرج کی باہمی رقابت اس بات پر مانع نہ آئے کہ یہ دونوں گروہ آنحضرت کی مشترکہ سرداری میں تعاون کریں۔

ایک اور سال گزرا اور اق ھ میں مدینے کے کوئی پانچ سو حاج میں سے کوئی بہتر مرد اور عورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شخصی طور پر اظہار اسلام کرنے اور آپ کو مدینہ مدعو کرنے کے لیے آئیں۔ابھی تک اسلام وہاں اقلیت کا مذہب تھا ورنہ اکثریت قریش سے دوستی بڑھانے کی فکر میں تھی۔نو دس بجے رات کا عمل تھا کہ یہ بہتر (۷۲) لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں چپکے چپکے اپنے پڑاؤ سے نکل کر عقبہ میں جمع ہوتے گئے اور آنحضرت بھی مقررہ وقت پر اپنے چچا حضرت عباسؓ کے ساتھ وہاں آگئے۔آنحضرت نے تفصیل کے ساتھ اپنی تحریک کے اغراض و مقاصد سمجھائے۔ انہوں نے آمنا وصدقنا کہا اور آنحضرت اور دیگر مکی مسلمانوں [۱۷] کو مدینہ چلے آنے کی دعوت دی اور یقین دلایا کہ مدینہ آئیں تو ''ہم آپ کی ایسی ہی مدد اور حفاظت کریں گے جیسی کوئی اپنی اور اپنے بال بچوں کی کرتا ہے''۔جب انہیں واضح کیا گیا کہ شاید انہیں خدا کی ساری خدائی سے لڑائی کرنی پڑے تو بھی وہ پیچھے نہ ہٹے اور یقین دلایا کہ ہم اپنی بات سے کبھی نہیں پلٹیں گے۔آنحضرت نے سب سے ہاتھ ملایا اور کہا میں بھی اب تمہارا ہوں، تمہاری جنگ میری جنگ ہو گی اور تمہاری صلح میری صلح۔[۱۸]

یہ وہ مشہور بیعت عقبہ ہے جس نے اسلام کی سیاسی زندگی کا سنگ بنیاد رکھا اور ظاہر ہے کہ جب قریش کو اس کی اطلاع ہوئی تو سخت چیں بہ جبیں ہوئے اور اسے

براہ راست اپنے خلاف جتھا بندی خیال کیا۔ جب انہوں نے آنحضرت کے قتل کا ارادہ کیا تو یہ تمام دوستی یا رواداری کا اختتام اور کھلا اعلان جنگ تھا۔

آنحضرت نے پہلے اپنے ساتھیوں اور مکے کے عام مسلمانوں کو مدینے بھیج دیا اور تین ہی ماہ بعد عین اس وقت جب آپ کی جان کے خلاف ایک سخت خطرناک اور زبردست سازش کی گئی تھی [۱۹]۔ مکے سے نکلتے غار ثور میں چھپتے عام راستے سے بچتے اور پہاڑوں اور وادیوں سے ہوتے ہوئے مدینے کی جنوبی آبادی قبا پہنچتے ہیں۔ مکے سے آپ کے لاپتہ ہونے کی خبر مدینہ پہنچ گئی تھی اور سب سمجھ گئے تھے کہ آپ مدینہ آرہے ہیں۔ بڑی بیتابیوں اور انتظار کشیوں کے بعد ایک دن دوپہر کے قریب دو اونٹوں کا ایک مختصر قافلہ جس میں آنحضرت اور آپ کے یار غار حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ایک غلام اور ایک رہبر تھا، قبا پہنچا۔ دور سے نظر پڑتے ہیں منٹوں میں اوس اور خزرج کے تمام مرد ہتھیاروں سے سج کر اپنی بستی سے ایک یا ڈیڑھ فرلانگ بڑھ کر ثنیۃ الوداع کی ٹیکری پر اعزازی دستے کے طور پر راستے کے دونوں طرف جمع ہو گئے، لڑکیاں دف بجانے لگیں اور لڑکوں کے ساتھ یہ استقبالی گیت گانے لگیں۔

طَلَعَ البدرُ عَلَینَا — مِن ثنیاتِ الوداع
وجبَ الشُکرُ عَلَینَا — مَادعا لِلّٰہِ داع
ایھا المبعوث فینا — جئت بالاٴمرِ المطاع

(تاریخ ذھبی)

ترجمہ: (۱)، چودھویں رات کا چاند ہم پر ثنیۃ الوداع سے طلوع ہوا۔ (۲) ہم پر اس وقت تک شکر واجب ہے جب تک کہ کوئی عابد خدا کی عبادت کرتا رہے۔ (۳) اے وہ جسے ہمارے پاس بھیجا گیا ہے تو ایسی چیز لایا ہے جس کی اطاعت کی جائے گی۔

بعض عرب مورخ لکھتے ہیں کہ مدینہ آتے وقت راستے میں بریدۃ الاسلمی نے اپنے کئی درجن ساتھیوں کے ساتھ آنحضرت سے ملاقات کی اور جھنڈے اڑاتے

ہوئے ہم رکاب ہو کر محافظ دستے کا فریضہ انجام دیا۔[۲۰] لیکن حیرت ہے کہ مدینہ (قبا) پہنچنے کی جتنی تفصیلیں ملتی ہیں ان میں اس اعزازی محافظ دستے کی ہمراہی کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ یا تو آنحضرت نے انہیں تھوڑی دور ساتھ رکھ کر رخصت کر دیا ہوگا۔ یا یہ قبا میں ملے ہوں گے اور قبا سے مدینہ جاتے وقت ساتھ گئے ہوں گے۔ ادھر قریش آنحضرت کے بچ نکلنے پر سخت جھنجھلائے اور کچھ نہ سوجھا تو آپ کی اور دیگر مہاجرین کی جائیدادیں ضبط کر لیں (صحیح بخاری کتاب ۶۴ باب ۸۴ حدیث ۳ سیرۃ ابن ہشام ص ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۳۹) اور باقی غریب مسلمانوں کو زیادہ ستانے لگے۔ آنحضرت کا ضبط شدہ مکان وہ تھا جو آپ کو بی بی خدیجہؓ سے وراثت میں ملا تھا۔ (مبسوط سرخسی ۱۰۔۵۲)

اب عمل کا اصل کٹھن وقت آیا۔ آنحضرت نے ایک طرف مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ میں بھائی چارہ قائم کرا کے بے گھروں کو ٹھکانہ مہیا کیا [۲۱] اور اصول یہ قرار دیا کہ جس مہاجر اور انصاری میں بھائی چارہ ہو وہ باہم وارث بھی ہوں [۲۲] اور مل کر رہیں۔ پھر اپنے اور اپنے جملہ متبعین کے حقوق و فرائض مرتب کر کے ان کو تحریری صورت دی [۲۳] اس کے بعد مدینے میں رہنے والے یہودی قبائل سے بھی جنگی اور سیاسی حلیفی کی اور انہیں بھی اس پر آمادہ کیا کہ وہ آپ کو اپنا مشترکہ حاکم مانیں [۲۴] مدنی عربوں کی طرح مدنی یہودیوں میں بھی دو رقیب و حریف پارٹیاں تھیں اور آنحضرت کی مشترکہ سرداری ان میں امن قائم کرانے کا باعث ہونے سے انہیں ناگوار بھی نہ تھی۔ یہودیوں کے یہ معاہدے بھی تحریر میں آئے اور ان تمام دستاویزات نے ایک مشترکہ ''صحیفہ'' کی صورت اختیار کی جسے ''شہری مملکت مدینہ کا دستور'' کہنا (جیسا کہ ولہاؤزن نے کہا ہے) بے جا نہیں۔ خوش قسمتی سے اس دنیا کے سب سے پہلے تحریری دستور کو تاریخ نے لفظ بہ لفظ محفوظ رکھا ہے [۲۵] اس دستور کے ذریعے سے شہر مدینہ ایک حرم اور ایک سیاسی وحدت یا ایک شہری مملکت قرار دیا گیا۔

اصطلاح ''حرم'' کے سلسلے میں شاید یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ ایک نیم

مذہبی نیم سیاسی مفہوم رکھتی ہے اور اس کا رواج اسلام کے پہلے ہی سے نہ صرف عرب کے مختلف مقامات پر بلکہ فلسطین اور یونان وغیرہ میں ملتا ہے۔اس کا مذہبی مفہوم یہ تھا کہ وہاں کی ہر چیز کو ایک تقدس حاصل رہے، وہاں کے چرند و پرند کا شکار نہ کیا جائے۔ وہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں اور وہاں خونریزی نہ کی جائے اور وہاں آنے والوں کو دوران قیام میں امن اور پناہ میں سمجھا جائے خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہوں۔حرم کا سیاسی مفہوم یہ تھا کہ وہ اس شہری مملکت کے حدود کا تعین کرتا تھا (میں نے ایک مستقل مقالے میں تفصیل سے شہری مملکت مکہ کے سیاسی نظام پر جو زمانہ جاہلیت میں تھا، بحث کی ہے [۲۶]) مکے کے حدود حرم، کہتے ہیں کہ عہد ابراہیمی سے چلے آتے ہیں۔ بہر حال زمانہ جاہلیت میں ان کا پتہ چلتا ہے اور فتح مکہ پر ۸ھ میں آنحضرت نے ان علامات سرحد کی تجدید بھی کرائی تھی [۲۷] جس کے حسب ضرورت اب تک برابر تجدید ہوتی چلی آ رہی ہے۔

زیر ذکر دستور مملکت مدینہ میں مدینے کو بھی ایک حرم قرار دیا گیا ہے۔ ۹ھ میں طائف نے اطاعت کی تو طائف کو بھی حرم تسلیم کیا گیا، جیسا کہ اس کے معاہدے میں [۲۸] صراحت اور تفصیل سے لکھا ہوا ملتا ہے، لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مدینے میں بھی حدود حرم مقرر کئے گئے، صحیح بخاری [۲۹] میں اتنا ذکر ہے کہ آنحضرت نے ایک صحابی کو روانہ کیا تھا تا کہ حرم مدینہ کے حدود پر ستون نصب کریں۔عام تاریخیں اور کتب حدیث میں حرم مدینہ ''مابین ثور و عیر'' بیان کیا گیا ہے [۳۰] ان سنگلاخ میدانوں کو کہتے ہیں جہاں آتش فشاں پہاڑوں سے نکلا ہوا لاوا پتھروں کی صورت میں پھیلا ہوا ہو۔اور ''حرہ'' اس میدان کو کہتے ہیں جہاں کے پتھر لاوے سے جل گئے ہوں۔مدینہ منورہ کے سلسلے میں کبھی ایک لفظ آتا ہے کبھی دوسرا لفظ، ایسے میدان شہر مدینہ کے مشرق او رمغرب دونوں طرف شمالاً جنوباً ملتے ہیں۔ثور ایک پہاڑ ہے جو مدینے کے شمال میں جبل احد سے بھی کچھ پرے واقع ہے۔اور جبل عیر مدینے

کے جنوب میں ایک بڑا پہاڑ ہے۔المطری نے (جن کی وفات آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں ہوئی) شہر مدینے کی جو نہایت اہم تاریخ (التعریف بما انست الھجرۃ من معالم دار الھجرۃ) لکھی ہے اور جو جملہ متاخرین کا ماخذ ہے اس میں خوش قسمتی سے اس کی مزید تفصیل ملتی ہے جو یہ ہے:۔

عن کعب بن مالک قال بعثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم علی اشراف حرم المدینہ فاعلمت علی اشراف ذات الجیش و علی مشیرب وعلی اشراف مخیض وعلی الحفیّاو علی ذی العشیرۃ وعلی تیم ۔فاما ذات الجیش فنقب ثنیتہ الحفیرۃ من طریق مکۃ والمدینہ و اما مشیرب نما بین جبال فی شامی ذات الجیش، بینھا و بین خلائق الضیوعۃ واما اشراف مخیض فجبال مخیض من طریق الشام و اما الحفیاء فبالغا بۃ من شامی المدینہ واماز والعشیرہ فنقب فی الحفیاء واماتیم فجبل فی شرقی المدینہ و ذالک کلہ یشبہ ان یکون بریدانی برید...... ذات الجیش فی وسط البیداء والبیداء ھی التی ازادخل الحجاج بعد الاحرام من ذی الحلیفہ استقبلو ھا مصمدین الی جھۃ الغرب"

ترجمہ: کعب بن مالک سے مروی ہے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ فرمایا کہ حرم مدینہ کی بلندیوں پر علم (یا منارے) تعمیر کروں۔ چنانچہ میں نے ذات الجیش کے ٹیلوں پر علم تعمیر کئے اور مشیرب پر اور مخیض کے ٹیلوں پر اور حفیا پر اور ذی العشیرہ پر اور تیم پر۔ذات الجیش تو حفیرہ کی پہاڑی کے کنارے ہے جو مکے اور مدینے کے راستے پر ہے مشیرب تو ذات الجیش کے شمال میں پہاڑوں میں ہے اور اس کے اور خلائق کے مابین ضبوعہ واقع ہے۔مخیض کے ٹیلے تو شام کے راستے میں مخیض کے پہاڑوں میں ہے۔حفیا تو غابہ (جنگل) میں ہے جو مدینہ کے شمال میں ہے ذوالعشیرہ تو

حفیاء کے کنارے پر ہے اور تیم ایک پہاڑ ہے جو مدینے کے مشرق میں ہے۔

یہ سب تقریباً ایک منزل طویل اور ایک منزل عریض ہوتا ہے ......ذات الجیش تو بیداء کے وسط میں ہے اور بیداء وہ مقام ہے کہ حاجی احرام باندھ کر ذوالحلیفہ سے آگے بڑھیں تو بلندی پر چڑھتے وقت مغرب کی جانب اس مقام میں داخل ہوتے ہیں۔

مدینہ منورہ کے مشہور سیاح اور وہاں کے کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت کے مہتمم ابراہیم حمدی قرپوطلی کا مجھ سے بیان تھا کہ مدینے کے مشرق میں ان حدود حرم کے کھنڈر اب تک موجود ہیں اور پائے سے کوئی ہاتھ بھر اونچے باقی ہیں۔ چوں کہ عہد نبوی کے بعد ان حدود حرم مدینہ کی تجدید کا کہیں پتہ نہیں چلتا اس لئے جبل تیم کے یہ آثار خاص عہد نبوی کی متبرک تعمیر معلوم ہوتے ہیں۔

اس ایک حد تک غیر متعلق بحث کے بعد جیسا کہ بیان کیا گیا، مدینہ آنے پر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کام ایک شہری مملکت کی بنیاد ڈالنا تھا۔ ادھر سے فراغت ہوئی تو آنخضرت نے آس پاس کے علاقے پر توجہ مبذول کی۔ عرب کے نقشے پر نظر ڈالیں تو واضح ہوتا ہے کہ مکے والے خشکی کی راہ اگر شام یا مصر جانا چاہتے تو مدینے کے قریب سے ساحل کے کنارے کنارے گزرنا پڑتا ہے اگر مدینے سے ینبوع تک بسنے والے قبائل اور آبادیوں کو ہمنوا کر لیا جائے تو مکے والوں کے قافلے کا ادھر سے گزرنا بڑی آسانی سے خطرناک کر دیا جا سکتا ہے ان قبائل سے انصار کی پہلے ہی سے حلیفی تھی۔ اب آنخضرت نے اس کی تجدید کی اور اس میں جنگی امداد کی دفعہ بھی بڑھائی [۳۱]

اس تنظیم اور خاموش تیاری میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس کے بعد مدینے سے چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھیج کر قریشی کاروانوں کو ہراساں کیا جانے لگا [۳۲] اور ان کو یہ بتایا جانے لگا کہ اب انہیں اسلام کے زیر اثر علاقے سے گزرنا ہے تو سردار مدینہ کی

اجازت ضروری ہے۔ قریش نے زور دکھانا اور قوت کے ذریعے سے اپنا راستہ بنانا چاہا۔ اسی کش مکش نے ان خونریزیوں اور لڑائیوں کی صورت اختیار کی جن کے ایک خاص پہلو ''یعنی میدان ہائے جنگ'' پر آج یہاں روشنی ڈالنی مقصود ہے۔

بدر

محل وقوع:

چوں کہ حجاز یعنی عرب کے مغربی علاقے میں پہاڑیاں ہی پہاڑیاں ہیں اس لئے وادیاں گھاٹیاں ہی آنے جانے کا راستہ ہیں۔ کاروانی راستہ عموماً چوڑی وادیوں سے گزرتا ہے۔ گھاٹیوں کا راستہ زیادہ دشوار ہے۔ غرض کسی جگہ جانے کے لئے یہاں ایک سے زیادہ راستے ہوتے ہیں۔ یہی حال بدر کا ہے۔ عہد نبوی اور اس سے پہلے مکے، مدینے اور بدر کا راستہ جن مقاموں یا منزلوں سے گزرتا تھا۔ وہ اب بڑی حد تک بدل گیا ہے کیوں کہ جب سے اسلام آیا اور حجکو جانے والے ہزاروں سے گزر کر لاکھوں ہونے لگے اور ابھی پہلی جنگ عظیم سے پہلے دس دس پندرہ پندرہ ہزار اونٹوں کے قافلے معمولی بات تھی۔ تو لازمی طور پر پانی اور پڑاؤ کی ضرورتوں نے بعض منزلوں کو بدلنے پر مجبور کیا اور ترکی زمانے کا ''طریق سلطانیہ'' وجود میں آیا۔ آج کل یہی اختیار کیا جاتا ہے۔ سعودی دور میں موٹریں بھی آ گئی ہیں۔ ان کے راستے کی ضرورتیں اور ہی ہیں۔ اسی طرح سفر صلح حدیبیہ کا راستہ الگ تھا۔ غزوۂ فتح مکہ میں قریش کو خبر نہ ہونے دینے کے لیے ایک بالکل اور ہی راستہ اختیار کیا گیا تھا اور سفر حجۃ الوداع کا ایک اور جن کی تفصیلیں ابن ہشام وغیرہ میں ملتی ہیں۔

بدر کو اب تک موٹر نہیں جا سکی ہے کیونکہ راستہ میں کئی جگہ بلند گھاٹیاں ہیں اور بہت نرم ریت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاص انتظام کے بغیر مکے اور مدینے کے مابین اونٹوں کے سفر پر بھی بدر پر سے نہیں گزر سکتے۔ مدینے سے آنے والے مسجد

[۳۳] پر طریق سلطانیہ چھوڑ دیتے ہیں اور قصبہ خیف سے گزر کر حمراء میں منزل کرتے ہیں پھر قصبہ حسکفیہ سے گزر کر بدر پہنچتے ہیں اس کے برخلاف مکے سے جانے والے برا شیخ پر سے کسی قدر آگے درب البحرہ پر طریق سلطانیہ چھوڑتے ہیں اور صبح نکلیں تو شام تک بدر پہنچ جاتے ہیں۔ بدر سے مدینے تک کا راستہ بہت سرسبز ہے میلوں لمبے نخلستان ہیں، راستے میں خاص کر بدر و حمراء کے مابین گھنے جنگل بھی ہیں، پانی بھی میٹھا ہے، اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے گلے بھی ہر جگہ چرتے نظر آتے ہیں۔

موجودہ شہر بدر:

شہر بدر کی تاریخ سے یہاں بحث نہیں ہے آج کل یہ ایک بہت بڑا گاؤں ہے۔ کئی سو پختہ مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں جن کو مقامی اصطلاح میں قصر (جمع قصور) کہتے ہیں۔ شہر مین دو مسجدیں ہیں۔ ایک پنج وقتہ نماز کے لیے ہے جس میں ایک منارہ یا اذان دینے کا ''ماذنہ'' بھی ہے۔ دوسری مسجد جسے مسجد غمامہ اور مسجد عریش بھی کہتے ہیں یہاں کی جامع مسجد ہے۔ کیونکہ اس جگہ تعمیر ہوئی ہے جہاں غزوۂ بدر کے موقع پر جناب رسالت مآب کے لیے عریش یا جھونپڑی تیار کی گئی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ جہاں سے میدان جنگ کو دیکھ سکتے ہوں گے [۳۴] مگر آج کل باغوں اور کھجور کی اونچی پیڑوں کی وجہ سے وہاں سے بدر کا معرکہ کارزار نہیں دیکھ سکتے۔ پانی کا چشمہ جو زمین دوز نہر کی صورت میں ہے، ان ہر دو مسجدوں کے صحن میں سے گزرتا اور وضو کے حوضوں کا کام دیتا ہے۔ آبادی سے ملا ہوا دور تک کئی میل کے رقبے پر پھیلا ہوا نخلستان کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ جس میں کچھ ترکاری بھی کاشت ہوتی ہے۔ ہر جمعہ کو یہاں ایک بازار لگتا ہے جس میں دور دور سے بدو آتے اور خرید و فروخت یا تبادلہ اشیاء کرتے ہیں۔ بدو عموماً گھی، کھالیں، روغن بیلسیاں، اونٹ، بکریاں اور اونی کمبلیں یا عبائیں فروخت کے لیے لاتے ہیں۔ قبل اسلام بدر میں

سالانہ ہر ہفتہ بھر ایک بڑا میلا لگتا تھا [۳۵] اور غالباً یہاں ایک بڑا بت خانہ بھی تھا۔ اس کے آثار تو اب نہیں ہیں لیکن برائیشع سے بدر کو جائیں تو بدر کے قریب کوئی میل بھر پہلے سڑک کے قریب ایک عجیب شکل کی چٹان ملتی ہے جو بالکل بیٹھے ہوئے اونٹ کی طرح نظر آتی ہے زمانہ جاہلیت میں عرب ہر ایسی چیز کی پوجا شروع کر دیتے تھے۔کوئی تعجب نہیں جو یہ بھی ایک بت رہا ہو۔

بدر ایک بیضوی شکل کا میدان ہے۔کوئی ساڑھے پانچ میل لمبا اور تقریباً چار میل چوڑا، اطراف بلند پہاڑ ہیں۔مکہ،شام اور مدینہ جانے کے راستے جو وادیوں میں سے گزرتے ہیں، یہیں ملتے ہیں۔ترکی دور میں شریف عبدالمطلب نے اس میدان میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا تھا اب وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔یہ میدان سنگلاخ یا ریتیلا ہے مگر جنوب مغربی حصے کی زمین نرم ہے۔ جنگ بدر کے دن بارش ہوئی تھی تو یہ مقام جہاں قریش کا پڑاؤ تھا، دلدل بن گیا تھا [۳۶]۔مگر اب یہاں ایک سرسبز نخلستان ہے۔

بدر کے اطراف جو پہاڑ ہیں ان کے مختلف حصوں کے نام مختلف ہیں۔ان میں دور دور سے سفید ریت کے تودے نظر آتے ہیں۔آج بھی ان سفید پہاڑیوں میں سے سفید کا نام العدوۃ الدنیا اور دوسری کا العدوۃ القصویٰ ہے۔ان دونوں کے درمیان جو بہت اونچا پہاڑ ہے اسے اب جبل اسفل کہتے ہیں۔کیوں کہ اس کے پیچھے دس بارہ میل پر سمندر ہے اور ابو سفیان کا قافلہ راستہ کترا کر ساحل کے کنارے کنارے گزر گیا تھا تو قرآن میں اس کا ذکر **والرکب اسفل منکم** (کارواں تم سے نیچے تھا) کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔بدر سے سمندر کی مسافت کے متعلق واقدی [۳۷] نے **ھی من الساحل علی بعض نہا**' (وہ ساحل سے دن کے کچھ حصے پر واقع ہے) لکھا ہے، جو چاہے موٹر کے لیے صحیح ہو لیکن اونٹ پر سفر کے لیے یقیناً ممکن نہیں، واقدی نے محض قیاس کیا ہوگا۔ بجز اس کے کہ اب سمندر ہٹ گیا ہو۔
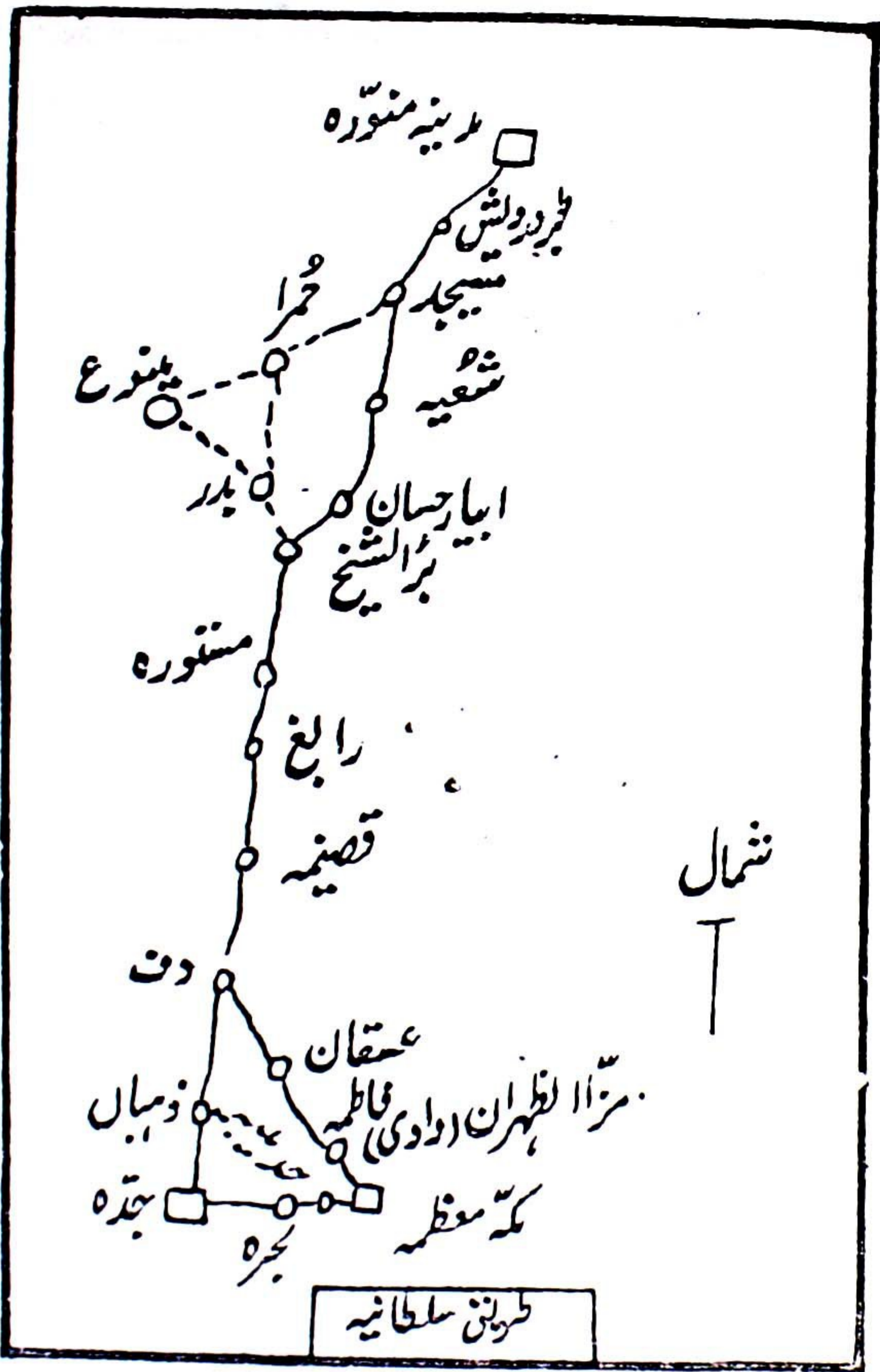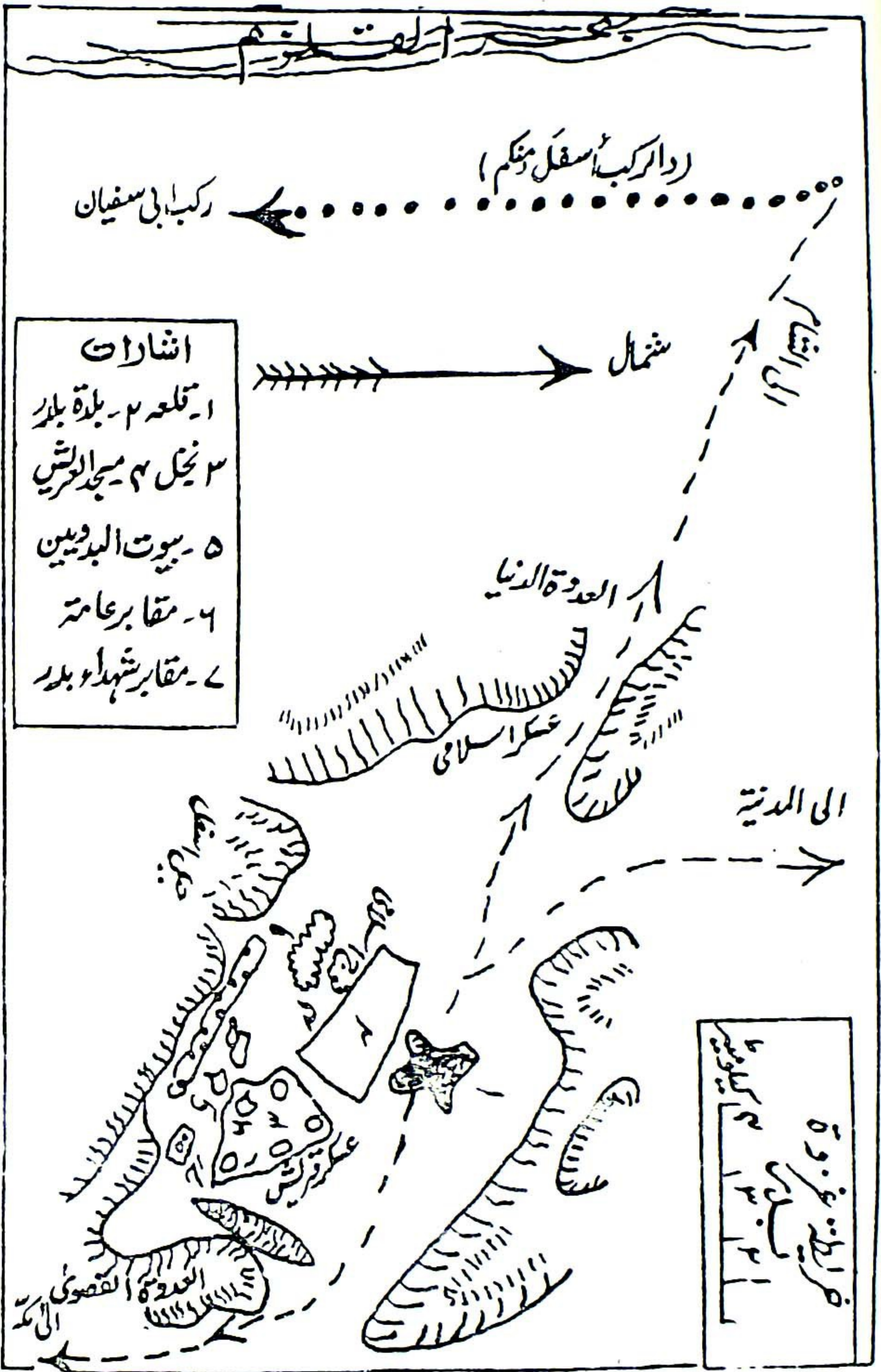
مدینہ منوّرہ
بئر درویش
مسیجد
حُمرا
ینبوع
شعُیبہ
بدر
ابیارِ حسان
بئرالشیخ
مستورہ
رابغ
قصیمہ
شمال
دف
عسفان
مرّ الظہران (وادی فاطمہ)
ذہبان
جدّہ
بحرہ
مکّہ معظمہ
طریق سلطانیہ

جنگ بدر کی چند تفصیلیں:

ایک طرف تو قریش کا مسلمانوں پر مظالم توڑ کر انہیں جلا وطنی پر مجبور کرنا، جلا وطنی پر ان کی جائیدادوں کو ضبط کر لینا [۳۸] اور اس کے نئے مسکن (حبشہ اور پھر مدینے) میں وہاں کے حکمرانوں اور باا ثر لوگوں کو ان تارکین کو پناہ نہ دینے کی ترغیب [۳۹] دینا اور دوسری طرف ان ناانصافیوں کا بدلہ لینے کے لیے مدینہ سے مسلمانوں کا قریش پر معاشی دباؤ ڈالنا اور بزور قریشی قافلوں کی آمد ورفت کو اپنے زیر اثر علاقے میں روک دینا یہی بدر کی لڑائی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

قریشی قافلوں کو لوٹ یا ڈاکہ اس وقت سمجھا جائے جب یہ بے قصور ہوں اور لوٹنے والے حکومت نہیں بلکہ خانگی افراد ہوں۔ ورنہ دو سلطنتوں میں کشیدگی پر نہ صرف جان و مال و آبرو کے خلاف بھی ہر فریق دوسرے کو نقصان پہنچانے کا پورا حق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے میں ان لوگوں سے متفق نہیں ہوں جو قریشی قافلوں کو لوٹنے کے لیے بھیجی ہوئی مہموں کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔

شبلی مرحوم [۴۰] نے ''کانما یساقون الی الموت [۴۱] کی آیت سے استدلال کر کے کم از کم جنگ بدر کی حد تک اپنی رائے کو مستحکم کر لیا ہے کہ آنحضرت قافلے کو روکنے کے لیے نہیں بلکہ قریشی امدادی دستے سے مقابلے کے لیے نکلے تھے، لیکن ''اِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّائفتینِ اِنَّھَا لکم و تو دّوْنَ ان غَیر ذاتِ الشوکہ تکُون لکُم [۴۲] کی صریح آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینے سے چلتے وقت مسلمانوں کو یقین نہ تھا کہ آیا وہ قافلے سے ملیں گے یا امدادی دستے سے مڈبھیڑ ہوگی۔ دونوں امکانات تھے چونکہ قریشی قافلہ ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل اور پانچ لاکھ درہم کا اسباب لے کر آ رہا تھا [۴۳] اس لیے مدینہ والوں کو یقین تھا کہ اس مدد اور حفاظت کے لیے قریش اپنے تمام حلیفوں کی مدد سے ہزاروں آدمیوں کے ساتھ مقابلہ اور کشمکش کریں گے۔ مدینے سے زیادہ دور مکے کی سمت جانا بہتوں کے لیے ''موت

کے منہ میں جانا'' معلوم ہوتا تھا۔

اس شام سے آنے والے قافلے کو مسلمان مدینے کے شمال یا مغرب میں روک سکتے تھے لیکن شام سے اس کے نکلنے کی اطلاع موجودہ زمانہ نہیں کہ تار پر اسی دن مل جائے۔اونٹوں کے قافلے کی اطلاع اونٹ سوار ہی دے سکتے تھے اور بمشکل دو ایک دن اول مدینے سے ساحل کو سیدھا جانے میں دو دن ضرور لگ جاتے ہیں۔ایک بڑا تجارتی قافلہ بے شبہ آہستہ آہستہ منزل بہ منزل ہی کہا جا سکتا ہے اور یلغار کرنے والی فوج خاص کر دشوار گزر اگھاٹیوں کی مدد سے تیز تر جا سکتی ہے۔بدر ایسا مقام تھا جو ساحل سے بھی قریب بڑا مقام ہونے کی وجہ سے قافلے وہیں سے گزرتے تھے [۴۴] مدینے اور مکے کے راستے کا قریب ترین اتصال بھی وہیں ہوتا تھا اور اس کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہاں مسلمان اس قافلے کو جا ملیں گے۔سیدھے مغرب کی سمت ساحل کو جائیں تو قافلہ گزر چکتا اور ہوا بھی یہی۔یعنی آنحضرتؐ ابوسفیان سے بمشکل چند گھنٹے قبل بدر پہنچتے ہیں [۴۵]۔اس کی ایک وجہ غیر معروف راستوں سے چکر لگا کر جانا تھا تاکہ حریف کو خبر نہ لگے۔آنحضرتؐ راستے میں بھی ٹوہ لیتے گئے اور بدر کے قریب پہنچ کر متعدد سانڈنی سوار بھیجے [۴۶] تاکہ اس کا پتہ چلائیں کہ قافلہ کہاں ہے جو سانڈنی سوار شمال مغرب میں شام کے راستے پر بھیجے گئے تھے ،انہوں نے واپس آ کر غالبًا آنحضرت کو اطلاع دی ہوگی کہ قافلہ اب آیا ہی چاہتا ہے [۴۷] اور اس اطلاع پر یہ گمان کر کے کہ قافلہ بدر میں سے گزرے گا آنحضرتؐ عین راستے پر وادی کے داخلے کے پاس پڑاؤ ڈالتے ہیں۔یہ سفر پوری تنظیم سے ہوا تھا ،مدینے میں ایک نائب کو چھوڑا گیا تھا۔فوج میں انصار اور مہاجرین کے الگ الگ جھنڈے بھی تھے۔فوج کے مختلف حصے بھی تھے۔ساقہ یعنی پیچھے کے اہم دستے پر قیس المازنی (انصاری) کو مامور کیا گیا تھا۔[۴۸]

قافلے کو اطلاع مل گئی تھی کہ خود شام کو جاتے وقت مسلمانوں نے اس کا

تعاقب کیا تھا[۴۹] اس سے پہلے چھ سات اور قریشی قافلوں کو یہی تجربہ ہو چکا تھا اسی لیے قافلہ چوکنا تھا۔ قافلے عموماً رات کو چلتے ہیں اور صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر آرام کرتے ہیں۔ بدر کی خطرناک گھاٹی سے قریش واقف تھے۔ اسی لیے بدر پہنچنے سے کافی مسافت پہلے (اور شامی [۵۰] کے مطابق الحنین کے موڑ پر) قافلہ رک جاتا ہے اور قافلہ سالار (ابوسفیان) ٹوہ لینے نکلتا ہے ابھی آنحضرت میدان بدر کے اندر نہیں آئے تھے لیکن ان چھوٹے مقاموں پر ایک بھی اجنبی گزرے تو ہر شخص اس سے واقف ہو جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کے سانڈنی سواروں کو لوگ دیکھ چکے تھے گو ان کی غرض کا پتہ نہیں چلا تھا ابوسفیان کو بھی ان باتونی بدوؤں نے سانڈنی سواروں کا پتہ دے دیا اس نے ان قدموں پر چل کر اونٹ کی تازہ مینگنیاں دیکھیں اور فوراً معلوم کر لیا کہ وہ مدینے کا چارہ کھائی سانڈنیاں تھیں۔ قافلہ سالار اس پر بھاگا بھاگا بدر سے واپس قافلے میں پہنچتا ہے اور ایک طرف تو مکے کو مدد کے لیے تیز رفتار پیام رساں بھیجتا ہے اور ساتھ ہی خود بھی راستہ کاٹ کر بدر کو چھوڑتے ہوئے ساحل کے قریب سے دو منزلے کو منزلہ کرتا ہوا آرام لیے بغیر قافلے کو رات بھر چلنے کے باوجود دن بھر چلا کر جل دے جاتا ہے اور چند گھنٹے ٹھہر کر پھر آگے بڑھ جاتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کی دسترس سے بچ کر صحیح سلامت مکہ پہنچ جاتا ہے۔[۵۱]

بدر کی لڑائی:

قافلہ سالار کا پیام مکہ پہنچا تو وہاں لازمی طور پر کہرام مچ گیا۔ کیوں کہ ہر ایک گھرانے کا کچھ نہ کچھ سامان اس میں تھا جلدی میں قریش نے ناکافی تیاری کی اور جملہ حلیفوں کے اکٹھے ہونے کا انتظار نہ کیا۔ خاص کر جنگ جو ''احابیش'' کو ساتھ نہ لینے پر بعد میں وہ بہت پچھتاتے بھی رہے۔ پھر بھی ہزار کے قریب رضا کار جمع ہو گئے جن میں سے بعض کے پاس گھوڑے بھی تھے۔

اس کمک کو مکے سے بدر پہنچنے میں کم وبیش ایک ہفتہ ضرور لگا ہوگا یہ سوال کافی پیچیدہ ہے کہ قافلے کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد آنحضرت کیوں فوراً مدینہ واپس نہیں ہوگئے اور کیوں ہفتہ بھر بدر میں پڑاؤ ڈالے اپنے مرکز سے دور خطرے کا سامنا کرتے مقیم رہے۔ جہاں تک غور کیا تو مجھے ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے ہجرت کے ساتھ ہی آنحضرت نے آس پاس کے قبائل سے حلیفی اور معاونت کے معاہدے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ چنانچہ ۱ھ میں جہینہ کے بعض سرداروں سے معاہدہ ہوا تھا ۲ھ میں ینبوع کے آس پاس بسنے والے بنوضمرہ، بنو مدلج، بنو زرعہ اور بنو الربعہ سے دوستی اور اعانت یا غیر جانبداری کے معاہدے ہو گئے تھے خوش قسمتی سے تاریخ نے ان معاہدوں کے متن کو محفوظ رکھا ہے [۵۲]۔ اور ان معاہدوں کے ساتھ ہی قریش پر راستہ بند کیا جا سکا کیونکہ یہ سب قبائل مدینے اور بحر قلزم کے مابین بستے تھے اور انہیں کی سرزمین سے قریش کا روانوں کو گزرنا پڑتا تھا۔

وجہ جو بھی ہوئی ہو۔ ابتداً شام سے آنے والے قافلے کو روکنے کے لیے آنحضرت نے ایک موزوں جگہ پڑاؤ ڈالا، پھر وہیں مقیم رہے۔ جب قریش کی فوج کے آنے کی اطلاع ہوئی تو آنحضرت نے طے کیا کہ ان سے مقابلہ کرنا چاہیے اگرچہ دشمن کی تعداد تقریباً تگنی تھی۔ اس وقت ہمراہی افسروں نے جو بدر کے جغرافیہ سے بہتر واقف تھے مشورہ دیا کہ مکے، یعنی جنوب سے آنے والے دشمن کے مقابلے کے لیے پڑاؤ کو بدلنا مناسب ہوگا۔ پانی پر اپنی بہتر دسترس اور دشمن کو اس سے محروم کرنا خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا [۵۳] اسی طرح لڑائی چونکہ عموماً صبح کو شروع ہوتی تھی، اس لیے اس کا لحاظ رکھا گیا کہ دن چڑھے تو سورج آنکھوں پر نہ آئے۔ [۵۴]

بدر کے پانی کے متعلق مورخوں نے جو تفصیلیں لکھی ہیں وہ کچھ زیادہ واضح نہیں ہیں۔ ممکن ہے گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال میں پانی کے بہاؤ اور سوتوں میں تبدیلی ہوئی ہو۔ بہرحال موجودہ حالت یہ دیکھی گئی کہ وہاں ایک چشمہ ہے، جسے ہم کاریز یا

زمین دوز نہر کہہ سکتے ہیں ،اس کا بہاؤ شہر سے جبل عریش اور نخلستان کی طرف ہے اور مسجد عریش سے کوئی پندرہ بیس قدم پہلے کا لیول پیدل راستے کے برابر ہے مگر ظاہر ہے مسجد عریش ایک ٹیلے پر ہے۔اس لیے مسجد کے اندر اس کا منہ کافی گہرائی پر ہی کھولا جا سکتا ہے۔

غالباً آنحضرت نے قریش کے آنے پر العدوۃ الدنیا سے آگے بڑھ کر مسجد عریش کے قرب و جوار میں اس چشمے کے بہاؤ کے موقع پر پڑاؤ ڈالا۔اور متعدد حوض بنا کر اس بہتے پانی کو جنگ کے دن قریش پر روک دیا کیونکہ ان کا پڑاؤ بھی نیچے العدوۃ القصویٰ پر تھا۔متعدد بڑے حوضوں کے بغیر اس بہتے پانی کو زیادہ دیر تک روکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

فریقین کی صف بندی:

مسلمانوں کے پاس تین سو سے کچھ ہی زیادہ سپاہی [۵۵] تھے ۔ دشمن کی تعداد مورخوں نے ساڑھے نو [۵۶] سو لکھی ہے۔ایک بہتر ''تعبیہ ''(صف بندی) کے بغیر عام حالتوں میں مقابلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا ۔امام ترمذی [۵۷] کے مطابق اسلامی فوج کی تقسیم لڑائی سے پہلے کی رات ہی کو عمل میں آ چکی تھی۔لڑائی کے دن سویرے ہی آنحضرت نے مسلمانوں کو قطاروں میں تقسیم کیا اور صف بندی کا جنگ سے پہلے تنقیدی نظر سے معائنہ کیا۔آپؐ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔معائنہ میں کوئی سپاہی ذرا بھی آگے یا پیچھے نظر آتا تو آپؐ اسے فوراً درست کرتے [۵۸] ۔اس صف بندی کے بعد آپؐ نے فوج کے مختلف حصوں پر افسر مقرر کئے۔ واقدی [۵۹] کے مطابق میمنہ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے مگر یہ مشتبہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت صدیق پورا وقت جناب رسالت مآب کے ساتھ رہے جیسا کہ ابھی آگے تفصیل آئے گی ۔ واقدی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فوج تین مستقل جماعتوں پر مشتمل تھی ۔مہاجرین،

اوس اور خزرج اور ہر ایک کا علمبردار بھی الگ تھا۔ (نیز طبری ص ۱۲۹۷)

اس صف بندی کے بعد آنحضرتؐ نے سپاہیوں کو چند اہم ہدایتیں دیں [٦٠] جن کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمان اس صف بندی کو نہ توڑیں اور اس وقت تک لڑائی کا آغاز نہ کریں جب تک آنحضرت اجازت نہ دیں۔ دشمن دور ہو تو تیر چلا کر ضائع نہ کریں۔ زد پر آئے تو تیر چلائیں اور بھی قریب آئے تو پتھروں سے ماریں اس سے بھی نزدیک ہو جائے تو نیزوں سے روکیں اور سب سے آخر میں تلوار کھینچیں گے۔ یقیناً ہر مسلم سپاہی نے اپنے کھڑے ہونے کی جگہ سے پھینکے جانے والے پتھروں کی ڈھیر لگا لی ہوگی۔ جو میدان بدر میں اسلامی کیمپ پر کافی مقدار میں ملتے ہیں۔ مسلمان چونکہ کھڑے ہوئے اور مدافعت پر تھے اس لیے یہ ان کے لیے ممکن تھا۔ دشمن جارحانہ حملہ کر کے بڑھا آ رہا تھا۔ اس لیے وہ چاہتا بھی تو زیادہ مقدار میں پتھر نہ لے سکتا۔ مسلمان سپاہیوں کے پاس چونکہ کوئی امتیازی لباس نہ تھا، اس لیے ''یا منصور امت'' کا جملہ ان کا شعار مقرر کیا گیا [٦١]۔ جب دو آدمی مقابل ہوتے اور فریق ثانی یہ شعار نہ دہراتا تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ وہ دشمن کا آدمی ہے۔ ''الملائکہ مسومین'' (نشان لگانے والے فرشتے) کی آیت کی تفسیر میں (جو بدر ہی کے سلسلے میں ہے) طبری وغیرہ نے یہ حکم نبوی بھی نقل کیا ہے کہ مسلمان لباس وہئیت وغیرہ میں امتیاز بھی پیدا کر لیں۔ ''تسوموا فان الملائکتہ تسومن'' (نشانیاں لگا لو کیوں کہ فرشتوں نے بھی نشانیاں لگا لی ہیں)۔

دشمن کی تنظیم کا زیادہ پتہ نہیں چلتا۔ واقدی [٦٢] کے مطابق ان کا میمنہ و میسرہ دو حصے تھے اور فوج میں تین جھنڈے تھے۔ انہوں نے پیش قدمی کر کے ایک خاص مقام پر توقف کیا۔ پھر اپنے زمانے کے جنگی رواج کے مطابق مبارزہ کیا یعنی ان کا ایک بہادر صفوں سے آگے بڑھا اور دعوت دی کہ مسلمانوں کا بھی ایک پہلوان آگے آئے اور دونوں تنہا لڑیں۔ [٦٣]

آنحضرت نے اپنی صف بندی مکمل کی اور انتظام کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنے ''اسٹاف'' کے ساتھ ایک ٹیلے پر چڑھ گئے جہاں سے میدان جنگ صاف نظر آتا تھا (علی تلّ مشرف علی المعرکته [۶۴]) اس ٹیلے پر آنحضرت کی اجازت سے ایک جھونپڑی (عریش) تیار کی گئی تھی ۔ جس کا منشا کچھ تو دھوپ کے وقت سپہ سالار کے لیے سایہ مقصود تھا اور کچھ دشمن کے تیروں سے بچاؤ کے پیش نظر ہو گا ۔ یہاں چند تیز رفتار سانڈنیاں بھی متعین تھیں [۶۵] ۔ یقیناً اپنی فوج کو ہدایات بھیجنے میں آنحضرت نے ان سے کام لیا ہو گا ۔ ان سانڈنیوں کا منشا یہ بھی تھا کہ ضرورت پر آنحضرت ان پر مدینہ جاسکیں اور عریش سے مدینے کا راستہ کھلا رکھا گیا تھا ۔ نیز طبری کے مطابق عریش پر ایک محافظ دستے کا پہرہ بھی تھا [۶۶] ۔ اسی عریش یا جھونپڑی کی جگہ آج کل بطور یادگار ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی ہے ۔ اس میں فی الوقت تین کتبے ہیں ۔ ایک منبر کے اوپر ، دوسرا محراب کی کمان کے اوپر قبلہ رخ دیوار میں نصب ہے، تیسرا محراب کے پاس الگ زمین پر پڑا ہوا تھا ۔ مسجد کی دیواریں مٹی کی ہیں ۔ جن کے اندر ممکن ہے اینٹ ہو یا پتھر کا ہے ۔ منبر کے اوپر جو کتبہ ہے اس میں مصر ۔ کے مملوک افسر خشقدم کا نام ملتا ہے ۔ املا کی غلطیاں (ہذالمکان، کانلن الفراغ وغیرہ) بھی انہیں عجمیوں نے کی ہوں گی ۔ محراب کی کمان کے اوپر سنگ مرمر کا چھوٹا سا کوئی آٹھ انچ مربع کتبہ ہے جو کچھ تو آرائشی خط میں طغریٰ کی طرح کا لکھا ہوا ہونے اور کچھ قدامت کے باعث بہت کچھ گھس جانے کے باعث مجھ سے نہ پڑھا گیا ۔ میری رائے میں یہ مملوکوں سے بھی پہلے کا ہے ۔ تیسرا کتبہ جو نیچے پڑا ہے وہ بہت بد خط معمولی ریت کے پتھر پر لکھا ہوا اور غالباً حال کا ہے ۔ اس کا زمین پر پڑا ہونا بتاتا ہے کہ مسجد کی موجودہ تعمیر بالکل جدید ہے اور دونوں نصب کیے ہوئے کتبے محض یادگار کے طور پر دیوار چنتے وقت لگا دیئے گئے ۔ یہ تیسرا کتبہ بھی اپنے زمانے میں کہیں نصب ہو گا ۔ اس میں بھی ''کان الفراغ'' کے الفاظ اب تک صاف پڑھے جاتے ہیں ۔ مملوکوں کے کتبے

کی عبارت میں نے یوں پڑھی ہے۔

سطر اول بسم الله الرحمن الرحيم

۲۔ انشافی حضر هذالمكان المبارك

۳۔ خشقدم امير ه عسره (؟ عشر ة ،عشيرة) بديار المصر يه مشيدة،العمارة السلطانيه

۴۔ وكانل الفراغ من ہٰذالبستيه المبارك ربيع الاول احد و عشرين فی سنته سته و تسعماية

(ترجمہ: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔اس مبارک مقام پر حصار تعمیر کرنے کا آغاز خشقدم نے کیا جو سلطنت مصر میں امیر عشرہ اور سرکاری انجینئر تھا۔اس مبارک عمارت کے بنانے سے ۲۱، ربیع الاول ۹۰۶ ھ میں فراغت ہوئی)۔

شہدائے بدر کا مقبرہ بھی ایک ممتاز احاطے میں آج تک موجود ہے۔ترکی دور میں وہاں سنگ مرمر کے ستون اور کتبے وغیرہ لگائے گئے تھے۔مگر اب یہ کھنڈر ہو چکے ہیں۔اس کے قریب ہی بدر کے مزور ایک چٹان بتاتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ اس عمودی غار میں آنخضرت اُترے تھے مگر اس کی توجیہ مشکل ہے اور تاریخیں بھی اس سے ساکت ہیں۔

بدر کی مقامی روایتوں اور وہاں کے مزدورین کے بیان کے مطابق لڑائی اسی جگہ ہوئی جہاں اب قبرستان واقع ہے۔آنخضرت نے اپنی چھوٹی سی جمعیت کے لیے بھی رضا کار عورتیں مقرر کی تھیں۔جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں [۶۷]۔سپاہیوں کو پانی پلاتیں۔میدان میں گرے دشمن کے تیروں کو جمع کر کے مسلم تیر اندازوں کو دینے کا خطرناک کام بھی کرتیں ،غرض جتنا ہوتا ہاتھ بٹاتیں۔

لڑائی کے نتیجے سے سب واقف ہیں۔مسلمانوں کے کوئی ایک درجن سپاہی شہید ہوئے [۶۸]۔دشمن کے ستر آدمی کھیت رہے [۶۹]۔اور اتنے ہی گرفتار ہوئے

[۷۰]۔ جو قید کر کے فوجی نگرانی میں غالباً پیدل مدینہ بھیجے گئے۔ان کے ساتھ عام طور پر اچھا سلوک کیا گیا، جس کے پاس کپڑے نہ رہے ہوں گے اسے کپڑے دیئے گئے اور انہیں مسلمان سپاہیوں کے برابر کھلایا پلایا گیا [۷۱]۔آنحضرت نے جملہ لاشوں کو دفن کرایا اور فوراً دو تیز رفتار مبشر مدینہ بھیجے، ایک محلہ ہائے عالیہ کے لیے اور دوسرا محلہ ہائے سافلہ کے لیے تاکہ وہاں کی بے چین آبادی کو لڑائی کے نتیجے کی خوشخبری اور دیگر واقعات سنائیں [۷۲]۔ یہ رمضان ۲ ھ کا واقعہ ہے۔

قیدیوں سے برتاؤ عرب میں یکساں نہ تھا۔ وہ قتل بھی کر دیئے جاتے، غلام بھی بنا لیے جاتے خاص کر عورتیں اور بچے۔ اور مفت بھی رہا کر دیئے جاتے۔ مالی فدیئے کا رواج مسلمانوں میں جنگ بدر کے پہلے ہی سے چلا آ رہا تھا۔اب ایک ہتھیار فروش (نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب) سے ایک ہزار نیزے مانگے گئے [۷۳] عام قیدیوں سے چار چار ہزار کی خطیر رقم طلب کی گئی [۷۴]۔آنحضرت تعلیم کو جو اہمیت دیتے تھے۔اس کا انداز یوں بھی ہو سکتا ہے کہ چار ہزار کی خطیر رقم کے عوض پڑھے لکھے قیدیوں کو دس دس بچوں کو لکھنا سکھانے پر رہا کر دیا گیا [۷۵]۔ چند ایک کو مسلمانوں سے آئندہ نہ لڑنے کے اقرار پر مفت بھی رہا کر دیا گیا [۷۶]۔

اسلامی محدث اور مورخ لکھتے ہیں کہ بدر میں قیام کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ممتاز افسروں کے ساتھ پھر کر میدان جنگ کا معائنہ کیا اور جگہ جگہ بتاتے گئے کہ دشمن کا فلاں افسر فلاں جگہ ہو سکتا ہے اور اس کے مر کر گرنے کی جگہ فلاں ہے [۷۷]۔ سپہ سالار اعظم کا انتہائی خطرے کے موقع پر یہ اطمینان اور ایقان ماتحت افسروں اور ان کے ذریعے سے پوری فوج میں جو خود اعتمادی اور جوش و ولولہ پیدا کر سکتا ہے وہ ظاہر ہے اور ساتھ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دشمن کی صلاحیتوں اور تجویزوں کا پیش اندازہ کتنا مفید اور ضروری ہوتا ہے۔

اسلام نے جہاں ہر چیز میں جمالیات کا لحاظ رکھا ہے وہیں لڑائی کے لیے بھی

انسانیت پرور اور قابل عمل قواعد بنائے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور حدیث [۷۸] جو غالباً اسی جنگ بدر کے موقع پر ارشاد ہوئی تھی یہ ہے کہ ''اِذَاقتلتم فَاَحْسنوا القتلة'' (جب تم کسی کو قتل بھی کرو تو اچھے طور سے قتل کرو) خواہ مخواہ تکلیف دہ کاموں کی اور اس مقابلے کے ناقابل زخمیوں کو قتل کرنے، عورتوں، بچوں اور لڑائی میں حصہ نہ لینے والے نوکروں، غلاموں وغیرہ پر ہتھیار چلانے کی سختی سے ممانعت کی گئی اور قرآن مجید میں اسی جنگ بدر کے موقع پر ہتھیار کے استعمال کی ایک بڑی اہم ہدایت آئی کہ واضربو امنهم کل بنان (یعنی ان کی جوڑوں پر مارو [۷۹]) اور ظاہر ہے کہ دشمن کو لڑائی کے ناقابل کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو حتی الامکان گھٹانے کی اس سے بہتر ہدایت کسی دست بدست لڑائی کے لیے نہیں دی جا سکتی۔

احد:

شام جانے کا بّری راستہ قریش کے تجارتی کاروانوں کے لیے جو اہمیت رکھتا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کو کھلا رکھنے کے لیے ڈھائی لاکھ درہم کا چندہ کرنا اہل مکہ کے لیے ذرا بھی بار نہ گزرا۔ کم وبیش اتنی ہی اور رقم انہوں نے بدر کے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے میں صرف کی۔ سیرۃ شامی [۸۰] وغیرہ [۸۱] میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح قریش نے علاوہ اپنی ذاتی رضا کارانہ جمعیت کے جس میں جنگجو ''احابیش'' بھی شریک تھے عمرو بن العاص، عبداللہ بن ازبعری، ہبیرہ بن ابی وہب، مسافع بن عبدمناف اور ابوعزہ عمرو بن عبداللہ الجمعی کو تمام قبائل میں عرب میں بھیجا۔ اور خطرے کی اہمیت سمجھا کر مدینے پر حملے کے لیے مدعو کیا۔ اس میں اتنی کامیابی ہوئی کہ 'فالبوا العرب وجمعوها'' غرض تین ہزار کی جمعیت سال بھر کے عرصے میں تیار ہوئی جس میں سات سو زرہ پوش اور دو سو گھوڑے بھی تھے [۸۲] اس تیاری کی اطلاع مسلمانوں کے خفیہ نگار نے بروقت آنحضرت کو دے دی [۸۳] اور مدینہ بھی مدافعت

کے لیے تیار ہو گیا اور وسط شوال ۳ھ میں احد کی معرکہ آرائی ہوئی۔ قریش مع اپنے حلیفوں کے مدینے پر دھاوا بولتے ہیں اور احد پہاڑ کے دامن میں لڑائی ہوتی ہے۔

محل وقوع اور وجہ انتخاب:

احد ایک پہاڑ ہے جو مدینے کے شمال میں تین ساڑھے تین میل کے فاصلے پر شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے مکے کے متعلق سب جانتے ہیں کہ وہ مدینے کے جنوب میں واقع ہے۔ عرصے سے میں یہ سوچتا اور دوسروں سے پوچھتا رہا کہ مکے والے مدینے کے جنوب پر کیوں حملہ آور نہیں ہوئے اور کس مصلحت سے مدینے کے شمال میں جا کر اپنی واپسی اور اپنی کمک وغیرہ کا راستہ بند کر لیا۔ جب میری کسی طرح تشفی نہ ہوئی تو مجبوراً میں اس نتیجے پر پہنچا کہ موجود احد وہ مقام نہیں ہے جہاں غزوۂ احد پیش آیا اور یہ کہ قدیم احد اصل میں مدینے کے جنوب میں قبا کے قرب و جوار میں کسی جگہ واقع ہو گا قدیم مورخین اور جغرافیہ نگاروں کا متفقہ بیان کہ احد مدینے کے شمال میں ہے اور حتیٰ کہ حضرت حمزہ کا مزار بھی میری تشفی نہ کر سکے۔ لیکن جب میں نے یہ برسر موقع مقامیاتی (ٹوپوگریفیکل) مطالعہ کیا تو وہ چیز سمجھ میں آ گئی جو بیسیوں کتابوں کی سالہا سال ورق گردانی سے بھی نہ آئی تھی۔

مدینہ ایک ایسے مقام پر آباد ہے جو دس میل لمبے اور اتنے ہی چوڑے میدان پر مشتمل ہے اسی میدان کو ''جوف مدینہ'' اور بعد میں ''حرم مدینہ'' کا نام دیا گیا۔ اس میدان کے اطراف ہر سمت میں اونچی اور ایک دوسرے سے متصل پہاڑیوں کا سلسلہ بڑی دور تک چلا گیا ہے اور آمد و رفت تنگ وادیوں اور گھاٹیوں میں سے ہوتی ہے۔ جبل عیر اور جبل ثور سے محدود ہونے والا یہ میدان بالکل ہموار بھی نہیں ہے بلکہ بیچ میں سلع کا پہاڑ اور متعدد دیگر چھوٹی پہاڑیاں واقع ہیں جن کو بڑی جنگی اہمیت حاصل ہے۔

عہد نبوی میں مدینہ کوئی اس طرح کا شہر نہ تھا جیسا کہ وہ آج کل ہے، یا جس طرح کے گنجان محلّوں کے مجموعوں کے ہم عادی ہیں۔ اس زمانے میں وہاں عرب اور یہودی قبیلے بستے تھے اور ہر قبیلے کا محلہ یا گاؤں دوسرے سے الگ اور فرلانگ دو فرلانگ یا اس سے بھی زیادہ فاصلے پر واقع تھا۔ اس طرح کے گاؤں کا سلسلہ جبل عیر اور جبل ثور تک برابر پھیلا ہوا تھا۔

ان گاؤں کی حالت یہ تھی کہ ان میں ایک یا زیادہ پانی کے کنویں ہوتے، رہائشی مکان پتھر کے بنے ہوئے اور عموماً دو منزلہ ہوتے۔ ہر گاؤں میں برج کی وضع کی مستحکم عمارتیں ہوتیں جن کو آطام اور آجام کہا جاتا۔ جنگ کے زمانے میں عورتیں، بچے، جانور اور دیگر اسباب ان میں منتقل کر دیا جاتا۔ ایک زمانے میں ان آطام کی تعداد ایک سو سے زائد ہوگئی تھی [۸۴] ایک اور زمانے میں خاص ایک قبیلہ بنی زید میں ۱۴ آطام تھے [۸۵] ان میں سے بعض بہت بڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ احیحہ بن الجلاح کا اطم الضیحان کتاب الاغانی [۸۶] کے مطابق سہ منزلہ تھا۔ سب سے نیچے کی منزل لاوے کے سیاہ پتھروں سے تعمیر ہوئی تھی۔ اس سے اوپر کے دو درجے (نبرة) چاندی کی طرح سفید پتھروں سے بنائے گئے تھے اور یہ آطم اتنا اونچا تھا کہ اونٹ ایک دن کی مسافت سے اس کو دیکھ سکتے تھے۔ قبا کے قریب اس آطم کے کھنڈر اور اس کی سب سے نیچے کی منزل ابھی تک باقی ہیں اور مدینے کی دور جاہلیت کی حربی تعمیر کے مطالعے کا موقع دیتے ہیں۔ ان آطام کے اندر اکثر پانی کے کنویں بھی ہوتے تھے. تاکہ محاصرے کے وقت کام دیں۔

ان منتشر اور دور دور بسے ہوئے محلوں کے علاوہ مختلف افراد یا قبائل کے باغ تھے اور عموماً ان کا احاطہ پتھر کی دیوار سے بنایا جاتا تھا۔ یہ باغ آبادی کے اطراف چوطرف پھیلے ہوئے تھے۔

ان قبائلی آبادیوں میں سے ایک نام یثرب تھا اور یہ گاؤں اب تک باقی

ہے ممکن ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ سب سے اہم آبادی ہو اور اسی بناء پر پورے جوف مدینہ کے دیہات پر یثرب کا اطلاق ہوتا ہو۔ جس کی نظیریں ہر ملک میں ملتی ہیں۔ مدینتہ النبی کا محلہ جہاں آنحضرت رہتے تھے کم و بیش وسط میں واقع ہے مکے والوں کو عام اہل مدینہ سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ وہ صرف آنحضرت پر اپنا غصہ اتارنا چاہتے تھے۔ مسکن نبوی تک پہنچنے کے لیے جنوب میں گنجان باغ حائل تھے۔ جن کے باعث لڑائی کا کوئی میدان نہ تھا۔ جنوب مشرق میں قبا اور عوالی کی آبادیاں اور باغ تھے۔ مشرق میں مسلسل یہودی محلے تھے جو شمالاً جنوباً قبا سے لے کر تقریباً احد تک چلے گئے تھے۔ باغوں یا محلوں کا سلسلہ جنوب مغرب اور مغرب میں بھی پھیلا ہوا تھا مگر نسبتاً کم گنجان تھا۔ مدینے کی موجودہ فصیل پر شمال میں باب الشامی کے پاس بنو ساعدہ رہتے تھے۔ جن کا سقیفہ اب تک موجود ہے۔ اس سے آگے خود جبل سلع پر بنو حرام رہتے تھے۔ ان کا قبرستان اور سقیفہ بھی اب تک باقی ہیں۔ شمال مغرب میں وادی یعقیق کے کنارے بئر رُومہ تک بہ کثرت باغ تھے۔ بئر رومہ مع اراضی تابعہ ابتدأ یہودیوں کے قبضے میں تھی [۸۷]۔ شمالی حصہ البتہ کھلا ہوا تھا۔ چونا ملی ہوئی سفید چوڑ کی زمین کے باعث آج بھی وہاں زراعت نہیں ہوسکتی۔ ادھر سے مدینتہ النبی کا راستہ کھلا ہوا بھی تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ مدینے کے جنوب میں بلند پہاڑیاں ہیں اور راستہ صرف وادیوں اور گھاٹیوں میں سے گزرتا ہے۔ عہد نبوی میں مدینے کو براہ راست جنوب سے آنے کے لیے قبا کی طرف ایک سخت دشوار گزار راستہ تھا جو لاوے کے پتھروں سے اٹا ہوا ہونے کے باعث شاذ ہی اختیار کیا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ نے ہجرت کے وقت دشمن کے تعاقب کے خیال سے مصلحتاً یہی راستہ اختیار فرمایا تھا۔ کسی فوج کے لیے لاوے سے اٹے ہوئے میدانوں میں سے گزرنا آدمی اور جانوروں کے لیے سخت تکلیف دہ ہے اور دوپہر کو ان پتھروں کے گرم ہو جانے کے باعث وہاں پڑاؤ ڈالنا بھی کم پسند کیا جاسکتا ہے۔ مدینے کے مشرق اور مغرب دونوں طرف شمالاً جنوباً لاوے کے یہ میدان

پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو ''لابہ'' ''حرہ'' کہا جاتا ہے۔ ان حروں میں آبادی کے مکان تو تھے۔ لیکن باغ نہیں۔ اگر تکلیف گوارا کر کے ان حروں پر سے فوج گزر بھی جائے تو ایسے میدانوں میں لڑائی بھی آسان نہیں۔

مزید برآں مدینے کو آنے کا جنوبی راستہ جو آج کل باب العنبر یہ سے داخل ہوتا ہے۔ ابھی تین سو سال پہلے تعمیر ہوا۔ ورنہ قدیم زمانے میں کاروانوں کا راستہ یہ تھا کہ ذوالحلیفہ سے گزرتے ہی جبلِ عیر کے مغرب سے وادی العقیق کے اندر سیدھے شمال میں زغابہ کے سنگم (مجمع الاسیال) تک جائیں اور وہاں سے مدینے کو جانے کے لئے جنوبی طرف مڑیں۔ وادیوں کے یہ راستے نرم ریت پر مشتمل ہونے کے باعث اونٹوں کو بھی پسند تھے۔

غرض یہ جغرافی دشواریاں تھیں جن کے باعث قریش کی تھکی ہوئی فوج اور بارہ دن کے کوچ سے نیم مردہ جانوروں نے بھی مدینے سے دور زغابہ میں جا کر ٹھہرنا پسند کیا۔ یہاں پانی افراط سے تھا، چارہ بھی ملتا تھا اور چونکہ کامیابی کا یقین تھا۔ اس لئے واپسی کے راستے کی بھی فکر نہ تھی۔

جیسا کہ بیان ہوا احد پہاڑ، مدینے کے شمال میں شرقاً غرباً کم و بیش بہ خطِ مستقیم پھیلا ہوا ہے تقریباً وسط میں اس میں ایک جگہ خماؤ آتا ہے اور نیم دائرے یا گھوڑے کی نعل کی شکل کا ایک کافی وسیع میدان بن گیا ہے اس کے عقبی یعنی شمالی حصے میں ایک بہت ہی تنگ درّے سے گزرنے پر اندر مزید کھلے یا محفوظ میدان مل جاتے ہیں۔ اُحد کے جنوبی دامن میں وادیِ قناۃ گزرتی ہے۔ وادیِ قناۃ کے جنوب میں جبلِ عینین واقع ہے جسے اب جنگِ اُحد میں تیر اندازوں کے تعین کے باعث جبل الرُّماۃ کہا جاتا ہے۔ وادیِ قناۃ کے شمال میں جبلِ اُحد کے دامن میں جو کھلا میدان ہے اس میں پانی کے دو چشمے اب بھی موجود ہیں اور کوئی تعجب نہیں جو انہیں چشموں کے باعث جبلِ الرُّماۃ کو جبلِ عینین (دو چشموں والا پہاڑ) کہا جاتا رہا ہو۔

جب قریشی فوج مدینے کے قریب ذوالحلیفہ پہنچی تو مسلمانوں کے جاسوس ان میں شامل ہوگئے اور جب یہ فوج جبلِ اُحد کے مغرب میں زغابہ میں مقیم ہوگئی تو مدینہ آکر رپٹ دی [۸۸]۔ آنحضرتؐ نے بھی (جو ابتدأ شہر کے اندر ہی رہ کر مدافعت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بعد میں فوج کے نوجوان افسروں کے اصرار پر باہر نکل کر مقابلے کو منظور فرماتے ہیں)[۸۹]۔ اپنی فوج کو اُحد کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ آبادی کے باہر جمع ہونے پر شیخین کی گڑھیوں کے پاس استعراض (رویو) ہوا اور رضا کاروں کا تنقیدی نظر سے معائنہ فرمایا۔ کم عمر بچے واپس کر دیئے گئے [۹۰]۔ البتہ عورتوں کی کافی تعداد ساتھ رکھی گئی جو لڑائی کے وقت زخمیوں اور دیگر سپاہیوں کی خدمت کرتی رہیں ان میں ام المومنین حضرت عائشہؓ بھی تھیں۔ جن کا مشکیں بھر بھر کر پانی لانا اور زخمیوں کو پلانا صحیح بخاری میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس فوج میں کل سات سو آدمی تھے۔ جن میں سے صرف ایک سو کے پاس زرہیں تھیں [۹۱]۔ باقی مختلف قسم کے ہتھیاروں میں سے ایک یا چند لئے ہوئے تھے۔ پہلے دن اسی جگہ قیام رہا جہاں رضا کاروں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا تھا اور جہاں فوج کا معائنہ ہوا تھا۔ اس جگہ شیخین نامی دو مشہور آطام چھوٹے قلعے بھی [۹۲] تھے۔ رات کو پچاس سپاہی حفاظت کے لئے اسلامی پڑاؤ کے اطراف گشت کرتے رہے [۹۳] تاکہ شب خون کا اندیشہ نہ رہے۔ دوسرے دن آگے بڑھ کر جبلِ اُحد کے مذکورہ خماؤ کے اندر پڑاؤ ڈالا گیا [۹۴] جس سے بہتر اور محفوظ مقام نہیں مل سکتا تھا۔ آنحضرت نے فوراً مورچوں پر قبضہ کیا اور جبل عینین (جبلُ الرُّماۃ) پر پچاس تیر انداز متعین کیے گئے کہ اگر دشمن وادیِ قناۃ کی راہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کوئی ٹکڑی بھیجے تو اسے روکیں [۹۵] باقی چھ ساڑھے چھ سو سپاہیوں سے آنحضرت نے قریش کی تین ہزار جمعیت کے مقابلے کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔ متعدد مؤرخوں نے لکھا ہے کہ لڑائی کے دن آپ ﷺ نے دوہری زرہ زیبِ تن فرمائی تھی [۹۶] اور بعض بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی کے دن

آپ ﷺ نے کعب بن مالک سے زرہ بدلی بھی فرمائی [۹۷]۔ غالباً اس لئے کہ دشمن پہچان نہ سکے۔

جبلِ عینین اور جبلِ اُحد کے درمیان آج کل جو فاصلہ ہے وہ اتنا وسیع ہے کہ پچاس تیر اندازوں کا سواروں کے ایک رسالے کو روکنا ناممکن معلوم ہوتا ہے قریش کے پاس دوسو گھوڑوں کا ہونا بیان کیا جاتا ہے جو خالد بن عبدالولید اور عکرمہ بن ابی جہل کی کمان میں تھے [۹۸]۔ دوسرے الفاظ میں وادی قناۃ سے گھسنے کی کوشش کرنے والا خالد بن عبدالولید کا رسالہ کم سے کم سو سواروں پر مشتمل تھا، اور موجودہ چوڑائی اتنی ہے کہ یہ رسالہ مسلم تیر اندازوں کی زد سے پرے حفاظت سے گزر سکتا ہے۔ اس دشواری کا حل سوائے قیاسات کے ممکن نہیں۔ گمان یہ ہوتا ہے کہ اُحد اور وادیِ قناۃ کے مابین اس وقت جو ہلکے سے ڈھلوان کا میدان ہے۔ وہ ۳ھ میں اتنا ہموار نہ تھا جتنا اب ہے۔ مورخین کے بیان کے مطابق وادئ قناۃ میں بارہا شدید طغیانیاں آتی رہی ہیں۔ چنانچہ حضرت حمزہ کو اسی بنا پر ابتدائی مدفن سے نکال کر موجودہ قبر میں دفن کرنا پڑا تھا۔ ان طغیانیوں نے اس ڈھلوان کو، جو احد کی طرف سے اترتا ہوا قناۃ کی طرف آتا ہے ہموار کر دیا ہے۔ دوسرے جبلُ الرُّماۃ پر حالیہ زمانوں میں جو مکان تعمیر ہوئے ہیں، نیز حضرت حمزہؓ کے مقبرے اور عظیم الشان مسجد کو بنانے اور ان کئی درجن مکانوں کو تعمیر کرنے میں جو وادیِ قناۃ کے کنارے مقبرہ حضرت حمزہؓ کے مشرق میں ہیں احد کے دامن سے پتھر حاصل کئے گئے اور اس سنگ تراشی یا سنگ براری نے بھی اُحد و عینین کے درمیانی ڈھلوان کو مسطح کر دیا، ورنہ قدیم زمانے میں اُحد کے دامن میں جبل عینین کے تیر اندازوں کی زد سے بچ کر سوار نہیں گزر سکتے ہوں گے۔ ایک یہ بھی امکان ہے کہ وادیِ قناۃ کے باعث نیز دو چشموں کی موجودگی کی بنا پر اُحد اور قناۃ کے مابین باغ، مکانات وغیرہ ہوں جو اب باقی نہیں رہے اور یہ رسالے کو روکتے ہوں گے اور یہ رسالہ صرف وادیِ قناۃ میں سے گزر سکتا ہوگا۔ اگر رسالہ صرف وادیِ قناۃ میں سے گزرنا

چاہے تو تیر انداز اُسے اچھی طرح زد میں لے سکتے ہیں اس دشواری کا ایک خاصا بڑا حل اس تفصیل میں مل جاتا ہے کہ تیر اندازوں کی ہمکاری کے لیے چند سوار بھی متعین تھے۔ جیسا کہ ابھی نیچے ذکر آئے گا باغوں کا بھی ہمیں ذکر ملتا ہے۔ ابو دجانہ کا دامن اُحد میں رسولِ کریم ﷺ سے ایک خصوصی تلوار اپنی بہادری کے اظہار کے لیے حاصل کرنا مشہور واقعہ ہے۔ اس موقع پر ان کا کہا ہوا ایک شعر جو طبری (ص ۱۴۲۶) اور ابنِ ہشام (ص ۵۶۳) میں محفوظ ہے۔ کوئی تعجب نہیں جو اصلی ہو۔

انا الذی عاهدنی خلیلی ونحن بالسفح لدیٰ النخیل

ترجمہ: میں وہ ہوں جس سے میرے دوست نے معاہدہ لیا کہ ہم نخلستان کے پاس پہاڑ کے دامن میں تھے۔

جنگِ اُحد کے دن قریشی فوج زغابہ سے سیدھے احد کے جنوبی دامن میں پہنچ گئی ہوگی اور موجودہ مغربی مقبرۂ شہداء پر مسلمانوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی ہوگی۔ خالد بن الولید کا رسالہ کدھر سے آیا؟ میرا قیاس ہے کہ وہ زغابہ کے شمال مشرق میں اُحد کے پیچھے سے گزرتا ہوا مشرقی طرف سے میدانِ اُحد کی طرف آیا، جہاں باوجود کئی بار بڑھنے کی کوشش کے تیروں کی باڑھ اسے پسپا ہونے پر مجبور کرتی رہی۔ طبری (۱۳۹۴ و مابعد) سے یہ اہم واقعہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کے رسالوں کے مقابلے کے لیے آنحضرت ﷺ نے اپنے مختصر رسالے کے بھی دو حصے کیے تھے اور حضرت زبیرؓ کا رسالہ تیر اندازوں کے ساتھ ہمکاری کرتے ہوئے خالد کے رسالے کو پسپا کرنے میں کامیاب حصہ لیتا رہا۔

تاریخ میں جانتے ہیں کہ اہلِ مدینہ کی جانبازی کے باعث قریشی لشکر کے پاؤں اُکھڑ گئے [۹۹] اور مسلمان سپاہی لوٹ کھسوٹ کرنے لگے۔ اس وقت تیر انداز بھی پہاڑ سے اتر آئے اور مالِ غنیمت جمع کرنے کے لیے چوطرف پھیل گئے حالانکہ آنحضرتؐ نے انہیں ہر حال میں اپنی جگہ رہنے کی تاکید فرمائی تھی۔ حتیٰ کہ مسلمان فوج

کو شکست بھی کیوں نہ ہو جائے۔ سات آٹھ تیر انداز وہاں جو رہ گئے۔ خالد بن الولید کے رسالے کے نئے دھاوے کو روکنے کے نا قابل تھے۔ جب ان سواروں نے مسلمانوں پر اچانک پیچھے سے حملہ کیا [۱۰۰] اور وہ پلٹے تو پسپا ہونے والا قریشی لشکر بھی تھا اور دوبارہ حملہ کیا۔ اب مسلمان دو طرف سے گھر گئے اور آنحضرت ﷺ کی شہادت کی افواہ پھیلی [۱۰۱] تو ان کے اوسان اور بھی خطا ہوئے اور آخر انہیں شکست ہوگئی اور اکثر مدینے کی طرف بھاگنے لگے [۱۰۲] قریش سمجھے کہ ان کا کام ختم ہوگیا اور وہ اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے [۱۰۳]۔

آنحضرت ﷺ زخمی ہو گئے تھے آپ کے دندانِ مبارک کو بھی دشمن کی سنگ اندازی سے صدمہ پہنچا تھا [۱۰۴] اور دشمن کے کھود کر چھپائے ہوئے ایک گڑھے میں بھی اتفاقاً آپ ﷺ گر پڑے تھے [۱۰۵] مگر دشمن مسلمانوں سے میدان کو خالی پا کر اپنے پڑاؤ کی طرف روانہ ہونے لگا تو بچے کھچے مسلمان سپاہی پھر جمع ہونے لگے اور آنحضرت ﷺ بھی اپنے گڑھے سے نکلے اور اُحد پہاڑ کے مشرقی حصے پر اپنے ساتھیوں کی مدد سے چڑھے [۱۰۶] اور وہاں کے محفوظ غار میں جا کر آرام کیا جس میں ایک آدمی آرام سے لیٹ سکتا اور متعدد لوگ اس کے بازو بیٹھ سکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی سلامتی کی خبر پھیلی تو مسلمان بھی اس غار کی طرف چڑھنے لگے۔ اس اجتماع کو دیکھ کر دشمن کے چند سپاہی متوجہ ہوئے مگر مسلمان بلندی پر تھے۔ ان کی سنگ اندازی [۱۰۷] کا مقابلہ ایک چھوٹی ٹکڑی نہیں کر سکتی تھی، اور اپنے ساتھیوں کو جاتا دیکھ کر انہوں نے اس آخری مورچے کو زیادہ اہمیت بھی نہ دی، اور خود بھی روانہ ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ کو خوف ہوا کہ کہیں یہ شہر مدینہ میں گھس کر وہاں لوٹ مار اور آتش زنی نہ کریں۔ مگر جب یہ خبر ملی کہ گھوڑوں کو کوتل بنا کر دشمن اونٹوں پر سوار جا رہا ہے تو یہ نتیجہ نکالا گیا کہ وہ لمبے کوچ کا ارادہ رکھتا ہے۔ مدینہ پر دھاوے کا نہیں۔ [۱۰۸] آنحضرتؐ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئے اور اس خیال سے کہ دشمن اپنی غلطی پر نادم ہو کر پھر، راستے سے واپس نہ

پلٹے۔ آپؐ قریش کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے اور آٹھ دس میل تک جا کر کافی عرصے راستے پر قیام کیا، اور جب اطمینان ہو گیا تو مدینہ واپس آئے۔[۱۰۹]

خندق:

احد کی لڑائی میں قریش جیت تو گئے لیکن مدینے میں اپنا فوجی دستہ چھوڑ جانے اور اپنے شامی کاروانوں کے راستے کی مستقل حفاظت کا اطمینان کرنے پر انہوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قریش اور ان کے حلیف ہمراہیوں کے مدینے سے دور نکلتے ہی مسلمان اپنے گھروں میں آ گئے۔ اور جلد ہی انہوں نے اپنا کھویا ہوا وقار نہ صرف حاصل کر لیا، بلکہ اپنے اثرات مشرق میں نجد تک [۱۱۰] اور شمال میں کاروانوں کے جنکشن دُومتہ الجندل کے قریب تک پھیلا دیئے [۱۱۱] اور قریش کا نہ صرف شام و مصر بلکہ عراق [۱۱۲] کا راستہ بھی موثر طور سے بند کر دیا اور خود شہر مدینہ میں بھی وہاں کے یہودیوں کی روز افزوں جلاوطنی اور نو مسلم عرب قبائل کے توطن سے ان کی حالت مستحکم تر ہو گئی۔ (دیکھئے میرا خصوصی مقالہ بعنوان ''ہجرت'' رسالہ سیاست، حیدر آباد دکن، جولائی ۱۹۴۰ء)

یہودیوں کی جلاوطنی تازہ مشکلات کا باعث بنی۔ یہ لوگ مدینے کے شمالی علاقوں میں جا کر بسنے لگے، جیسے خیبر، وادی القراء اور دیگر یہودی نو آبادیاں جو شامی راستے پر فلسطین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ غالباً دُومتہ الجندل میں بھی ان کے خاصے اثرات تھے۔ کیوں کہ مدینے آنے والے غلے وغیرہ کے کاروانوں کو اب دومتہ الجندل میں بھی چھیڑا جانے لگا [۱۱۳]۔ ان یہودیوں نے اپنے معاشی اثرات سے ایک طرف تو عظفان [۱۱۴] وغیرہ قبائل کو مدینے پر دھاوا بولنے کے لئے فراہم کر دیا اور دوسری طرف قریش کو بھی ان تیاریوں سے آگاہ کر کے مدینے پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کر دیا [۱۱۵] اور یہ سب تیاریاں پوری مستعدی سے کوئی دو سال تک ہوتی رہیں اور

شوال ۵ھ میں مدینے کی خندق کا محاصرہ کرلیا گیا۔

دومتہ الجندل میں مدینے آنے والے کاروانوں کو ستایا بلکہ روکا جانے لگا تو آنحضرتؐ خود ادھر روانہ ہوئے۔ تاکہ اس کانٹے کو راستے سے صاف کیا جائے [۱۱۶] بظاہر دوران مہم میں آپ کو اس مخالفانہ سازش اور جتھا بندی کا پتہ چل گیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اب بہت جلد وار کیا جانے والا ہے۔ اسی لئے خلافِ معمول آپ آدھے راستے [۱۱۷] سے مدینے واپس آگئے اور شہر کی مدافعت کا انتظام کرنے لگے۔

اسلامی مورّخ عام طور سے لکھتے ہیں کہ مدافعت کے مشورے میں حضرت سلمان فارسیؓ نے رائے دی کہ شہر کے اطراف ایک خندق کھودی جائے جیسا کہ ایران میں رواج ہے۔[۱۱۸] مکتوبات نبوی میں سے ایک میں جو مغازی الواقدی اور مقریزی کی ''التخاصم بین بنی ھاشم و بنی امیہ'' میں ملتا ہے۔ ابوسفیان نے طعنہ زنی کی کہ مقابلے کی جگہ قلعوں میں گھس بیٹھے ہو اور حیرت ظاہر کی کہ یہ نیا داؤں کس سے سیکھا۔ اس کے جواب میں آنحضرتؐ نے لکھا کہ خدا نے آپ کو یہ چیز الہام کی۔[۱۱۹] بہرحال جو بھی ہو۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ۵ ھ میں یورش کا مقابلہ آنحضرتؐ نے ترقی یافتہ اصول جنگ سے کیا۔ کم وبیش یہی رائے آپ کی جنگ احد میں تھی کہ شہر میں محصور رہ کر مدافعت کریں۔ مگر نوجوان سپاہیوں اور افسروں کے اصرار پر آپ نے شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا تھا اور ستر مسلمانوں کی کثیر تعداد کا نقصاب برداشت کرنا پڑا تھا۔

واقدی [۱۲۰] کا بیان ہے کہ دومتہ الجندل کی مہم سے واپس آنے اور خندق کی تجویز پختہ ہونے کے بعد آنحضرتؐ چند انصار و مہاجرین کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے اور شہر کے اطراف ان مقامات کا معائنہ فرمایا جو جنگ اور محاصرے میں اہمیت رکھ سکتے تھے اور اس مقام کی تلاش کی جہاں پڑاؤ ڈال کر مسلمان سپاہی اتر سکیں اور یہ طے ہوا کہ حسب معمول عورتیں، بچے، جانور، غلہ اور قیمتی اثاث البیت ان

گڑھیوں میں منتقل کردیئے جائیں جو مدینے کے اطراف میں سینکڑوں کی تعداد میں تھیں۔اور جن کو آطام اور آجام کہا جاتا تھا اور مسلمان سپاہی جبل سلع کے دامن میں خیمے لگادیں اور اپنے سامنے ایک لمبی اور گہری خندق کھود دیں۔

شہر کے اطراف خاص کر جنوب میں باغوں کا جال بچھا ہوا تھا۔اور ان کے درمیان جو تنگ راستے تھے ان میں سے گزرنے کی کوشش دشمن کو صف کی جگہ قطار بنانے پر مجبور کرتی تھی اور ان راستوں میں چھوٹی چھوٹی چوکیاں بھی بڑی سے بڑی فوج کو روک دینے کے لئے کافی تھیں۔مشرق میں بنو قریظہ وغیرہ یہودیوں کے سینکڑوں مکان اور باغ تھے اور فی الوقت ان سے بہت اچھے تعلقات تھے اور ادھر سے بھی اطمینان سا تھا۔شمال کا رخ ہی سب سے خطرناک تھا۔ایک حد تک مغربی رخ بھی۔اس لئے آنحضرتؐ کی ابتدائی تجویز کے مطابق شمال میں حرۂ شرقی اور حرۂ غربی کو ملاتی ہوئی ایک خندق کھودی گئی جو نیم دائرہ بناتی ہوئی جبل سلع کے مغربی کنارے سے آملی [۱۲۱] پھر مختلف قبائل نے اپنے محلوں کی حفاظت کے لئے اپنے طور پر [۱۲۲] اسے جنوب میں عید گاہ میں (مسجد غماہ یا مصلّی) کے مغرب سے گزارتے ہوئے کافی دور تک قبا کے رخ میں بڑھادیا۔شہر مدینہ کی تاریخ میں مطری نے لکھا ہے کہ اب وادی بطحان راستہ بدل کر اس جگہ سے گزرنے لگی ہے۔ جہاں خندق کھودی گئی تھی [۱۲۳]۔ واقدی [۱۲۴] کا بیان ہے کہ قبا میں بھی بعض قبائل نے اپنے آطام کے اطراف خندق کھود دی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ خندق کو عبور کرنے کے لئے بعض جگہ ''دروازے'' (نہ کھدی ہوئی کم چوڑی زمین کی صورت میں) بھی رکھے گئے تھے لیکن وہ کس جگہ تھے۔ واقدی کو بھی معلوم نہ ہوسکا۔[۱۲۵] قیاس کہتا ہے کہ اس سے مراد وہ پہاڑیاں ہوں گی۔جن کو خندق کے زنجیرے کی کڑیاں بنایا گیا تھا، اور یہ پہاڑیاں عبور و مرور کے لئے ممکن ہونے کے ساتھ ساتھ دیکھ بھال کی چوکیاں بھی تھیں۔ چنانچہ مسجد ذباب اس کا اب بھی بقایا ہے۔جس پر ابتداً آنحضرتؐ کے لئے ایک ترکی ڈیرہ [۱۲۶] لگایا

گیا اور پھر جہاں اس کی یادگار میں دروازے والی مسجد (زوباب) بنائی جواب ذباب کہلانے لگی ہے۔

غرض جیسا کہ بیان ہوا شہر مدینہ بکثرت محلّوں پر مشتمل تھا اور ان محلّوں کے مابین کافی مسافت تھی اور یہ درمیانی زمین باغات اور نخلستان کی صورت میں تھی۔ جن کے اطراف اکثر صورتوں میں پتھر کی مستحکم اور خاصی بلند دیواریں تھیں جن کی وجہ سے خود باغوں کو ''حائطٌ'' کہا جانے لگا۔ ایسے باغ اب تک مدینہ منورہ میں باقی ہیں۔ اور ان میں پختہ اور وسیع کنویں اب بھی اس قابل ہیں [۱۲۷] کہ ان میں درجنوں لوگ اتر کر چھپ جائیں اور ان پختہ دالانوں اور حجروں سے جو کنوؤں کے اندرونی حصے میں بنائے گئے ہیں، گڑھیوں بلکہ چھوٹے قلعوں کا کام لیں (یہ کنوئیں حالت امن میں قیدیوں کے لئے مجلس کا کام بھی دیتے تھے جیسا کہ کتانی [۱۲۸] نے بحوالہ عینی لکھا ہے کہ کانت السبحون آبارا) اور مختلف محلوں کے یہ باغ اور گھر باہم کچھ اس طرح متصل ہوگئے تھے کہ متعدد جگہ دو اونٹ گزرنے کے قابل عریض گلیوں کے سوا کوئی اور گزرگاہ بھی نہیں تھی۔ یہ حالت خاص کر قبا کے یعنی جنوبی رخ میں اب تک نظر آتی ہے عہد نبوی میں جب کہ یہ باغ بہت زرخیز حالت میں تھے ان کی حالت جو کچھ ہوگی اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے جو سمہودی نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔

عن ابن اسحاق کان احد جا نبی المدینہ عورۃ دسائر جوانبھا مشککۃ بالبنیان و النخیل لاتیمکن العدوّ منھا(وفاء الوفاء تحت کلمۃ درخندق)	ابن اسحاق سے روایت ہے کہ شہر مدینہ کا ایک رخ کھلا ہوا تھا اور اس کے باقی رخ عمارتوں اور کھجور کے گھنے باغوں سے گھرے ہوئے تھے جن میں سے دشمن گزر نہیں سکتا تھا۔
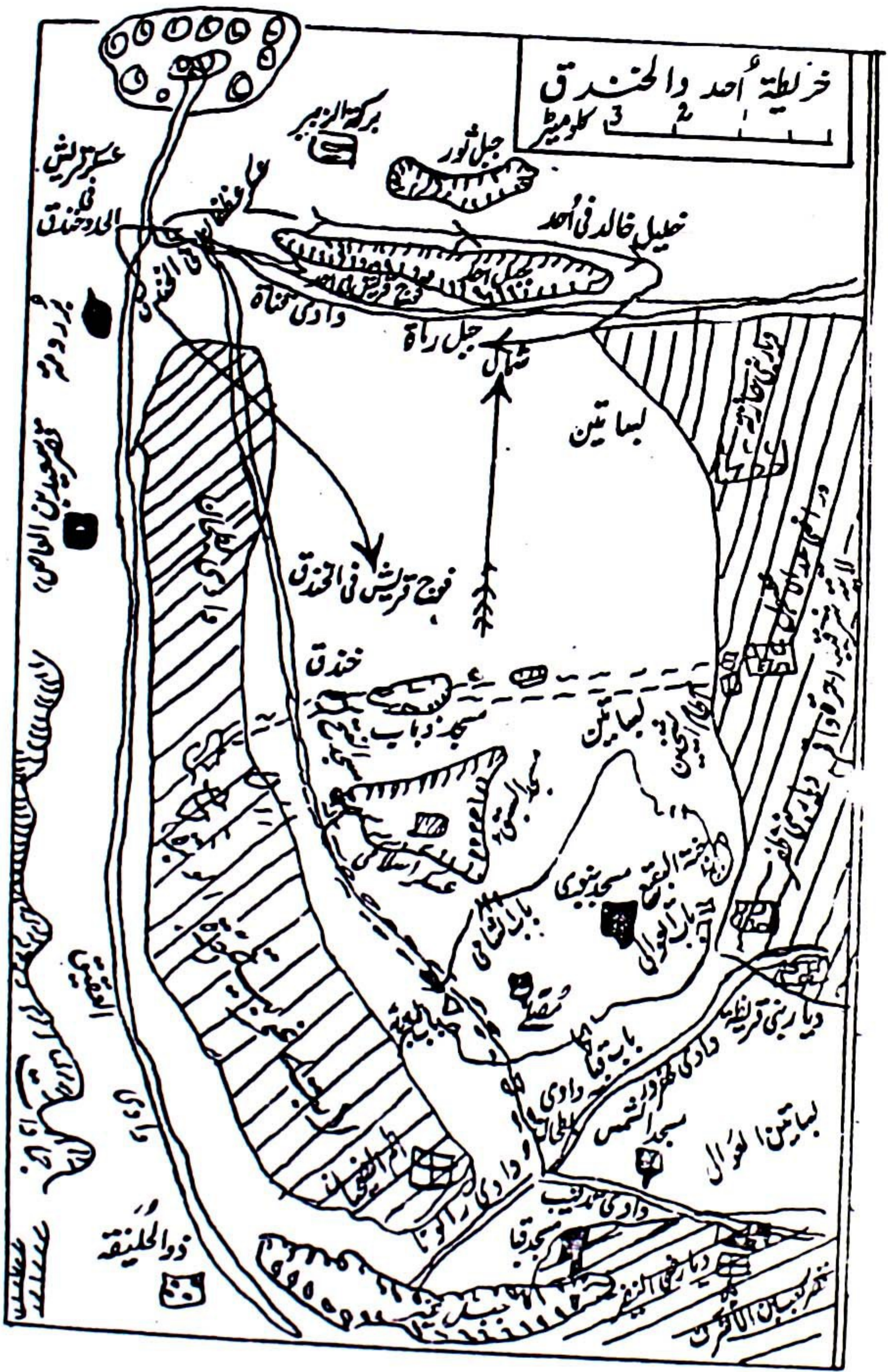
اسی ایک کھلے رخ یعنی شمال کی جانب خندق کھودی جانی طے ہوئی چنانچہ اولاً اس علاقے کی پیمائش کی گئی۔ پھر کام رضا کاروں کا بانٹا گیا اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رضا کارانہ خدمت کی دعوت پر جب تین ہزار مسلمانوں نے لبیک کہی تو ہر دس دس آدمیوں کی ٹکڑی پر چالیس ''ذراع'' (جو شاید بیس گز کے مترادف ہے) لمبی خندق کھودنے کا کام سپرد ہوا۔[۱۲۹] دوسرے الفاظ میں یہ خندق تقریباً ساڑھے تین میل طویل تھی۔ گہری اور چوڑی کتنی تھی۔ اس کا کوئی پتہ مجھے اب تک کسی کتاب میں نہیں ملا۔ لیکن اس کے کئی مرتبہ تذکرے ملتے ہیں کہ دشمن کے سوار خندق کود کر آنے کی کوشش میں ناکام رہے اور ایسی ہی ایک کوشش میں ایک سوار خندق کے اندر گر کر مر گیا[۱۳۰]۔ اس طرح کوئی تعجب نہیں جو دس گز چوڑی اور اتنی ہی گہری خندق کھودی گئی ہو۔

خندق کی کھدائی کے زمانے میں آنحضرتؐ اپنا مکان چھوڑ کر خندق سے متصل ایک پہاڑی پر خیمہ لگا کر مقیم ہو گئے[۱۳۱]۔ جس کی یادگار آج تک مسجد ذباب (اصل میں ''ذوباب'' یعنی دو دروازے والی مسجد) موجود ہے سپہ سالارِ اعظم کی یہ مستعدی ظاہر ہے کہ رائیگاں نہیں جا سکتی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ رسولِ کریمؐ نے دس آدمیوں کی ایک ٹکڑی میں خود بھی شرکت فرمالی۔ (اسی ٹکڑی میں سلمان فارسیؓ بھی تھے) اور کھدائی میں برابر کا حصہ لیتے رہے۔[۱۳۲]

سلمان فارسیؓ ایک قوی ہیکل آدمی تھے۔ اور کئی آدمیوں کی مجموعی کام کے برابر خود کرتے تھے (چنانچہ بقول واقدی جعلوا لہ [۱۳۳] خمس ذرع طولا و خمس فی الارض) اس لئے ہر ٹکڑی کے لوگ چاہتے تھے کہ سلمان ان کے ساتھ ہوں۔ اس پر بروایت ابن ہشام وغیرہ رسول کریم نے فرمایا ''سلمان منا اھل البیت'' (یعنی نہیں، سلمان تو ہمارے اہل بیت کے ساتھ ہوں گے) اس جملے سے شاید یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رسول کریمؐ کی ٹکڑی میں زیادہ تر اہل بیت نبوی کے

افراد مثلاً حضرت علیؓ وغیرہ ہوں گے۔[۱۳۴] بعض بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی آنحضرتؐ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ چنانچہ واقدی [۱۳۵] اور شامی [۱۳۶] نے ایک روایت نقل کی ہے کہ کثرتِ کار اور شب بیداری سے تھک کر ایک دن آنحضرت خندق کی کھدائی کے وقت آرام لینے لیٹ گئے تو:

''ورائت ابا بکر و عمر واقفین علی راسه (صلعم) ینحیان الناس ان یمروا به فینبهم	راوی کہتے ہیں: میں نے ابو بکرؓ اور عمرؓ کو دیکھا کہ وہ آنحضرتؐ کے سرہانے کھڑے تھے اور لوگوں کو ہٹا رہے تھے، ایسا نہ ہو کہ وہ آپؐ کے پاس سے گزر کر آپ کو بیدار کر دیں۔

اسی روایت میں ایک دلچسپ جملہ یہ بھی ہے:۔

وکان ابو بکر و عمره یتفرقانه فی عمل ولا میر ینقلان التراب فی ثیابهما یومئذمن العجلته اذلم یجرو احکلاتلا لعجلة المسلمین............	اور ابو بکرؓ و عمرؓ کبھی کام کرنے میں یا کہیں آنے جانے میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے، جلدی میں یہ مٹی کو اپنے کپڑوں میں ڈھوتے تھے کیونکہ مسلمانوں کو جلدی میں ٹوکریاں نہیں مل سکتی تھیں۔

ابن سعد [۱۳۷] سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ راتج (حرۂ شرقی) سے جبل ذباب تک مہاجرین مامور تھے اور وہاں سے جبل بنی عبید اور فتح تک انصار۔ بعض تاریخوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں نے بنو قریظہ کے یہودیوں سے کھدائی کا سامان مستعار حاصل کیا تھا[۱۳۸] اس وقت تک بنو قریظہ کو اتنی ہمت نہ ہوئی تھی کہ اپنے دلی جذبات غداری کو ظاہر کریں کیونکہ دشمن ابھی آیا نہ تھا۔اور ۱ھ کے معاہدے کے تحت[۱۳۹] وہ مدافعت مدینہ میں مسلمانوں کا ہاتھ بٹانے کے پابند تھے۔

یہ کھدائی بعض بیانوں کے مطابق کوئی تین ہفتے جاری رہی۔ جب ''سرکاری'' خندق شمال میں مکمل ہونے لگی تو مختلف محلوں کے باشندے بھی دیکھا دیکھی اپنے طور پر اس سامان مدافعت سے استفادہ کرنے اور خندق کی اپنے محلے کے سامنے توسیع کرنے لگے اور اس طرح شہر کے مغرب میں بھی کوئی دو ڈھائی میل کی خندق کھد گئی۔ اس کے علاوہ بعض آطام کے گرد خندق کھودلی گئی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ خندق کی کھدائی کے دوران میں رضا کار جو اشعار گاتے تھے ان میں سے بھی چند تاریخ نے محفوظ کئے ہیں۔[۱۴۰]

واقدی [۱۴۱] نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ جو انسانی عناصر کے ہر زمانے میں پائے جانے پر دلالت کرنے کے باعث نقل کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ حضرت زید بن ثابتؓ جو اس وقت دس بارہ سال کے بچے ہوں گے۔ خندق کھودنے میں ہاتھ بٹانے لگے اور دھوپ اور محنت سے تھک کر ایک دن جو ذرا کہیں لیٹے تو آنکھ لگ گئی حضرت عمارہ بن خرم بڑے ہنس مکھ اور چلبلی طبیعت کے تھے ان کی جو نگاہ پڑی تو بچے سے بھی دل لگی نہ چھوڑی اور حضرت زید بن ثابت کا کھدائی کا سامان اور کپڑے چپکے سے اٹھا کر کہیں چھپا دیئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بڑا تو بیدار ہونے پر سمجھ جائے کہ کسی دوست کی شرارت ہے لیکن کسی کم سن جوشیلے کا اس ''اپنی کوتاہی اور قصور'' پر گھبرا جانا ناگزیر ہے۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے ایک طرف حضرت زید کو ابو رقاد کہہ کر ملامت کی (یعنی بڑا سونے والا) اور دوسری طرف حضرت عمار کو تنبیہ کی کہ کن صورتوں میں مذاق نا مناسب ہے۔ خندق کی کھدائی ہر جگہ یکساں رفتار سے نہ رہی ہوگی۔ شمال میں چوڑ کی زمین آسانی سے کھد گئی ہوگی۔ حرہ میں دشواری ہوئی ہوگی۔ چنانچہ سنگِ مرمر کی ایک چٹان سے رضا کار عاجز ہو کر یہ اجازت لینے آئے کہ پیمائشی جگہ سے خندق کو ذرا ہٹادیں۔ آنحضرت کا اس چٹان کو خود آکر توڑنا مشہور واقعہ [۱۴۲] ہے ایک اور واقعہ ابن ہشام ص ۶۷۱ میں مذکور ہے۔

کھدائی مکمل ہونے لگی تھی کہ شوال میں دشمن بھی آ پہنچا۔ آنحضرتؐ نے فوراً عورتوں بچوں وغیرہ کو حسب معمول گڑھیوں میں بھیج دیا[۱۴۳] اور خود پوری فوج کے ساتھ جبل سلع پر پڑاؤ لگا کر مقیم ہو گئے اور آپ کا خیمہ بھی اب جبل ذباب سے جبل سلع کے ایک اہم مگر محفوظ مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ آپؐ کی خیمہ گاہ پر اب مسجد فتح بطور یادگار پائی جاتی ہے[۱۴۴] اور اسی کے قریب آپ کے سپہ سالاروں کے خیمے تھے۔ وہاں بھی مسجدیں تعمیر کی گئی ہیں، جو حضرت سلمان، حضرت ابو بکر، حضرت عثمان اور حضرت ابو ذر رضی تعالیٰ عنہم کی طرف منسوب ہیں اور یہ سب مساجد خمسہ کے نام سے مشہور ہیں اور اب تک پائی جاتی ہیں۔

دشمن جیسا کہ معلوم ہے متعدد حلیف قبائل پر مشتمل تھا اور ان کے متحد کرنے اور چڑھائی پر آمادہ کرنے میں مدینے سے نکالے ہوئے یہود بنو النضیر نے بڑا حصہ لیا تھا۔ قریش نے احد کی فتح سے ہمت پاکر اور دیگر قبائل نے مال غنیمت کے لالچ میں مدینے کا محاصرہ کرنے کی ٹھانی۔ بنو نضیر نے جو اپنے پورے مال و دولت کے ساتھ خیبر اور دیگر مزید شمالی علاقوں میں جا بسے تھے، اپنے ہمسایہ عرب قبائل کو جن میں غطفان بہت اہمیت رکھتے ہیں، اپنے سرمایہ دارانہ اثرات سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے خلاف ابھارا تھا۔ غرض یہودی کارندوں نے وہ تمام انتظامات طے کر دیئے جو مدینے کے شمال اور جنوب دونوں طرف سے آنے والے حلیفوں کے لئے وقت اور مقام وغیرہ کے سلسلے میں ضروری تھے۔ چنانچہ بقول واقدی (مغازی ورق ۱۰۱ تا ۲) خیبر کا ایک سال کا پورا کھجور غطفان کو دیا گیا تھا۔ غرض قریش اور کنانہ اور احابیش کے قبائل وادی عقیق کے قریب بئر رومہ پر مقرر ہوئے[۱۴۵] اور غطفان اور بنو اسد اس سے کسی قدر مشرق میں وادی النعان کے پاس ذنب نقمی نامی مقام سے جبل احد تک پھیل گئے ان مقاموں پر پانی اور گھاس کی کافی سہولتیں ہیں۔ گو بیان کیا جاتا ہے کہ فصلیں کٹ کر کافی عرصہ ہو چکا تھا (مغازی الواقدی ورق ۱۰۲)

مسلمان جبل سلع پر اور اس کے دامن میں مقیم تھے اور خندق کی باری باری سے ان کی ٹکڑیاں نگہبانی کرتیں اور پہرہ دیتیں[۱۴۶] اور جب کبھی دشمن خندق کے کسی میدان پر نرغہ کرتا تو مسلمانوں کی فوج تیروں سے اس کا استقبال کرتی۔ دشمن کے سوار بھی خندق کی دوسری طرف منڈلایا کرتے اور غفلت کی تلاش میں رہتے۔ ایک آدھ مرتبہ دشمن کے بعض سردار اپنے عمدہ گھوڑوں کو خندق کدانے میں کامیاب ہوگئے[۱۴۷] لیکن یہ ظاہر ہے کہ اکا دکا آدمی محصور مقام میں گھس آئے اور اسے مدد دینے والے نہ آسکیں تو اس جسارت پر خود اسی کو بھگتان بھگتنا پڑتا ہے اور خندق کے معرکے میں بھی یہی ہوا۔ بعض لوگ خندق کدانے کی کوشش میں کھائی میں گر پڑے اور جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ایک مرتبہ رات کے وقت مسلمانوں کی دو ٹکڑیوں کی مڈبھیڑ ہوئی اور ایک دوسرے کو نہ پہنچان کر ہتھیار چلا ڈالے جس سے کچھ خون بہا اور چند زخمی ہوئے پھر اپنے معمولی شعار کے نعرے لگانے سے متنبہ ہوئے۔ رسول اکرم ﷺ کو اطلاع ہوئی۔ آپؐ نے مرنے والوں کو شہید قرار دیا اور مجروحوں کی جراحت فی سبیل اللہ، لیکن خون اور زخم پر کوئی جرمانہ عائد نہ فرمایا[۱۴۸]۔

محاصرے میں روز افزوں شدت ہوتی گئی تو مدینے کے مشرق میں رہنے والے بنو قریظہ (یہودیوں کا رنگ بھی بدلنے لگا اور افواہوں کی توثیق کے لئے آنحضرتؐ نے جاسوس بھیجے اور انہیں راز میں سمجھا دیا کہ معاملہ دگرگوں دیکھو تو سب سے کہہ کر پریشانی میں اضافہ نہ کرنا بلکہ پیشگی معینہ (اور بظاہر اطمینان دہانی کے) الفاظ آنحضرتؐ سے کہنا جس کا مطلب آپ سمجھ جائیں گے۔ مگر دوسرے سننے والے عوام بے خبر[۱۴۹] رہیں گے۔ بنو قریظہ کی غداری کی توثیق تو ہوگئی لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ کب وار کرنے والے ہیں اور چونکہ ان کو مسلمانوں کے پیچھے سے گھس آنے یا شہر مدینہ کے لوٹ لینے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اس لئے حضرت ابو بکر کا بیان ہے[۱۵۰]۔

ولقد كنت ادانی علی سلع فانظر الی بیوت المدینة فاذا رایتهم هادئین حمدث الله.

میں بار بار جبل سلع کی چوٹی پر چڑھ کر نظر دوڑاتا اور جب مدینہ کے گھروں کو پرسکون پاتا تو خدا کا شکر کرتا۔

اب صورتِ حال جتنی خطرناک ہوگئی تھی ظاہر ہے قرآن تک میں اس کا نقشہ پر درد الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

اذ جاء کم من فوقکم ومن اسفل منکم واذازاغت الابصارو بلغت القلوب الحناجو و تظنون بالله الظنونا هنا لک ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالا شدیدا.

جب وہ تمہاری طرف آئے تو تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے اور نظریں خیرہ ہوگئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم خدا سے متعلق عجیب بدگمانیاں کرنے لگے اس موقع پر ایمان والوں کی آزمائش ہوئی اور ان میں ایک شدید زلزلہ مچ گیا۔

اس وقت فوری کاروائی کی ضرورت تھی۔ آنحضرتؐ نے خفیہ قاصد غطفانیوں اور فزاریوں کے سردار حارث بن عوف اور عینیہ بن حصن کے پاس بھیجے اور ان سے معاہدہ کرلینا چاہا کہ وہ مدینے کے کھجوروں کی فصل کا معقول حصہ لے کر محاصرے سے دست بردار ہوجائیں۔ مگر شرطیں کڑی تھیں اور مسلمان ان پر آمادہ نہ ہوئے اور لکھی ہوئی دستاویز معاہدہ مٹادی گئی۔[۱۵۱]

اب واحد چارہ کار حلیفوں میں پھوٹ ڈلوانا اور غلط فہمی پیدا کرنا تھا۔ کئی ہفتوں کے قیام کے باعث محاصرہ کنندوں کا آذوقہ ختم ہو چلا تھا۔ اور ان کے پاس آنے والی رسد بھی مسلمانوں نے لوٹ لی تھی۔[۱۵۲] اس لئے وہ بنی قریظہ کو جلد حملہ کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ مسلمان فوج تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ قریش وغیرہ محاصرہ کرنے والے چھ سات ہزار تھے۔ بنو قریظہ میں ڈیڑھ ہزار سے زیادہ سپاہی

تھی۔ خندق اتنی طویل تھی کہ مسلمان ادھر سے اپنی جمیعت کو گھٹانے اور بنو قریظہ سے مقابل ہونے کا خیال بھی نہ کر سکتے تھے۔

آنخضرتؐ نے چند نو مسلم کارندے بنو قریظہ کے پاس بھیجے جن کا اسلام لانا ابھی مشہور نہ ہوا تھا۔ انہوں نے بن قریظہ میں اپنے دوستوں سے کہا کہ قریش کا جیتنا سو فی صد یقینی نہیں۔ تم نے اگر محمدؐ سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لیا اور قریش محاصرہ اٹھا کر چلتے بنے تو پھر تم تنہا محمدؐ سے کیا مقابلہ کرو گے؟ بہتر ہو کہ تم قریش سے چند یرغمال مانگو کہ وہ لڑائی کو انتہا تک جاری رکھیں گے۔ یہ چیز جب ان کی سمجھ میں آ گئی تو یہی کارندے قریش وغیرہ حلیفوں میں پہنچے اور مشہور کیا کہ بن قریظہ اور آنخضرتؐ میں ساز باز ہو گئی ہے اور وہ قریش کے سرداروں کو کسی بہانے سے اپنے پاس بلا کر آنخضرتؐ کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں اتنے میں بنو قریظہ کے سفیر پہنچے اور اپنے حملے سے پہلے چند یرغمال طلب کئے تو فوراً قریش کو یقین آ گیا کہ ان کی آنخضرتؐ سے ساز باز کی خبر صحیح ہے (ابن ہشام وغیرہ، بر موقع)

ایک اور شخص کو آنخضرت [۱۵۳] نے یہ باور کرنے کا موقع دیا کہ بنو قریظہ کا یرغمال مانگنا آنخضرتؐ ہی کے حکم سے ہے اور جب اس نے وہ اطلاع قریش کو دی تو پھر انہیں ذرا بھی شبہ نہیں رہا اور یہودیوں سے کشیدگی اور کبیدگی حد کو پہنچ گئی۔

اس اثنا میں شوال کا مہینہ ختم ہو چلا اور ذیقعدہ سر پر آ گیا جو اشہر حرم کا آغاز تھا۔ جس میں قریش مذہباً جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ [۱۵۴] فتح کے امکانات نہ رہے اتنے میں موسم بھی خراب ہو گیا، بارش، طوفان، سردی، وغیرہ سے محاصرہ کنندہ پریشان ہونے لگے اور آخر بیزار ہو کر ابو سفیان نے پیش قدمی کی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ روانہ ہو گیا۔ اس پر دوسرے قبائل بھی بے بس ہو گئے اور یکے بعد دیگرے سب چلتے بنے [۱۵۵] اور مطلع صاف ہو گیا۔

فتح مکہ:

جیسا کہ ایک حدیث میں بیان ہوا ہے، محاصرہ خندق کے اختتام پر رسول کریمؐ نے محسوس فرمالیا کہ اب قریش کی چڑھائیاں ختم ہوچکیں اور ان کی قوت بھی۔ چنانچہ اس کے بعد سے مسلمانوں کے اقدام کا موقع نکل آیا اور قریش صرف مدافعت کرنے لگے۔ اس تبدیلی صورتِ حال کے متعدد وجوہ تھے اور صرف بدر اور خندق میں قریش کی ناکامی فیصلہ کن امر نہ تھی۔

اصل میں آنحضرت نے دشمن کو نابود کرنے کی جگہ مجبور کرنا پسند فرمایا۔ اس کے لئے دو تدبیریں تھیں، ایک تو قریش کو معاشی دباؤ سے بے بس کر دینا اور دوسرے اپنی فوجی قوت اتنی بڑھالینا کہ دشمن مقابلے کی جرات ہی نہ کرسکے اور بغیر خون بہائے مقصد حاصل ہو جائے۔

وادی غیر ذی زرع کے رہنے والوں کا واحد ذریعہ معاش نہیں تو سب سے بڑا ذریعہ ''رحلتہ الشتاء والصیف'' تھا۔ ہجرت کے دو چار مہینے کے اندر ہی آنحضرتؐ نے ''رحلتہ الصیف'' یعنی شمالی راستہ جو ینبوع کے قریب سے مصروشام کو جاتا تھا۔ وہاں کے قبائل سے حلیفی کر کے قریش کے لئے تنگ بلکہ بند کردیا۔ چنانچہ مدینہ اور ینبوع کے مابین بسنے والے قبائل کے معاہدے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں[۱۵۶] اس کے بعد اسلام کے پھیلنے اور آنحضرتؐ کے فتوحات نے اسلامی اثرات نجد تک بھی پھیلا دیئے اور عراق کا راستہ بھی قریش کے لیے بند ہوگیا [۱۵۷] طائف اور یمن کا راستہ پوری طرح بند نہ ہوا لیکن بین الاقوامی تجارت جو یمن اور مکے کے راستے ہندوستان سے یورپ کو ہوتی ہے اس کا گزرنا بند ہونے سے قریش کو خفارے وغیرہ کے سلسلے میں جو آمدنی ہوتی تھی وہ بھی بند ہوگئی۔ ایک موقع پر ایک لاکھ درہم کی چاندی قریش کے کارواں میں سے مسلمانوں نے لوٹ لی تھی [۱۵۸] غالباً یہ اسی بین الاقوامی حمل ونقل سے متعلق ہوگی جنگِ خندق کے بعد اسلامی اثرات نجد سے گزر کر یمامہ تک

پہنچ گئے جہاں سے قریش کے لئے غلے کی درآمد ہوتی تھی اور ثمامہ بن اُثال کے اسلام سے یہ درآمد بھی روک دی گئی تو مورخین کے بیان کے مطابق مکے میں قحط پڑ گیا [۱۵۹] گو اس قحط کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ اسی زمانے میں امساک باراں کی وجہ سے حجاز میں خشک سالی تھی۔ آنحضرتؐ نے ایک دفعہ فقراء مکہ میں تقسیم کرنے کے لئے جو پانچ سو دینار بھیجے تھے اور جس پر ابوسفیان نے کہا تھا کہ یہ مکے والوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے ہے [۱۶۰] وہ غالباً اسی زمانے سے متعلق ہے ان سب سے بھی زیادہ موثر بات یہ ہوئی کہ رفتہ رفتہ قریش کے حلیف ان کا ساتھ چھوڑنے لگے، اور یا تو وہ مسلمان ہوگئے یا بے بس ہوگئے اور مکے کے چاروں طرف اسلامی قبائل پیدا ہوگئے خیبر ۷ ھ میں تباہ ہوگیا اور طائف جس سے قریش کو بڑی امیدیں تھیں فتح مکہ کے زمانے میں صرف تیاریوں میں مصروف رہا اور رمضان ۸ ھ میں جب اچانک اسلامی فوجوں نے مکے کے پہاڑوں کے نیچے پہنچ کر پڑاؤ ڈالا تو قریش یکہ وتنہا تھے اور خود ان کا سب سے بڑا سردار ابوسفیان بعض اتفاقات سے مسلمانوں کے پڑاؤ میں جا کر پھنس چکا تھا۔ [۱۶۱]

یہاں صرف اشارۃً یہ بتا دینا کافی ہے کہ معرکہ خندق کے دوسرے سال ذیقعد ۶ ھ میں آنحضرتؐ مکہ گئے اور قریش کی منہ مانگی شرطیں قبول کر کے دس سال کے لئے ان سے صلح کرلی اور صرف ان سے یہ چاہا کہ وہ اسلامی جنگوں میں غیر جانبدار [۱۶۲] اور مثلاً خیبر کے یہودیوں کی مدد نہ کریں چند ہی دنوں میں مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلے (خزاعہ) سے قریش نے جھگڑا مول لیا اور خونریزی کی [۱۶۳] تو آنحضرت نے ''دس ہزار قدوسیوں'' [۱۶۴] کا ایک لشکر جرار تیار فرمایا اور ''حبسِ طریق'' [۱۶۵] کر کے اور اپنا مقصد فوج پر نہ ظاہر کر کے بلکہ دکھاوے کے لئے چکر کھا کر اور نامعلوم راستوں سے گزر کر مکہ [۱۶۶] پہنچے تو قریش کو رات کے وقت پڑاؤ کے چولھوں کی روشنی سے پتہ چلا ورنہ وہ اب تک بالکل بے خبر تھے۔ ابوسفیان نے اسلامی

فوج میں گھر جانے کے بعد اپنی بے بسی دیکھ کر اسلام کا اظہار کیا اور جان بچالی لیکن آنحضرتؐ نے ان کو نگرانی میں رکھا اور اس وقت تک رہا نہ کیا جب تک کہ اسلامی فوج حملے کے لئے روانہ ہو کر صورت حال یہ نہ ہوگئی کہ قریش کے لئے اپنی قوتوں کو جمع کرنا ناممکن ہوگیا۔ مرعوب دل ابوسفیان نے آکر گھبراہٹ کو مکمل کر دیا اور یقین دلایا کہ مقابلہ بے سود ہے اور یہ کہ ہتھیار ڈال دینے، خانہ نشین ہوجانے، ابوسفیان کے گھر میں پناہ لینے یا قومی معبد (کعبہ) کے احاطے میں جہاں خون ریزی کی کسی کو جرات نہ ہوسکتی تھی، چلے جانے پر آنحضرتؐ نے ان کو امن دینے کا وعدہ کیا ہے۔[۱۶۷] ایک طرف ناقابلِ مقابلہ زبردست قوت اور دوسری طرف اس نرمی اور رحم دلی کی خبروں نے لڑائی کی نوبت نہ آنے دی اور قریش نے اپنے شہر پر خاموشی سے آنحضرت کا قبضہ ہوجانے دیا[۱۶۸]۔ البتہ مکے پر چڑھائی اور فوجی نقل وحرکت کی تفصیل یہاں ضروری ہوگی۔

مکہ معظمہ ایک وادی میں واقع ہے جس کے ہر طرف اونچے اور دشوار گزار پہاڑ ہیں۔ صرف ایک بڑا راستہ ہے جو شمالاً جنوباً شہر میں سے گزرتا ہے، اور دو ذیلی رستے ہیں جو اس بڑے راستے میں آکر مل جاتے ہیں یعنی طریق حجون اور طریق کداء فوج کا بڑا حصہ جناب رسالت مآب کے ساتھ عام شمالی راستے یعنی معلات کی طرف سے بڑھنے لگا[۱۶۹]۔ کچھ فوج حضرت الزبیر بن العوام کے تحت طریق کداء سے بڑھائی گئی۔[۱۷۰] تاکہ وادی فاطمہ کی راہ ساحل کی طرف جانے والی گزرگاہ کھلی نہ رہے۔ ایک اور مضبوط دستہ سیف اللہ خالد بن الولید کو دے کر جنوبی راستہ یعنی مسفلہ کی راہ لیط کی طرف سے شہر میں بڑھنے کا حکم دیا[۱۷۱] ایک اور فوج حجون کے راستے بڑھائی گئی۔[۱۷۲] ادھر سے ایک رستہ جدہ جاتا ہے اور ایک شاہراہ جنوب میں یمن کی طرف جاتی ہے اور ہر معرکے کی طرح مسلمانوں کے لئے شعار۔ (واچ ورڈ) بھی مقرر کر دیئے گئے تھے (ابن ہشام ۸۱۸)۔

خریطۂ فتح مکہ
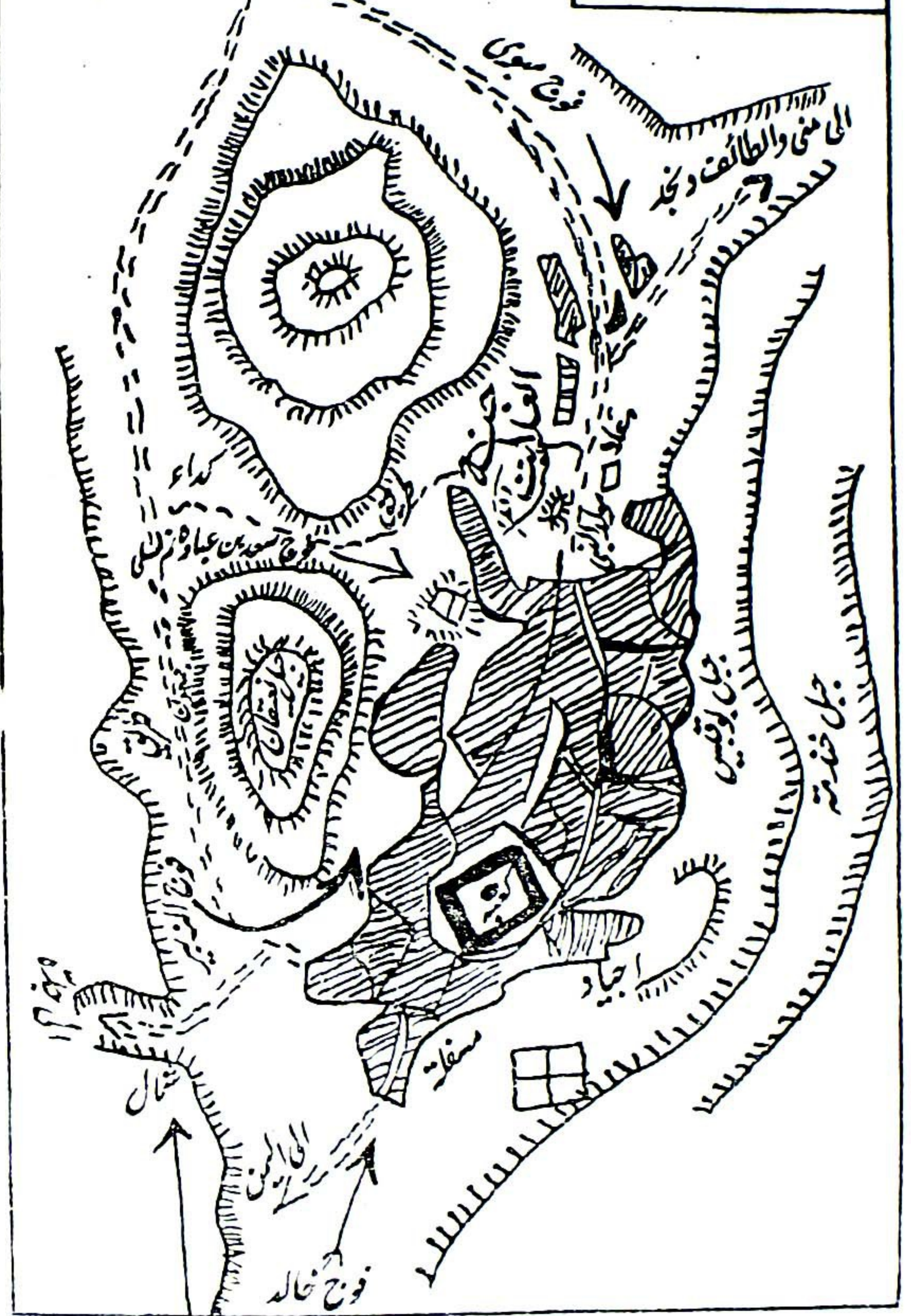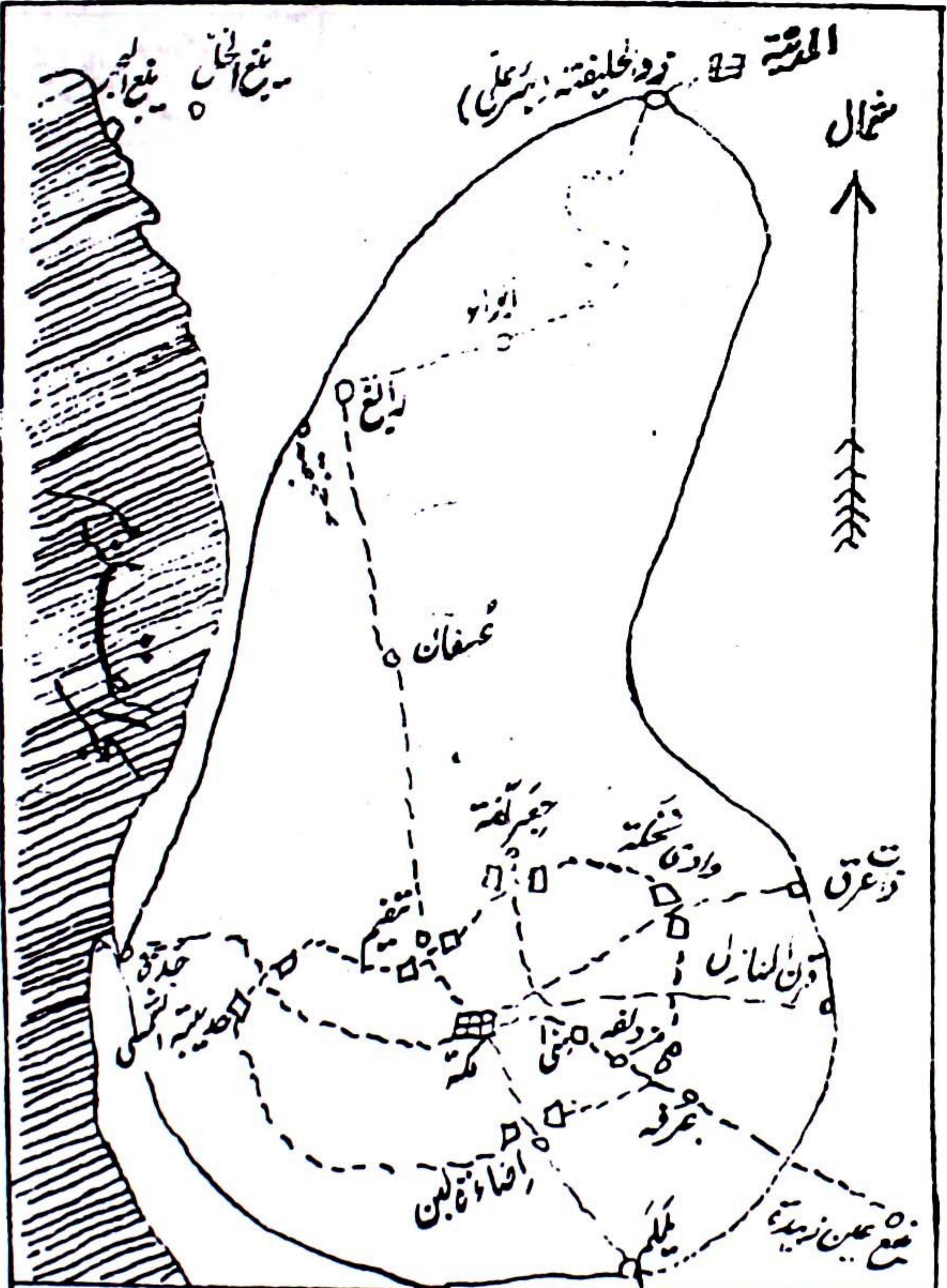
الی مر الظہران (وادی فاطمہ) والمدینۃ

الی منی والطائف ونجد

کداء

جبل ابوقبیس

جبل خندمۃ

اجیاد

مسفلۃ

شمال

الی الیمن

فوج خالد

المدینۃ
ذو الحلیفۃ (بئر علی)
شمال
ینبع النخل
ینبع البحر
ابواء
رابغ
عسفان
جعرانۃ
وادی نخلۃ
ذات عرق
قرن المنازل
تنعیم
حد
حدیبیۃ الشمیسی
مکہ
منیٰ
مزدلفہ
عرفہ
اضاۃ لبن
یلملم
نبع عین زبیدۃ

حدود میقات الاحرام
حدود الحرام المکی و معالم الحرام
طریق المسافرین

حدود حرم مکہ

جس صبح کو کوچ تھا۔ اس سے پہلے کی رات کو آنحضرتؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان سپاہی پڑاؤ پر ایک آگ روشن کرے۔ جب دور سے قریش نے ان دس ہزار چولہوں کو دیکھا تو ان کے چھکے چھوٹے گئے کہ حج کے زمانے میں منا میں جو کیفیت ہوتی ہے۔ [۱۷۳] وہی نظر آتی ہے۔ اور انہوں نے خیال کیا کہ جتنے چولہے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ ہی لوگ ہوں گے۔ ان کے اچھے اچھے افسر یا تو مر چکے تھے (مثلا ابو جہل وغیرہ) یا مسلمانوں میں مل گئے تھے۔ (جیسے حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص) یا اس وقت انہیں مشورہ دینے والے موجود نہ تھے (جیسے حضرت ابوسفیان) پچھلی جنگوں کی مسلسل ولا حاصل زحمتیں، معاشی دباؤ کی تکلیفیں، حریف کی اچانک کثیر تعداد میں آمد پر نفسیاتی تردد جب کے حلیفوں کو مدد کے لئے بلانے کا موقع نہ تھا، ابوسفیان کا آخری لمحے میں آکر مقابلے کو بے سود بتانا اور آنحضرتؐ کے رحم دلانہ اعلان معافی کا تذکرہ کرنا، یہ تمام امور اور دیگر واقعات نے قریش کو آمادہ کیا کہ ہتھیار نہ چلائیں اور اپنے آپ کو سابق ہم شہری کے رحم وکرم کے سپرد کردیں:

دس برس کی شبانہ روز جسمانی اور روحانی کاوشوں کے بعد مکے کا جلا وطن اب وہیں فاتحانہ انداز میں داخل ہو رہا تھا، مگر کس انداز سے؟ کسی جبار فاتح کی طرح اکڑتے، سینہ تانے اور مسبب حقیقی کو بھلا کر نشہء خود پرستی میں سرشار؟ نہیں بلکہ ابن ہشام (ص ۸۱۵) کے مطابق شرماتے، بارگاہِ خداوندی میں سرنیاز جھکاتے اور بار بار اونٹی کے کجاوے ہی پر سجدۂ شکر ادا کرتے ہوئے اور پچھلی مالی و روحانی اذیتوں پر انتقام کے خیال کی جگہ **لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطُلَقاء**[۱۷۴] (آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو) کے عفو اور عام درگزر کا اعلان کرتے ہوئے جو الفاظ مولانا مناظر احسن گیلانی کے [۱۷۵] **اذخلوا ھذہِ القریتہ نکلوا منھا حیث شئتم رغداً وادخلو الباب سجداً وَّ قولوُ حطتہٌ**۔ (اس شہر میں داخل ہو اور جیسا چاہو کھاؤ لیکن دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور معافی معافی کہتے

ہوئے داخل ہوکی خالص اسلامی شان کا مکمل مظاہرہ تھا)۔

فوج کی صف بندی اور معائنہ، بدر واحد جیسی ابتدائی لڑائیوں تک میں آنحضرت ملحوظ رکھتے تھے۔ فتح مکہ تک فوج میں اتنا کچھ ضبط اور تنظیم پیدا ہوچکی تھی کہ اب یہ کام ایک خصوصی افسر صف آرائی (ذراع) [۱۷۶] کے سپرد کردیا جا سکتا تھا اور اس کے ذریعے سے احکام کی پوری تعمیل ہوتی تھی۔ فوج میں خبر رسانی کے مکمل انتظامات تھے، اور سپاہیوں اور افسروں کی رتی رتی بات کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ معمولی چیزوں کو نظر انداز کردیا جاتا تھا اور اہم امور میں فوری تدارک عمل میں لایا جاتا تھا۔ چنانچہ مکے پر چڑھائی کی آخری نوبت میں جب [۱۷۷] ایک افسر نے یہ خیال آرائی کی کہ اب مکے کا سر نیچا کیا جائے گا اور اسے لوٹ لیا جائے گا۔ تو فوراً اسے علیحدہ کر کے کمان دوسرے افسر کے سپرد کردی گئی اور عام منادی کرادی گئی کہ مکہ معظمہ اور قبلہء مسلمانان کا سر نیچا نہیں بلکہ اس کی عزت میں آج سے مزید اضافہ ہوگا اور شہر میں ہر طرح امن و امان ملحوظ رکھا جائے گا۔ فوج کی تنظیم اپنے فطرتی رجحانات کے مطابق تھی اور ہر قبیلہ اپنے ہی افسروں کی سرکردگی میں کارگزار تھا۔ مہاجرین، انصار، غفار، وغیرہ کے رضا کار سب کے الگ الگ دستے تھے لیکن ایک ہی کل پرزوں کی طرح ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے تھے۔

حنین اور طائف:

یہ عجیب بات ہے کہ حنین کا مشہور اور اہم میدانِ جنگ جس کا قرآن میں نام کے ساتھ ذکر ہے، صدیوں سے گوشہء گمنامی میں چلا گیا ہے اور پرانے جغرافیہ نگاروں کو یہ تک نہ معلوم ہو سکا کہ حنین کس جگہ واقع تھا۔ وہ مختلف روایتیں بیان کرتے ہیں جن میں باہم تطابق کی کوئی صورت نہیں اور مجبوراً ان کے باہم تعارض کے باعث سب ہی کو ساقط اور نظر انداز کردینا پڑتا ہے حالیہ سالوں میں متعدد اہل علم سیاحوں نے اس

جگہ کا پتہ لگانے کی کوشش کی اور ۱۳۵۷ھ کے اواخر میں حج کے زمانے میں آٹھ سال کے وقفے کے بعد میں نے اس کی دوسری مرتبہ جستجو کی، اور اب کی دفعہ ساٹھ ستر میل کی مسافت گدھے پر طے کرنے کے باوجود بھی گوہر مراد، افسوس سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہاتھ نہ آیا۔

اصل میں ہم لوگ حنین کو مکے اور طائف کے بیچ میں ڈھونڈتے رہے ہیں اور اب میں افسوس کرتا ہوں کہ یہ قصور ہمارا ہی ہے کہ مقصد کو نہیں پہنچتے، سب لوگ جانتے اور مانتے ہیں اور احادیث میں بھی صراحت سے ذکر ہے کہ سوائے تبوک کے موقع کے آنحضرتؐ ہمیشہ فوجی مہموں میں توریہ (دکھاوا) فرمایا کرتے تھے اور غیر سمت میں چل کر نامانوس اور سنسان راستوں سے گزر کر دشمن کو انجان جان لیتے تھے۔ اس لئے یہ قطعاً غیر یقینی ہے کہ آنحضرتؐ مکے سے طائف کو سیدھے راستے سے گئے ہوں۔

یوں بھی سیرت نبویہ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ حنین کی لڑائی جبل اوطاس [۱۷۸] کے دروں اور پر پیچ وادیوں کے قریب ہوئی۔ دوسری اہم تفصیل ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حنین سے فارغ ہو کر جب جب آنحضرتؐ طائف کا محاصرہ کرنے روانہ ہوئے تو نخلۂ یمانیہ اور قرن سے ہوتے ہوئے پہلے مقام لیہ [۱۷۹] پر پہنچے اور وہاں سے آگے بڑھ کر خاص طائف کی فصیل کے نیچے آ ٹھہرے۔

یہ دونوں تفصیلیں بڑی اہم ہیں۔ اولاً اوطاس کے متعلق یہ یاد رہے کہ اس نام کا پہاڑ یا وادی نہ تو مکے اور طائف کے بیچ میں کہیں واقع ہے اور نہ طائف کے آس پاس کسی جگہ۔ البتہ خدا بخشے سلطان عبدالحمید خان ثانی کو انہوں نے حجاز ریلوے ڈالی تو انجینئروں سے ایک نقشہ بھی تیار کرایا۔ اس نقشے میں مقام اوطاس طائف کے شمال مشرق میں کوئی تیس چالیس میل پر اب تک بھی مشہور ہونا بتایا گیا ہے۔

وادی لیہ قدیم سے بڑی مشہور جگہ ہے اور میں نے اسے شہر طائف کے تقریباً مشرق، جنوب مشرق میں کوئی چھ میل پر ایک زرخیز اور آباد گاؤں پایا۔

ایک اور اہم چیز جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ہوازن کا قبیلہ اب بھی موجود ہے اور یہ طائف سے وہاں کے لوگوں کے بیان کے مطابق کوئی تین دن کے فاصلہ پر رہتا ہے اور اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو یہ اسی سمت میں رہتے ہیں۔ جدھر مقام اوطاس نقشہ حجاز ریلوے میں بتایا گیا ہے۔

اب رسولِ کریمؐ کی فوجی نقل وحرکت بہت صاف سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہوازن کو قلع بند شہر طائف میں پہنچنے سے روکا جائے۔ آپ مکے سے تقریباً شمال میں روانہ ہوتے ہیں اور نصف دائرہ سا راستہ بنا کر حنین پہنچتے ہیں اور تھوڑی سی دشواری کے بعد دشمن کو تتر بتر کر کے اوران کے بیوی بچوں اور مال مویشی کو گرفتار کر کے حفاظت سے مکے کی سمت روانہ کردیتے ہیں۔ پھر اسی طرح چکر دار راستے سے آگے بڑھتے ہوئے اوطاس سے ہو کر لیہ پہنچتے ہیں اور وہاں کی گڑھی منہدم کردیتے ہیں (ابن ہشام ص ۸۷۲) اس کی فتح اہل طائف کے لئے بڑا معاشی دکھ پہنچاتی ہے اور پھر آگے بڑھ کر طائف کو ایک ایسے رخ سے آکر گھیر لیتے ہیں۔ جدھر وسیع میدان ہے اور پڑاؤ وغیرہ کی سہولت ہے۔ مگر جدھر سے آپؐ کے آنے کا اہل طائف کو گمان نہیں ہوسکتا تھا۔

حنین غالباً جبل اوطاس کی ایک وادی کا نام تھا۔ میں غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر سفر حجاز کے مواقع پر ادھر نہ جاسکا۔ اس لئے وہاں کی تفصیل دینی ممکن نہیں ہے۔ اصابہ (۲۰۲۶) میں ایک شخص کے اس موقع پر افسر مال غنیمت مقرر ہونے کا ذکر ہے جو یقیناً ہر لڑائی میں ہوتا ہوگا۔ چنانچہ جنگ بدر کے سلسلے میں بھی ابن ہشام (ص ۴۵۷) نے اس کا ذکر کیا ہے۔

طائف تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی پر ایک سطح مرتفع ہے مکے سے وہاں پہنچے کے تین راستے ہیں۔ قریب ترین راستہ جو عرفات سے گزر کر جبل کراء کے دامن میں پہنچتا ہے۔ اور پھر ایک دشوار پہاڑی چڑھائی کے بعد طائف پہنچادیتا ہے، وہ

صرف گدھوں کے ذریعے سے طے کیا جاسکتا ہے یہ تقریباً پچاس ساٹھ میل ہوگا اور عصر کو سوار ہوں تو آدھی تک چل کر صبح تک وقفہ لیتے ہیں۔ پھر ظہر تک طائف پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرا راستہ جو جعرانہ سے گزرتا ہے اونٹوں کے راستے سے طے ہوتا ہے، مجھے اس کی واقفیت نہیں، تیسرا راستہ اب وادی نعمان اور میسل سے گزر کر موٹر میں طے ہوتا ہے اور ڈاک کی موٹر اس ستر پچھتر میل کی مسافت کو تین چار گھنٹوں میں طے کرلیتی ہے، اور ہموار چوڑی وادیوں میں شاید ہی کہیں دشوار گزار راستہ آتا ہو۔

خود طائف میں قدیم زمانے میں قبیلہ وار محلے تھے اور ایک دوسرے سے فرلانگ دو فرلانگ میل دو میل کے فاصلے پر، اور ہر محلے کے ساتھ زراعت اور باغبانی کے الگ انتظامات تھے۔ ایسے بہت سے محلے اب کھنڈر نظر آئے ہیں مگر بعض قدیم محلے اب بھی باقی ہیں اور وادی وَج سے سیراب ہوتے ہیں جو تقریباً نصف دائرہ بناتی ہوئی گزرتی اور بارش کے سوا اور دنوں میں خشک ہوجاتی ہے۔ کیونکہ کسی بند کا آس پاس انتظام نہیں ہے۔ پانی کے چشمے البتہ موجود ہیں اور انہیں سے کاریز (زمین دوز نہریں) نکال کر باغوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں بعض ایرانی انجینئروں کی [۱۸۰] مدد سے سے آبادی کا ایک محفوظ اور سطح حصہ دیکھ کر ایک فصیل کے ذریعے سے قلعہ بند کرلیا گیا تھا اور اسی حصے کو ''طائف'' گھیرا کہتے تھے۔ ورنہ پوری آبادی ''دَجّ'' کہلاتی تھی۔ مقامی روایات کے مطابق لات اور عُزّیٰ کے بت خانے بھی اسی ''گھیرے'' کے اندر تھے ایک کی جگہ آج کل سرکاری ہوٹل یا مہمان خانہ بنا ہوا ہے۔ اور دوسرے کی جگہ ایک بڑا سا خانگی گھر۔ موجودہ فصیل ترکی دور کی یادگار ہے۔ لیکن اس کا کم از کم کچھ حصہ ضرور قدیم ''گھیرے'' ہی کی جگہ ہے کیونکہ شہداء محاصرہ طائف کی قبریں مسجد ابن عباس سے متصل فصیل کے عین نیچے ہی اب تک موجود ہیں۔ اور وہیں حضرت ثابت (کاتب وحی و میر منشی دربار رسالت) بھی آرام فرما رہے ہیں اور بقول ابن ہشام (ص۸۷۲) اسی مسجد کے پاس اسلامی پڑاؤ تھا۔

کسی قلعے کا محاصرہ کرنا طائف میں اسلامی فوجوں کے لئے ایک نیا تجربہ تھا اور ظاہر ہے کہ صحرا نشین خانہ بدوش بدوی جمعیتوں کے مقابلے کے لئے جو اصول جنگ کام آتے ہیں۔ وہ بہت کچھ بے کار تھے۔ اسی لئے آنحضرت نے منجنیق، دبابے اور عرادے اور اسی طرح کے قلعہ شکن آلات استعمال فرمائے [۱۸۱] اور پھر معاشی دباؤ ڈالنے کے لئے بیرون قلعہ ان کے باغوں کو تباہ کردینے کی دھمکی دی [۱۸۲] مگر چونکہ رحمت اللعالمین اور نبی کا منشا وہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جو عام فاتحوں کا کہ حریف کو ہر طرح نقصان پہنچائیں اس لئے اہل طائف کی التجا پر باغوں کی مزید قطع و برید روک دی گئی۔

دوسری تدبیر یہ اختیار فرمائی کہ اعلان فرمایا کہ دشمن کے ملک کا جو غلام بھاگ کر آکر اسلام قبول کرلے، وہ آزاد سمجھا جائے گا۔ جو فقہ اسلامی میں داخل ہو چکا ہے۔ رنگ لائے بغیر نہ رہا [۱۸۳]۔

ایک اور انتظام یہ فرمایا گیا کہ محاصرے کے لئے منجنیق اور دبابوں وغیرہ کے بنانے اور چلانے کی تربیت حاصل کرنے کے لئے چند قابل کاریگروں کو جرش نامی مقام پر روانہ فرمایا [۱۸۴]۔ یہ طائف کے جنوب میں کچھ فاصلے پر تھا نہ کہ عرب کے شمال میں جیسا کہ شبلی مرحوم نے سیرت النبیؐ [۱۸۵] میں لکھا ہے۔ ''عرب کے شمال میں جو اس کا ہمنام شہر تھا اس سے سیرت النبی ﷺ کے کسی خاص اہم واقعہ کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ اس مقام (جرش) پر جو طائف ہی کی طرح ایک فصیل دار اور محفوظ شہر تھا۔ [۱۸۶] یہودیوں کی خاصی آبادی تھی جیسا کہ خود طائف میں بھی تھی [۱۸۷] اور غالباً ان آلات کی صنعت انہی یہودیوں میں تھی۔ جیسا کہ خیبر کے یہود میں بھی نظر آتی ہے۔ (مغازی الواقدی، ورق ۱۵۱)

ایک اور انتظام واقدی (ورق ۲۰۸ ب) کے مطابق فصیل کے اطراف کانٹے بکھیر دینا تھا۔ (ونثر رسول اللہ الحسک سعس حسک من عیدان حول حصنهم)

اہل طائف کو غالباً اس طرح محصور ہونے کا اس سے پہلے بارہا تجربہ ہوا ہوگا۔ وہ اس کی مدافعت کی تدبیروں سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتے تھے منجنیق سے انہیں کوئی خاص نقصان نہ پہنچا اور دبابے میں بیٹھ کر فصیل شکنی کو انہوں نے دہکتی ہوئی فولادی میخوں سے دبابوں پر منڈھے ہوئے چمڑے کو جلا کر اور عام لوگوں کو تیر اندازی کا نشانہ بنا کر قریب آنے سے کامیاب طور پر روکا [۱۸۸] شہر میں کھانے پینے کی کمی نہیں معلوم ہوتی تھی۔

غرض ان مختلف وجوہ سے آنحضرتؐ نے محاصرہ اٹھالیا اور واپس ہوگئے جعرانہ پہنچ کر ہوازن سے اوطاس میں لوٹے ہوئے مال غنیمت کی تقسیم کی [۱۸۹] اور کچھ دن بعد اہل ہوازن کے وفد کے آنے پر ان کے تمام بیوی بچوں کو واپس فرمادیا [۱۹۰] اور اس طرح طائف کو اس کے سب سے بڑے مددگار سے بچھڑادیا اور طائف کے چاروں طرف اسلامی اثرات جو کافی تھے روز بروز بڑھتے ہی چلے گئے اور محاصرے میں کامیاب مدافعت کے باوجود سال چھ ماہ کے اندر ہی انہوں نے اپنا وفد مدینہ بھیجا اور لات وعزیٰ کو توڑ کر خدائے واحد کے پرستار بن گئے [۱۹۱]۔

یہودیوں کی لڑائیاں:

پہلی لڑائی بنوقینقاع سے ہوئی یہ لوگ مدینے میں اسلامی آبادی کے اندر ہی رہتے تھے اور سنار کا کام کرتے تھے۔ اور آنحضرتؐ کے حکم پر جان بچی لاکھوں پائے کہتے ہوئے شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے [۱۹۲] اور اس اخراج کی نگرانی کے لئے آنحضرت ﷺ نے بقول طبری (ص ۱۳۶۱) ایک خاص افسر مقرر فرمایا تھا۔ نیز ان کے محلے کے محاصرے کے دوران میں اسلامی محلوں میں نائب بھی چھوڑا تھا۔ اس کے بعد بنوالنضیر سے جنگ احد کے بعد جھگڑا ہوگیا اور آنحضرتؐ نے ان کے محلے کا محاصرہ کرلیا۔

جیسا کہ اوپر دیکھا گیا ہوگا، مدینے کے محلوں کی صورت یہ تھی کہ چند مکان ہوتے تھے۔ جن میں حسب ضرورت و مقدرت گڑھیاں اور قصر ہوتے تھے اور یہ سب لاوے کے پتھر سے تعمیر ہوتے تھے۔ ان سے قریب ہی باغ اور نخلستان تھے جو ان کی بسر برد کا کافی بڑا ذریعہ تھے۔

بنو النضیر کا محلہ حرہ شرقیہ میں مسجد نبوی کے جنوب مشرق میں تھا اور ان کے اور بنو قریظہ کے محلے میں عوالی کے باغ حد فاصل تھے۔ ان لوگوں کی تعداد بظاہر دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مورخ لکھتے ہیں [۱۹۳] کہ ان کا محاصرہ کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے اپنا پڑاؤ ایسی جگہ ڈالا کہ انہیں بنو قریظہ سے مدد کی توقع نہ رہی، چنانچہ وہاں مسجد شمس جسے مسجد الفضیخ بھی کہتے ہیں اب تک اس کی یادگار ہے۔ دوسرے ایک تفصیل جس کا قرآن میں بھی اشارۃً ذکر ہے وہ یہ ہے کہ تیر اندازی وغیرہ جن کی ضرورتوں سے ان کے باغوں سے بعض کھجور کے درخت بھی کاٹنے پڑے تھے، جس سے مدینہ کی گڑھیوں کی حفاظت کے سامان کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

اس لڑائی کی اس سے زیادہ اور تفصیل معلوم نہیں سوائے اس کے کہ محاصرے سے تنگ آ کر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور سامان ساتھ لے کر مدینہ چھوڑ کر کہیں اور جا بسنے پر آمادہ ہوگئے۔ چند شام گئے اور اکثر خیبر چلے گئے [۱۹۴] بنو قینقاع کی بستی تو آج کل محض میدان ہے، البتہ بنو النضیر کی بستی میں کعب بن الاشرف کا قلعہ اب تک، کھنڈر ہی سہی، نظر آتا ہے اور زمانۂ جاہلیت کی عربی تعمیر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ بنو النضیر کی بستی کے جنوب میں حرۂ شرقی میں وادیٔ مذنیب کے قریب ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے۔ اس پر قصر کعب بن الاشرف کی دیوار یں تقریباً گز سوا گز اونچی اب تک کھڑی ہوئی ہیں۔ قصر کے اندر اندر ہی ایک کنواں ہے جو ظاہر ہے کہ محاصرے میں کام آتا ہوگا ٹیلے کے دامن میں اور قصر سے متصل ایک بڑے پختہ گچ اور پتھر سے بنے ہوئے حوض کے اب تک آثار باقی ہیں۔ جس میں پانی کو ایک حصے سے دوسرے میں

گزارنے کے لیے پکی مٹی کے نل بھی اب تک نظر آتے ہیں۔

بنو قریضہ کے محاصرے کے حربیاتی حالات ہمیں اس سے بھی کم معلوم ہیں سوائے اس کے کہ ان کے مالِ غنیمت سے شام اور نجد میں اسلحہ اور گھوڑے خریدے گئے (سیرۃ الشامی) خیبر کا تذکرہ بہت دلچسپ ہوسکتا لیکن باوجود کوشش کے مجھے خیبر جانے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لیے اس کا تذکرہ کسی آئندہ فرصت کے لیے اٹھا رکھنا پڑتا ہے۔ یہی حال موتہ اور تبوک کا ہے اور تمنا ہے کہ جلد ان پر بھی کچھ کام کیا جاسکے۔

یہودیوں کی جنگ کے سلسلے میں امام محمد الشیبانی[۱۹۵] اور غالباً انہیں کی بنیاد پر السرخسی[۱۹۶] نے (المبسوط میں) لکھا ہے کہ بنو قریظہ کی جنگ میں آنحضرت کو بنو قینقاع نے مدد دی۔ یہ بیان عجیب سا ہے کیونکہ بنو قینقاع بدر کی لڑائی کے بعد ہی مدینے سے نکال دیئے گئے تھے[۱۹۷] اگر یہ بیان جو الشیبانی وغیرہ نے لکھا ہے، صحیح ہے تو اس کے معنے غالباً یہی ہوں گے کہ بنو قینقاع کو جو سزا دی گئی وہ اس بڑے قبیلے کے صرف چند خاندانوں کی حد تک محدود ہوگی کیونکہ جس قصور پر وہ فیصلہ کیا گیا تھا اس کے ذمہ دار بھی چند ہی گھرانے تھے[۱۹۸]۔

سیرۃ الشامی جنگ خیبر کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہاں ایک قلعے کے زمین دوز راستے کا پتہ آنحضرت کو ایک یہودی نے ہی دیا[۱۹۹]۔ واقدی نے لکھا ہے کہ خیبر کے محصور قلعوں سے یہودی مسلمانوں پر منجنیق سے پتھر پھینکا کرتے تھے[۲۰۰] غالباً اسی مہم ہی کے مال غنیمت سے دوسرے سال طائف کے محاصرے میں آنحضرتؐ نے منجنیق اور دبابے وغیرہ استعمال کئے اور نئے بنانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

یہودیوں کے سلسلے میں ایک تیسرا واقعہ جنگی ضروریات کے لیے سرمائے کا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ سیرۃ الشامی میں غزوۂ سویق کے ذکر میں ضمناً بیان ہوا ہے۔

''سلام بن مشكم وكان سيد بنى النضير فى زمانه وصاحب كنزهم......
يعنى بالكنز هنا المال الذى كانوا يجمعونه لنوا ئبهم وما يرض لهم''.

''سلام بن مشکم اپنے زمانے میں بنو النضیر کا سردار اور ان کا محافظ خزانہ تھا۔ خزانے سے مراد یہاں وہ مال ہے جسے وہ مصائب اور اتفاقی ضرورتوں کے لیے جمع کرتے تھے''۔

اس قبیلہ داری سرمائے کا ذکر خیبر کے سلسلے میں بھی مکرر آتا ہے اور طبری نے ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ کنانہ بن الربیع بن اُبی الحقیق کے پاس مدینے کے جلاوطن نضیریوں کا خزانہ تھا۔ بعض اور روایتوں میں ہے جب اس سے آنحضرتؐ نے مال کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا کہ لڑائیوں میں خرچ ہو گیا۔ مگر بعد میں وہ مال ایک کھنڈر میں گرا ہوا مل گیا۔ اس کی چغلی بھی ایک یہودی نے کھائی تھی۔

(ابن ہشام، ص ۷۶۳)۔

حواشی:

[۱] مکے کے سیاسی نظام وغیرہ کے لیے دیکھئے میرا خصوصی مضمون ''شہری مملکت مکہ'' (معارف اعظم گڑھ، جنوری وفروری ۱۹۴۲ء)۔

[۲] المنتقی الابی نعیم فصل ۱۲۰۔

[۳] سیرۃ ابن ہشام، ص ۲۵۱۔

[۴] سیرۃ ابن ہشام، ص ۲۷۳۔

[۵] ابن سعد، ج ۱/۱، ص ۱۴۵، ابن ہشام، ص ۲۸۲ تا ۸۳، المنتقی الابی نعیم ورق ۱۰۵ تا ۱۰۷۔

[۶] ابن ہشام، ص ۱۷۸۔

[۷] ابن ہشام۔

[۸] عقبہ اصل میں پہاڑی راستے یا گھاٹی کو کہتے ہیں اور یہ مقام اصل میں عندالعقبہ (گھاٹی کے پاس) کو لاتا ہے گھاٹی سے مِنا کا راستہ مراد ہے۔

[۹] ابن ہشام، ص ۱۰۷۔

[۱۰] سیرۃ نامی احسنت العلوم فی بئر بنی عدی بن النجد (میں قبیلہ عدی بن النجار کے کنویں میں اچھا تیرنا سیکھ گیا)۔

[۱۱] ابن ہشام، ص ۲۹۴۔ [۱۲] ابن ہشام، ص ۲۸۶۔

[۱۳] طبری تاریخ، ص ۱۰۸۴ تا ۸۶۔ [۱۴] ابن ہشام، ص ۲۸۷۔

[۱۵] ابن ہشام، ص ۳۰۵ نیز مسند ابن حنبل، ج ۳، ص ۴۴۱۔

[۱۶] ابن ہشام، ص ۲۸۹۔ [۱۷] تفسیر طبری، ج ۹، ص ۱۶۳۔

[۱۸] ابن ہشام، ص ۲۹۷۔ [۱۹] ابن ہشام، ص ۳۲۳ و مابعد۔

[۲۰] سیرۃ الشامی از زبیر بکار۔ [۲۱] ابن ہشام، ص ۳۴۴۔

[۲۲] دیکھو کسی تفسیر میں آیت ماولوالارحام (ص ۸، ص ۷۵)۔

[۲۳] ابن ہشام، ص ۲۴۱ تا ۴۲، نیز مجلہ طیلسانین ۱۹۳۹ء دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت نیز کتاب الاموال (لابی عبید)۔

[۲۴] ابن ہشام، ص ۲۴۱ تا ۴۴ نیز مجلہ طیلسانین ۱۹۳۹ء دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت۔

[۲۵] Wellhausane cemeindeordning von Madina حوالہ بالا۔ جملہ دیگر حوالے مجلہ طیلسانین کے مذکورہ بالا مضمون میں ہیں۔ رسالہ برہان دہلی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۰ء میں بھی اس پر تفصیلی بحث آئی ہے۔

[۲۶] رسالہ اسلامک کلچر ۱۹۳۸ء معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۲ء۔

[۲۷] مرأۃ الحرمین، جلد اول برموقع۔

[۲۸] ابوعبید کی کتاب الاموال، ص ۵۰۶ میں معاہدے کا پورا متن ہے۔

[۲۹] صحیح بخاری برموقع۔

[۳۰] المطری (التعریف بماالسنت الہجرۃ من معالم دارالہجرۃ) برموقع نیز بخاری جہاد ۴۷ وفضائل المدنیۃ وغیرہ (بخاری میں غیر کی جگہ عاتر بھی لکھا ہے)۔

[۳۱] ابن ہشام ابن سعد وغیرہ میں یہ معاہدات ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھئے میری کتاب۔

مطبوعہ مصر ۱۹۴۰ء الوثائق السیاسیہ۔ [۳۲] ابن سعد، ج ۱، ق ۱، ص ۲ تا ۷۔

[۳۳] اس مقام پر چند سال ہوئے مسلمانان حیدر آباد کے چندے سے نواب نظامت جنگ نے چند کمرے تعمیر کرائے ہیں جو سرائے کا کام دیتے ہیں۔

[۳۴] شامی کے الفاظ ہیں ''تل مشرف علی المعرکۃ''۔

[۳۵] تاریخ طبری، ص ۱۳۰۰، ص ۱۴۶۰ [۳۶] ابن ہشام، ۴۳۹۔

[۳۷] کتاب المغازی مخطوطہ برٹش میوزیم ورق (۳۰ ب)۔

[۳۸] صحیح بخاری کتاب، ص ۶۴ باب ۸۴، حدیث ۳، نیز ابن ہشام، ص ۲۲۱ تا ۲۲ نیز ص ۴۳۹ بلشو، ص ۱۰، ص ۵۴۔

[۳۹] تاریخ طبری، ص ۱۶۰۳، سیرۃ ابن ہشام، ص ۱۶ تا ۱۷، مسند ابن حنبل، ج ۴، ص ۱۹۸۔

[۴۰] سیرۃ النبی، جلد اول، احوال جنگ بدر۔

[۴۱] گویا انہیں موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہو۔

[۴۲] جب اللہ تم سے دو میں سے ایک گروہ کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ پڑے گا اور تمہاری تمنا یہ تھی کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔

[۴۳] معازی واقدی (۸) [۴۴] طبری، ص ۱۲۸۶۔

[۴۵] طبری، ص ۱۳۰۲۔ [۴۶] ایضاً، نیز ص ۱۲۹۹ و ص ۱۳۰۳۔

[۴۷] دو بدری لڑکیوں کی گفتگو تاریخ آمد پر (طبری ص ۱۳۰۵)

[۴۸] طبری، ص ۱۲۹۹۔ [۴۹] مغازی الواقدی ورق (۸ ب)۔

[۵۰] سیرۃ شامی احوال جنگ بدر۔ [۵۱] ابن ہشام، ص ۴۳۷۔

[۵۲] ملاحظہ ہو الوثائق السیاسیہ، طبع مصر ۱۹۴۰ء، نیز ابن سعد وغیرہ۔

[۵۳] ابن ہشام، ص ۴۳۹۔ [۵۴] مغازی الواقدی۔ ورق ص ۱۵۔

[۵۵] طبری، ص ۱۲۹۸، ص ۱۳۰۴۔ [۵۶] ایضاً، نیز ابن ہشام، ص ۴۳۔

[۵۷] جامع الترمذی ابواب الجہاد۔ [۵۸] طبری، ص ۱۳۱۹۔

[۵۹] مغازی الواقدی ورق (۱۵ ب)۔

[۶۰] یہ ہدایتیں اکثر کتب حدیث میں ملتی ہیں مگر ان کا بدر میں دیا جانا واقدی کا بیان ہے نیز ابن ہشام، ص ۴۴۳۔

[۶۱] مغازی الواقدی، ورق (۶)۔ [۶۲] مغازی، ورق (۱۵ ب)۔

[۶۳] ابن ہشام، ص ۴۴۳۔ [۶۴] سیرۃ شامی غزوہ بدر۔

[۶۵] ابن ہشام، ص ۴۳۹ تا ص ۴۰۔ [۶۶] طبری، ۱۳۲۲۔

[۶۷] بخاری، ص ۵۷۔۵۶۔ [۶۸] ابن ہشام، ص ۵۰۶۔

[۶۹] ایضاً، ص ۵۰۷ و مابعد۔ [۷۰] ایضاً، ص ۵۱۳ و مابعد۔

[۷۱] ابن ہشام، ص ۴۵۹ تا ص ۶۰، ابن سعد ۲/۱ ص ۱۶، نیز بخاری ۵۶/۴۲

[۷۲] سیرۃ شامی غزوہ بدر نیز ابن ہشام، ص ۴۵۷۔

[۷۳] اصابہ ۱۸۳۳۶ از ابن سعد نیز کتانی، ج ۳، ص ۳۸۔

[۷۴] ابن ہشام ص ۴۶۲ وغیرہ

[۷۵] مسند ابن حنبل ۱/ ۲۴۶، ابن سعد ۲/ ۱، ص ۱۴

[۷۶] طبری ص ۱۳۵۴ نیز ابن ہشام ص ۴۷۱

[۷۷] مثلاً طبری ص ۱۲۸۸، ''فلما ورد رسول الله صلی الله علیه بدر اقال هذه مصارعهم نیز ابن ہشام ص ۴۳۵ وغیرہ

[۷۸] صحیح مسلم ج ۶، ص ۲ [۷۹] دیکھئے تفسیر طبری برموقع

[۸۰] سیرۃ شامی احوال احد [۸۱] برموقع ابن ہشام ص ۵۵۵، و مابعد

[۸۲] ابن ہشام ص ۵۶۱

[۸۳] سیرۃ شامی ''وکتب العباس الی رسول اللہ بذالک مع رجل من غفار''

[۸۴] جیسا کہ متعدد مورخوں نے لکھا ہے [۸۵] ایضاً

[۸۶] آغانی ج ۱۳ ص ۱۲۴

[۸۷] احادیث فضائل حضرت عثمان میں بئر رومہ کی خریداری کا ذکر کسی بھی کتاب حدیث میں؟

[۸۸] مغازی الواقدی ورق (۴۹ ب) [۸۹] ابن ہشام ص ۵۵۸

[۹۰] سیزو شامی بر موقع [۹۱] ایضاً

[۹۲] نزل بالشیخین وھماطمان

[۹۳] ایضاً (استعمل علی الحرس تلک اللیلہ محمد بن مسلمہ فی خمسین رجل یطوفون بالعسکر [۹۴] ایضاً [۹۵] ابن ہشام ص ۵۶۰

[۹۶] ابن ہشام ص ۵۶۰ [۹۷] کتانی ۱/۳۲۵ نیز استیعاب ص ۹۰۲

[۹۸] ابن ہشام ص ۵۶۱ [۹۹] ابن ہشام ص ۵۶۹

[۱۰۰] ایضاً ۵۷۰ [۱۰۱] ابن ہشام ص ۵۷۰

[۱۰۲] موقع پا کر ایک منافق نے ایک مسلمان کو عمداً قتل کر ڈالا تو پتہ چلنے پر بعد میں آنحضرت نے قصاص کا حکم فرمایا (دیکھئے کتاب المحبر ابن حبیب ص ۴۶۷ و ابن ہشام ص ۵۷۹ لیکن ایک اور صحابی کو بھی بعض دیگر رفیقوں نے دشمن سمجھ کر قتل کر ڈالا تو مقتول کے بیٹے حذیفہ بن الیمان نے خون بہا معاف کر دیا (ابن ہشام ص ۶۰۷) حذیفہ کے والد ''یمان'' (یعنی یمن والے) کا نام حسیل بن جابر تھا۔

[۱۰۳] ابن ہشام ص ۵۵۵ و مابعد [۱۰۴] ابن ہشام ص ۵۷۱

[۱۰۵] ایضاً ص ۵۷۲ [۱۰۶] ایضاً ص ۵۷۲، ۵۷۶

[۱۰۷] ابن ہشام ص ۵۷۶ [۱۰۸] ابن ہشام ص ۵۸۳

[۱۰۹] ایضاً ص ۵۸۸ [۱۱۰] بیئر معونہ وذات الرقاع وغیرہ نجد ہی میں ہیں

[۱۱۱] ابن ہشام ص ۱۹۱ تا ۹۲ [۱۱۲] ابن ہشام ص ۵۴۷ طبری ص ۱۳۷۴

[۱۱۳] التنبیہ والاشراف للمسعودی ص ۲۴۸ [۱۱۴] ابن ہشام ص ۶۸۱

[۱۱۵] البدایہ لابن کثیر ج ۴ ص ۶ [۱۱۶] ایضاً

[۱۱۷] طبری ۴۶۵ [۱۱۸] حوالے و متن میری ''الوثائق السیاستہ'' میں

[۱۱۹] ابن ہشام ص ۵۵۸ وغیرہ [۱۲۰] مغازی الواقدی ور (۲-اب)

[۱۲۱] سمہودری دربیان خندق [۱۲۲] مغازی الواقدی ورق ۱۰۳ب

[۱۲۳] کتاب التعریف بما انست الھجرۃ من معالم دار الھجرۃ برموقع

[۱۲۴] مغازی ورق-۱۰۳ب)

[۱۲۵] ایضاً (ذکران الخندق لابواب فلستا زری این موضعہا

[۱۲۶] سمہودی تحت کلمہ (ذباب) طبری ص ۱۴۶۸)

[۱۲۷] مثلاً بیئر رومہ اور باغ قویم بری قریب قبا

[۱۲۸] التراتیب الاداریہ ج ۱ ص ۲۹۸

[۱۲۹] کتانی ا ص ۲۹۸ طبری ص ۱۴۶۷ وغیرہ

[۱۳۰ طبری ص ۱۴۷۶ مسند ابن حنبل ۱/ ۲۷۱

[۱۳۱] عام لوگ دن بھر تو خندق کی کھدائی کرتے مگر رات اہل وعیال میں گزارتے (ابن ہشام ص ۶۷۲)

[۱۳۲] طبری ص ۱۴۶۵، ص ۱۴۶۷ [۱۳۳] مغازی ورق ۱۰۳ب

[۱۳۴] مگر طبری ص ۱۴۶۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار وغیرہ لوگوں ہی پر یہ جماعت مشتمل تھی

[۱۳۵] مغازی الواقدی ورق ۱۰۳ب [۱۳۶] سیرۃ شامی برموقع

[۱۳۷] برموقع [۱۳۸] مغازی واقدی ورق ۱۰۲ب

[۱۳۹] دستور مدینہ ۴۴ [۱۴۰] ابن ہشام ص ۶۷۱

[۱۴۱] مغازی ورق ۱۰۳ [۱۴۲] طبری ص ۱۴۶۷ نیز ابن ہشام ص ۶۷۳

[۱۴۳] طبری ص ۱۴۷۵ (لکھا ہے کہ بی بی عائشہ اطم بنی حارثہ میں رہیں وطبری ۱۴۷۶

[۱۴۴] سمہودی وغیرہ [۱۴۵] طبری ابن ہشام وغیرہ

[۱۴۶] مغازی الواقدی ورق (۱۰۵) والمسلمون علی خندقھم تینا وبوند مھم بضعۃ وثلاثون فرسا الفرسان یطوفون الخندق مافین طربیہ

[۱۴۷] طبری ص ۱۴۷۵ تا ۷۶

[۱۴۸] الذخیرة البرهانیه برهان الدین المرغینانی (مخطوطہ یکشی جامع استانبول) باب ۲۳ فی المسلم یقتل اصحابه فیما یقاتل "اس کے برخلاف جنگ احد میں حارث بن سوید منافق نے المجدر بن ذیادؓ کو عمداً قتل کردیا تھا اور پتہ چلنے پر جناب رسالت مآب نے قصاص کا حکم صادر فرمایا (کتاب المجر لابن حبیب ص ۴۶۷

[۱۴۹] طبری ۵ھ نیز ابن ہشام ص ۶۸۳ وغیرہ

[۱۵۰] مغازی الواقدی ورق ۱۰۵

[۱۵۱] ابن ہشام ص ۶۷۶ طبری ص ۱۴۷۶

[۱۵۲] شامی کے مطابق حیی بن اخطب نے بیس اونٹ جو اور کھجور اور بھونسے سے لاد کر بھیجے تھے جو مسلمانوں کی ایک طلایہ گرد ٹولی کے ہاتھ پڑ گئے۔

[۱۵۳] اصابہ میں واقعہ مسعود التمام ص ۳۰۷۴

[۱۵۴] میری رائے میں محاصرے کی برخاستگی کی بڑی اور اصل وجہ یہی ہوگی ورنہ محض طوفان ابوسفیان جیسے مستقل مزاج شخص کو اپنی دھن سے پلٹنے میں شاید کامیاب نہ ہوتا۔

[۱۵۵] ابن ہشام ص ۶۸۳ تا ۸۴ طبری ص ۱۴۸۴ ابن سعد ج ۲/۱ ص ۵۰

[۱۵۶] دیکھیے الوثائق السیاسیة

[۱۵۷] ابن ہشام ص ۵۴۷

[۱۵۸] طبری ۳ھ غزوة القردة ص ۱۳۷۵

[۱۵۹] ابن ہشام ص ۹۹۷ نیز استیعاب ص ۲۷۸

[۱۶۰] مبسوط سرخسی x/۹۱-۹۲

[۱۶۱] ابن ہشام ص ۸۱۱ تا ۱۵

[۱۶۲] صلح نامہ حدیبیہ کا متن سیرة ابن ہشام، الوثائق السیاسة وغیرہ میں ہے۔

[۱۶۳] ابن ہشام ص ۸۰۵

[۱۶۴] ابن ہشام ص ۸۱۰-۸۲۸

[۱۶۵] کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۵۱ (ص ۲۵۳ طبع جدید)

[۱۶۶] طبری ۸ھ ص ۱۶۳۰ وغیرہ

[۱۶۷] ابن ہشام ص ۸۱۴

[۱۶۸] ابن ہشام ص ۸۱۵ مبسوط السرخسی ۲۹ ج لابی یوسف ص ۱۳۱ التنبیه للمسعودی ص ۲۶۷

[۱۶۹] ابن ہشام ص ۸۱۷ [۱۷۰] ایضاً ص ۸۱۶

[۱۷۱] ابن ہشام ص ۸۱۶ [۱۷۲] طبری ص ۱۶۳۵

[۱۷۳] بعض روایتوں (مثلاً ابن ہشام ص ۸۱۲) میں قبیلہ خزاعہ کے پڑاؤ کی آگ کو بھی اس کے سامنے حقیر ٹھہرایا گیا ہے۔ [۱۷۴] طبری ۸ھ ص ۱۶۴۲

[۱۷۵] رہبر دکن یوم فتح مکہ نمبر رمضان ۱۳۵۸ھ نیز دیکھو تاریخ طبری ص ۵۳۲ تا ۳۳

[۱۷۶] ابن ہشام ص ۸۱۵ [۱۷۷] ابن ہشام ص ۸۱۶

[۱۷۸] ابن ہشام ص ۸۴۰ و مابعد [۱۷۹] ابن ہشام ص ۸۷۲

[۱۸۰] کتاب الاغانی ج ۱۲ ص ۴۸ تا ۴۹ [۱۸۱] ابن ہشام ص ۸۷۲ یا طبری ۱۹۷۲

[۱۸۲] ابن ہشام ص ۸۷۳ [۱۸۳] ابن ہشام ص ۸۷۴

[۱۸۴] ابن ہشام ص ۸۶۹ ابن سعد ج ۱/۲ ص ۵۲

[۱۸۵] سیرت النبی (طبع دوم) جلد ۳، ص ۷۷

[۱۸۶] ابن ہشام ص ۹۵۴ [۱۸۷] فتوح البلدان للبلاذری ص ۱۵۶

[۱۸۸] ابن ہشام ص ۸۷۳ [۱۸۹] ابن ہشام ص ۸۷۶ و مابعد

[۱۹۰] ابن ہشام ص ۸۷۷ و ماو بعد [۱۹۱] ابن ہشام ص ۹۱۴ و مابعد

[۱۹۲] ابن ہشام ۵۴۶ [۱۹۳] سیرۃ شامی برموقع

[۱۹۴] ابن ہشام ص ۶۵۳ طبری ص ۱۴۵۲ کے مطابق وہ گاتے بجاتے دھوم دھام سے نکلے۔

[۱۹۵] کتاب الاصل باب السیر مخطوطات استانبول

[۱۹۶] المبسوط ج ۱۰ ص ۲۳ [۱۹۷] ابن ہشام ص ۵۶۴

[۱۹۸] ابن ہشام ص ۵۴۵ [۱۹۹] حصن الزبیر کے حالات سیرۃ شامی میں

[۲۰۰] مغازی واقدی ورق ۱۵۱

تالیف قلبی

(عہد نبوی کی سیاست خارجہ کا ایک اہم اصول)

پہلی اسلامی مملکت عہد نبویؐ میں قایم ہوئی۔اس کی خارجہ سیاست کے بہت سے اصول تھے ان پر الگ الگ بحث کئے بغیر نہ ان کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ان کا صحیح مفہوم۔ یہاں صرف ایک چیز پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ غیر ممالک کے باشندوں کا دل موہ لینا ہے۔

سوال کرنے والا پوچھ سکتا ہے کہ اس کا کیا ثبوت کہ مملکت اسلامیہ کی خارجہ سیاست میں یہ اصول عہد نبوی میں ملحوظ رہا؟ مگر نظری احکام اور عملی نظائر کی روشنی میں اس استنباط کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

اولاً قرآن مجید میں سرکاری موازنے کے لئے خرچ کے جو مدات مقرر کئے گئے ہیں، ان میں عام محتاجوں، مسکینوں وغیرہ کے ساتھ ایک اہم مد ''المولفتہ قلوبھم'' کی دی گئی ہے کہ دلوں کے موہ لینے کے لئے خرچ کیا جانا چاہیئے۔

جو چیز قرآن مجید میں موجود ہو اور جناب رسالت مآب کا زندگی بھر اس پر عمل رہا ہو اور اس کی منسوخی کا اشارہ، کنایتہً تک کسی حدیث نبوی میں ذکر نہ ہو تو محض بعض متاخر فقہاء کا بیان کہ یہ منسوخ شدہ حکم ہے، کسی راسخ العقیدہ مقلد کے لئے قابل قبول نہیں رہتا۔ ان فقہاء کو حضرت عمر فاروق کے شاید ایک جملے سے دھوکا ہوا، سیاق و سباق سے بچھڑا ہوا بیان ایک خالص سیاسی معاملے کے متعلق بعض غیر سیاست داں

(مگر نیک طینت و نیک نیت) فقہاء کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو اس سے رسول اللہ کے جاری و باقی رکھے ہوئے حکم قرآنی کو منسوخ کرنے کی ذمہ داری لینی کم از کم مجھے تو پسند نہیں۔ اصل میں حضرت عمر کی طرف یہ بیان منسوب ہے کہ اب خدا نے اسلام کو عزت دی ہے اس لئے کسی کو اسلام لانے کی ترغیب دینے کے لئے رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ روایت صحیح بھی ہے تو کیا اذا فات الشرط فات المشروط کی بنا پر یہ ناگزیر نہیں کہ دیگر زمانوں میں اور دیگر ممالک کی حد تک جہاں شوکت فاروقی کارفرمانہ ہو، یہ حکم پھر بحال ہو جائے؟ یوں بھی دل موہ لینے یا تالیف قلبی کی صرف یہی ایک شکل نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کی ترغیب دینے کے لئے کسی کو انعام و اکرام دیا جائے۔

پانچویں صدی ہجری کے وسط میں وفات پانے والے مشہور حنبلی امام ابویعلیٰ نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ (ص۱۱۶ میں، جو حال میں چھپی ہے) آیت ''المولفتہ قلوبھم'' کی بڑی گہری اور دوررس تشریح کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

واما المولفتہ قلوبھم وھم اربعتہ اصناف	رہے مولفتہ القلوب، سو ان کی چار قسمیں ہیں:۔
۱. صنف تتالف قلوبھم لمعونتہ المسلمین:	ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے دل مسلمانوں کو مدد دینے کے لئے موہ لئے جائیں:۔
۲. وصنف تتالف للکف عن المسلمین:	ایک قسم ان کی ہے جن کی تالیف قلبی اس لئے کرنی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز رہیں۔
۳. وصنف تتالف لیرغبھم فی الاسلام:	ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام قبول کرنے کے لئے ترغیب دی جاتی ہو:۔

۴. وصنف یتالفھم ترغیبا لقومھم وعشائرھم فی الاسلام: اور ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کی تالیف قلبی سے ان کی قوم اور خاندان والوں کو اسلام لانے کی ترغیب ہوتی ہو:۔

فیجوزان یعطی کل واحد من ھذا الاصناف من سھم المولفتہ مسلما کان اومشرکا: چنانچہ یہ چیز جائز ہے کہ ان اقسام میں سے ہر ایک کو مولفتہ القلوب کی مد سے حصہ دیا جائے چاہے وہ مسلمان ہو یا مشرک:۔

ابن رشد نے اپنی مستند تالیف بدایتہ المجتھد (کی کتاب الزکاۃ جملہ خامسہ، فصل اول، مسئلہ دوم) میں بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی بھی اسی کے قائل تھے کہ یہ قرآنی حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ اب تک باقی ہے، اور امام وقت اس سے مصالح اسلامی کا کام لے سکتا ہے۔[۶]

اہل سنت کے تین بڑے مذاہب کے مستند نمائندوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد یہ عقلی دلیل اضافہ کی جاسکتی ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں متمدن سلطنتوں کو اس کی ضرورت رہتی ہے کہ:۔

۱۔ دشمن کو دوست اور مددگار بنانے کے لئے۔

۲۔ یا کم از کم غیر جانبدار ہو جانے کے لئے۔

۳۔ اور دوستوں کو انعام دے کر مزید اور عظیم تر کارگزاریوں پر آمادہ کرنے کے لئے۔

۴۔ نیز دیگر دوستوں کو ترغیب وتشویق دلانے کے لئے۔

۵۔ یا ڈھلمل لوگوں کو تائید میں مستحکم کرنے کے لئے۔

۶۔ یا مماثل مصالح کے لئے۔

اس کی ضرورت رہتی آئی ہے کہ "سیکرٹ سروس" سے کام لیں اس اجمال کی بیسیوں تفصیلیں ہوسکتی ہیں:۔

اب ہم سیرۃ النبی، کے حصہ نظائر پر نظر ڈالیں گے۔

ابھی مکہ فتح نہیں ہوا تھا کہ ایک مرتبہ وہاں سخت قحط پڑا۔ آنحضرت نے بروایت فقیہ کبیر، سرخسی (مبسوط ۱۰:۹۱،۹۲ وغیرہ) ابوسفیان کے پاس پانچ سو اشرفیوں کی خطیر رقم بھیجی کہ مکے کے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرے، ابوسفیان نے بے بسی کے عالم میں جھنجھلا کر کہا کہ۔ محمد چاہتا ہے کہ اب مکے کے غرباء اور نوجوانوں کو ورغلا کر ہمارے خلاف کھڑا کردے۔

ابھی صلح حدیبیہ نہیں ہوئی ہے اور مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث قریش کی تجارت بند ہوکر روزگار پر آفت لاچکی ہے۔ ابوسفیان کا روزگار بھی تجارت ہی سے تھا۔ آنحضرت اسے مدینے کی اچھی کھجوروں کی ایک بڑی مقدار بھیجتے ہیں اور معاوضے میں طائف کا چمڑا طلب کرتے ہیں۔

ابوسفیان کی لڑکی بی بی ام حبیبہ سے آنحضرت نکاح فرما لیتے ہیں۔ کیا ان تمام خاموش دل دہیوں کا[ا] مجموعی اثر بالآخر کچھ بھی نہ ہوا ہوگا؟

مکے میں مذکورہ بالا قحط کا زمانہ ہے۔ وہاں غلے کی درآمد مشرقی عرب خاص کر یمامہ سے ہوا کرتی تھی، یمامہ کے ایک سردار ثمامہ بن اثال نے اسلام قبول کرلیا اور آنحضرت کی اجازت سے یہ حکم دیا کہ اس کے علاقے سے اب غلہ مکے کو برآمد نہ کیا جائے۔ مکے والے پیٹ سے مجبور ہوگئے اور جناب رسالت مآب کو اپنی رشتہ داری اور صلہ رحمی کا واسطہ دے کر خط لکھا کہ یمامہ سے غلے کی مکے کو برآمد کی ممانعت منسوخ کردی جائے۔ آنحضرت نے ایسا ہی کیا۔ کیا یہ سب ہی اہل مکہ پر بے اثر رہا ہوگا؟

یہ غیر مسلموں کو اسلام کے حق میں متاثر کرنا تھا۔ اس کے علاوہ نومسلموں کو بھی بڑے بڑے انعام واکرم دئے جاتے، ان کے، اعزاز ملحوظ رکھے جاتے، اور ہر

طرح ان کو محسوس کرایا جاتا کہ صرف روحانی اور اخروی ہی نہیں، دنیوی اور مادی حیثیت سے بھی ان کا جدید مذہب ان کے لئے سراسر مفید ہے۔ علاوہ اور مواقع کے فتح مکہ کے بعد ابوسفیان وغیرہ نومسلموں کو سینکڑوں اونٹ فی کس بطور انعام دیئے گئے۔ بخاری شریف میں ہے:۔

خیار کم فی الجاھلیته خیار کم فی الاسلام اذا فقھوا	جو زمانہ جاہلیت میں معزز تھے وہ اسلام میں بھی ویسے ہی معزز رہیں گے جب وہ اپنے دین سے واقفیت (میں کمال) پیدا کرلیں۔

حاتم طائی کا بیٹا مدینہ آیا تو آنحضرت نے اس کے لئے مسند بچھائی .ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی۔

سفیروں کو انعام و اکرام دینے میں جناب رسالت مآب کو یہاں تک اہتمام تھا کہ مرض الموت کی وصیتوں میں سے ایک اسی کے متعلق تھی کہ آپ کا طرز عمل مسلمان آئندہ بھی جاری رکھیں۔

یہ ظاہر ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جاسکتے ہیں۔ کبھی انعام فوراً دے دیا جاسکتا تو کبھی وعدے ہی پر اکتفا کرنی ہوتی۔ مثلاً ابوثعلبہ خشنی نے آنحضرت سے درخواست کی کہ اگر رومی (بیزنطینی) علاقہ فتح ہو تو مجھے فلاں علاقہ جاگیر میں دیا جائے۔ آنحضرت نے اُسے منظور فرمایا۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۶۷۹) اسی طرح ایک شیبانی شخص نے آکر اسلام قبول کیا اور کہا۔ یارسول اللہ! اگر شہر حیرہ فتح ہوتو مجھے وہاں کے امیر بقُیلہ کی بیٹی مال غنیمت سے بطور انعام عطا فرمایئے۔ آنحضرت کے وعدے کی خلافت راشدہ میں حضرت خالد بن الولید نے تعمیل کی عزت حاصل کی (ایضاً ۴۸۷) ایسا ہی ایک معاملہ تمیم داری کا ہے۔ کہتے ہیں ہجرت نبوی سے بھی قبل یہ آ مسلمان ہوئے اور وعدہ لیا کہ اگر فلسطین فتح ہوتو حبرون، عینون اور بیت ابراہیم نامی گاؤں ان کو جاگیر میں دئے جائیں بہ ترک تفصیل، مختصر یہ کہ اس کی تعمیل کا موقع

خلافت فاروقی میں مل سکا۔ (الوثائق السیاسیہ، دستاویزاتِ متعلقہ نیز مقریزی کی الضؤ الساری لمعرفۃ خبر تمیم الداری، مخطوطہء پاریس ولائدن).

تالیف قلبی کے ایک اور پہلو سے بحث کر کے آج کی صحبت ختم کی جاتی ہے شہر طائف کا دفد مدینہ آتا ہے، اور مسلمان ہونے پر آمادہ ہے، شرط یہ پیش کرتا ہے کہ انھیں نماز سے مستثنیٰ کیا جائے، ان کے لئے زنا حرام نہ رہے، ان کے شہر کو بھی مکے کی طرح ایک حرم قرار دیا جائے جہاں کے درخت کاٹنا اور جانوروں کا شکار کرنا ممنوع ہو، آنحضرت نے جو عام جبری فوجی خدمت نافذ فرمائی تھی اور جہاد کو فرض قرار دیا تھا، اس سے ان کو مستثنیٰ کیا جائے، اور زکاۃ سے بھی وہ بری رہیں۔ آنحضرت نے نماز اور زنا کی شرطوں کو رد فرمادیا اور آخری دو شرطیں منظور کرلیں اور یہ رعایت بھی کہ طائف کا بت خانہ توڑنے کے لئے اہل طائف کو مجبور نہ کیا جائے بلکہ مدینے سے سرکاری افسر جاکر اسے منہدم کرائیں۔

اور جب وفد چلا گیا تو حیرت زدہ صحابہ سے آنحضرت نے فرمایا کہ جہاد اور زکاۃ کی فرضیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ یہ رعایت ان کو دی گئی ہے لیکن جب اسلام ان کے دل میں گھر کرلے گا تو وہ خود بخود جہاد بھی کریں گے اور زکات بھی دیں گے اور ہوا بھی بعد کو یہی۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ تالیف قلبی کس حد تک کی جاسکتی ہے اور کن باتوں میں اسے مادی فائدوں کے باوجود روا نہیں رکھا جاسکتا۔

غرض ''والمولفتہ قلوبھم'' اور ''الانفال للہ والرسول'' کے ذریعے سے قرآن مجید نے عملی سیاسیات کی جو نہایت اہم اور دورس تعلیم دی اور حکمراں کو صوابدید کا جو وسیع حق دیا، اس کی عہد نبوی کی نظیروں سے کافی تشریح اور توضیح ہوتی ہے۔ زندہ قوموں میں اجتماعی مفاد کے لئے تالیف قلبی کے لئے خصوصی وزارت قائم ہوتی ہے تو مردہ قوموں میں رشتہ داری اور انفرادی مفاد کے لئے مملکت کا نقصان

روا رکھا جاتا ہے۔ ایک جیتتا اور نفع حاصل کرتا ہے اور دوسرا کھوتا اور نقصان اٹھاتا ہے۔ وما توفیقنا الا باللہ۔

(رسالہ نظامیہ، حیدرآباد دکن، ربیع الانور ۱۳۵۷ھ)

حواشی:

[۱] یہ لکھ کر عرصہ ہوا۔ اب اس کی طباعت ثانی کے وقت ایک بڑے پرانے مولف کے ہاں اس کی تائید نظر سے گزری۔ محمد بن حبیب کی کتاب المحبر ۸۸ تا ۸۹ میں بی بی ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے متعلق لکھا ہے:۔

''چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ الضمری کو حبشہ بھیجا اور انھوں نے بی بی ام حبیبہ کا (وہاں) رسول اللہ سے نکاح کر دیا یہ فتح مکہ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی کہ (عسی اللہ ان یجعل بینکم بین الذین عادیتم منھم مودۃ) ممکن ہے کہ (اس سے) خدا تم میں اور تمہارے ساتھ عداوت رکھنے والوں میں دوستی پیدا کر دے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بی بی ام حبیبہ بنت ابی سفیان سے نکاح کرنا ہی دوستی تھا اور اسی باعث ابوسفیان رسول اللہ صلعم کے متعلق نرم پڑ گیا اور یہی دوستی تھی (جس کا آیت میں اشارہ ہے)

عہد نبوی کے عربی ایرانی تعلقات

قبل اسلام:

جزیرہ نمائے عرب زیادہ تر صحرا ہے، اس لیے وہاں کی آبادی اپنی غذا تک کے لیے قدیم سے بیرونی درآمد کی محتاج رہی ہے، تعداد ازدواج سے آبادی میں تیز اضافہ اور ذرائع معیشت میں خانہ جنگیوں وغیرہ کے باعث روز افزوں انحطاط عربوں کو اکثر ترک وطن پر قدیم سے مجبور کرتا رہا ہے، ایک طرف وہ خطرناک بحری راستہ سے مشرقی افریقہ جاتے رہے، تو دوسری طرف شمال مشرق میں عراق کی طرف اور شمال مغرب میں فلسطین کی طرف بھی خشکی کے راستہ ہمیشہ [ا] ان کا رخ رہا، بعد میں ملاحی مہارت بڑھنے پر وہ ہند اور چین تک تجارت کے لیے آنے جانے لگے۔

جہاں تک ایران کا تعلق ہے، اس کو سب سے پہلے معلوم ہوتا ہے، کہ قبیلہ طے ہی سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اب یہ مسلمات سے سمجھا جاتا ہے کہ فارسی لفظ تازی، اور اسی کا بگڑا ہوا چینی لفظ تاشی [۲] (جن سے عرب مراد ہوتے ہیں) اسی لفظ ''طی'' کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

ان تارکان وطن کی تعداد ایرانی صوبہ، عراق میں اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ انھوں نے عہد نبوی سے صدیوں قبل حیرہ (کوفہ) میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی تھی اور لخمی قبیلہ کے ان عرب حکمرانوں پر ماحول کا کچھ اتنا اثر پڑا کہ شام کی طرف جانے

والے غسانیون کے برخلاف انھوں نے خانہ بدوشی تک ترک کردی اور بستیوں میں بس کر عربی تہذیب کی عظیم الشان خدمت انجام دینے لگے۔

ایرانی شہنشاہوں نے مختلف مصلحتوں سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، چنانچہ ایک طرف تو عرب اور ایران (عراق) کے مابین حد فاصل اور حاجز مملکت (buffer-state) بنے اور خانہ بدوش بدویوں کی عراق میں لوٹ مار کی مہمین خود یہ لوگ جھیلنے لگے [۳] اور ایرانی امن میں ہو گئے، دوسری طرف ایرانی جو روز افزوں آرام طلب ہوتے جارہے تھے، مفت کے عرب رضا کاروں سے اپنی فوج میں کثیر تعداد میں کام لینے لگے، اس سے عربوں میں جنگجوئی اور فوج آرائی کی روح نہ صرف تازہ رہی بلکہ صیقل پاتی اور فطرت میں رچتی گئی، تو ساتھ ہی ایرانی روز بروز جنگ سے ڈرنے لگے اور بزدل ہوتے گئے، ایرانی بیزنطینی جنگوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان عربی فوجوں نے جو فیصلہ کن اور عظیم حصہ لیا اور ایرانی حکومت کے لیے صرف اپنے بل بوتے پر جو وسیع فتوحات حاصل کیں ان سے ہر کوئی واقف ہے، ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں، یہ امر البتہ نمایاں کیے جانے کے قابل ہے کہ بیزنطینی قیصروں نے ضجمیون اور پھر غسانیوں سے جنگی حلیفی کر لی اور ایرانی کسراؤں کے لیے بھی ناگزیر تھا، کہ اسی کے مماثل طاقتور عربوں کو اپنا حلیف بنائے رکھیں۔

عرب کے جانوروں تک کی وفا داری ضرب المثل ہے، پھر حیرہ کے حکمرانوں پر کسرایان ایران کا اعتماد کیوں نہ بے پایاں ہوتا، کسی اور ملک میں یہ نظیر نہ ملے گی جیسی یہاں ملتی ہے کہ کسرائے ایران اپنے ولی عہد کو اپنے جونیر حلیف بلکہ ماتحت حکمران حیرہ کے ہاں بھیج دے تاکہ وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہو، بعد میں بدوی روایات کے حامل اس شہزادے نے حکمراں بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ حیرہ کا عربی ماحول مدائن کے ایرانی ماحول سے کہیں زیادہ مفید و کردار ساز تھا۔

حیرہ والوں کی خدمات خود عرب کے لیے کچھ کم اہم نہ تھیں، عربی شعرا اور

تاجر ہمیشہ ان کے دربار میں بھرے رہتے تھے اور غیر محسوس طور پر یہ تاثر و تاثیر کرتے چلے جاتے تھے اور غالباً صحرانشینوں سے اس مسلسل تعلق ہی نے باوجود عیش و ترفہ کے نخمی حکمرانوں میں بہت سی اچھی بدوی صفتیں مثلاً بات کا پاس اور آن کے لیے جان تک کی پرواہ نہ کرنا، بہت کچھ برقرار رکھیں۔

عربی رضا کاروں کی وفاداری اور اطاعت شعاری نے رفتہ رفتہ دربار مدائن کو یہ بھلا دیا کہ حیرہ کمزور اور جونیر حلیف سہی، لیکن ماتحت اور غلام نہ تھا، مجوسی ومزد کی روایات نے عصمت و ناموس کا تصور ہی ایرانی دربار سے مٹا دیا تھا [۴] اسی لیے انھوں نے اس میں کوئی برائی ہی نہیں سمجھی کہ انہی اصول کا اطلاق عرب حکمران کی بہو بیٹیوں پر کیا جائے، اس کے نتیجہ سے سب واقف ہیں کہ حکمران حیرہ کو مدائن طلب کیا گیا اور اس وفا شعار نے جانتے بوجھتے اس کی تعمیل کی، تو تحفظ عصمت کے جرم میں اس کا سر قلم کیا گیا اور نشہ غرور میں چور شہنشاہ نے حاجز مملکت کو بھی فنا کر دینے کا حکم دیا، چنانچہ حیرہ میں ایرانی افسر آ دھمکے اور گو برائے نام ایاس بن قبیصہ نامی ایک عرب کو بھی وہاں کے عربوں کا سردار بنا دیا گیا، لیکن سلطنت حیرہ کا ایران سے الحاق کر کے ایک معمولی صوبہ بنا دیا گیا، یہ قصہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ حکمران حیرہ نے اپنے پاس کا بعض امانتی مال اصل مالکوں کو پہنچانے کے لیے بعض بدوی قبائل کے سرداروں کے سپرد کیا تو شہنشاہی احکام اس کی فوری حوالگی کے لیے پہنچے اور انکار پر سزا دی اور عربوں کی بالکلیہ تباہی کے لیے ایک عظیم الشان ایرانی لشکر روانہ کیا گیا، مگر اب کی دفعہ قدرت نے ایران کو ایک تنبیہ کرنی چاہی اور ذی قار کی جھیل پر ان کی فوج کو جان پر کھیلے ہوئے بدوؤں نے کاٹ کر رکھ دیا۔ مگر دربار ایران نے بجائے سبق لینے اور اپنی اصلاح کرنے کے عربوں پر مزید ستم آرائی شروع کر دی اور انھیں روز افزوں اپنا دشمن بنانا شروع کیا (اب جناب رسالت مآب کا مدنی دور زندگی شروع ہو چکا تھا) اور خلافت صدیقی کے آغاز پر اسی ایرانی سرحد کے ستم رسیدہ مثنیٰ شیبانی کا ایران پر حملہ کے

لیے اپنے رضا کارانہ خدمات کا پیش کرنا زیادہ تر ایران کی اسی عرب کش سیاست کا ردعمل تھا، اس واقعہ سے چند ہی سال قبل یمنیون کی دعوت اور تعاون سے ایرانیوں نے حبشیوں کو نکال کر یمن کر قبضہ کر لیا تھا اور دہرز کی فوجی گورنری کے بعد لائق باذان وہاں گورنر بنا، لیکن پائے تخت ایران میں کچھ ایسی تیزی سے شاہ گردی ہو رہی تھی کہ مٹھی بھر ایرانی فوج کے لیے کسی مزید کمک کی غیر موجودگی میں یمن پر قبضہ رکھنا بڑا دشوار ہو گیا تھا۔

حیرہ اور یمن کے علاوہ مشرقی اور جنوب مشرقی عرب کے ساحلی علاقوں یعنی عمان اور الحساء میں بھی (جسے اس زمانے میں بحرین کہا جاتا تھا) ایرانی اثرات مستحکم ہو گئے تھے، عمان میں جلندیٰ بن المستکبر کا خاندان کسرائے ایران کی طرف سے حکمران نامزد ہوا تھا جس کے کچھ حالات محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) نے اپنی مشہور کتاب المحبّر (مخطوطہ دائرۃ المعارف حیدرآباد) میں لکھے ہیں اور بعد میں اسی جلندیٰ کے بیٹوں جیفر اور عبد سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تخاطب فرمایا تھا، عمان وسیع ملک ہے، وہاں کے ایک اور عرب سردار ہوذہ بن علی کو کسریٰ نے ایک جواہر نگار ٹوپی عطا کی تھی، اسی لیے اس کا لقب ذوالتاج یا صاحب التاج مشہور ہو گیا تھا (دیکھئے اشتقاق ابن درید ص ۲۰۹ عقد الفرید ابن عبدربہ جلد۲، ص ۶۷) الحساء میں کسی عرب ریاست کا بظاہر پتہ نہیں چلتا اور وہاں کے صدر مقام ہجر میں ایرانی فوجی گورنر (مرزبان) رہا کرتا تھا، بعض غیر موروثی عرب افسر بھی تھے، عرب مؤلفوں کے ہاں اس قسم کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں، فلاں عربی شیخ نے فلاں بادشاہ (کسریٰ قیصر نجاشی وغیرہ) کے ہاں باریابی حاصل کی، ابن عبدربہ نے اس کا مستقل باب (الوفادات) ہی قائم کیا ہے ایسے ہی ایک شخص سے خوشنودی کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شیخ کی خواہش پر کسریٰ نے ایک مہندس (انجینئر) بھیجا، جس نے وادی وج میں ایک فصیل دار قلعہ تعمیر کیا، جسے طائف کہتے تھے، (کتاب الاغانی جلد ۱۲، ص

۴۸۔۴۹) اس کے استحکام کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے، کہ فتح مکہ وحنین کے بعد طائف کو اسلامی فوجوں نے آ گھیرا تھا، اور باوجود منجنیق اور دبابوں کے استعمال کے محاصرہ ختم ہوتا نہ نظر آیا اور جناب رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید جانی نقصان نامناسب سمجھ کر محاصرہ اٹھالیا تھا۔

ابتدائے اسلام:

ایران آتش پرست تھا، انتہائی جنسی اباحیت رکی بھی تو حقیقی بہنوں اور صلبی بیٹیوں تک کو وہاں ازدواجی اغراض کے لیے محرمات میں نہیں شامل کیا جاتا تھا، غالباً اسی قسم کے معاملات ہوں گے جس نے مشرک عیسائیوں کو جناب رسالت مآب ﷺ کی نظر میں مجوسیوں پر قابل ترجیح بنادیا تھا، قرآن مجید کی سورۃ روم بھی انہی جذبات کی ترجمان ہے۔

ابن ہشام (ص ۲۷۸) وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب آنحضرت ﷺ مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت اور اسلام کی مدد کی ترغیب دیتے تو علاوہ اخروی روحانی ثواب کے وعدے کے پیشن گوئیاں بھی فرماتے کہ کسریٰ وقیصر کی دولت تمہارے قدموں پر نچھاور ہوگی، جنگ خندق میں سنگ مرمر کی چٹان کو توڑتے وقت چنگاریاں اڑنے پر اسی پیشن گوئی کا اعادہ فرمایا گیا تھا۔ (دیکھو طبری وغیرہ)

میں نے ایک مستقل مضمون میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے [۵] کہ ۶ ھ کی صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے ''فتح مبین'' اور ''نصر عزیز'' کیوں کہا ہے اور کس لیے اسے اسلام اور مسلمانوں کی سیاسی کامیابیوں کا شہ کار سمجھا جاتا ہے (مشہور عام خیال تبلیغ کی سہولت کچھ دل کو نہیں لگتا) یہاں اس کا دہرانا غیر ضروری ہے بہر حال اس صلح سے جہاں مسلمانوں کے ہاتھ کھل گئے اور وہ خیبر کے نمو پذیر خطرے کا دو ہی تین ماہ میں استیصال کرنے کے قابل ہو گئے، وہیں انھیں نینوا میں ایرانیوں کی بیزنطینیوں

(رومیوں) کے ہاتھوں عہد آفریں شکست کے سلسلہ میں بین الممالک صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا (نینوا کی لڑائی شعبان ٦ھ میں ہوئی تھی اس کے بعد ہی صلح حدیبیہ ہوئی)

بلاذری (فتوح ص ٧٩) اور ابن الاثیر (کامل ص ٢-١٧٥) نے بیان کیا ہے کہ ایرانی مقبوضہ بحرین کے ایک عربی النسل افسر منذر بن ساویٰ کو جناب رسالت مآب ﷺ نے سب سے پہلا خط ٦ھ ہی میں روانہ کیا تھا، غالباً کسرائے ایران کا خط بھی اسی نامہ بر کے ذریعہ بھیجا گیا ہوگا، جس نے بحرین کے حاکم سے خواہش کی کہ اسے کسریٰ کے پاس مدائن بھیج دے)

یہاں اس کی غالباً ضرورت نہیں کہ ساوہ، بحرین، عمان، یمن وغیرہ عرب کے جملہ ایرانی مقبوضات سے عہد نبوی میں جو اسلامی تعلقات رہے ان کی پوری تفصیل اور ان کا ارتقا بتایا جائے، ورنہ ان علاقوں کے ایرانی افسروں یا عرب شیوخ کے نام لکھے ہوئے کئی درجن نامہ ہائے نبویؐ تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں، ایک منذر ہی کے نام کے نو خط ملتے ہیں جن میں بحرین کی سیاسیات کی پوری تاریخ محفوظ ہے، ان کے متن کے لیے میری حقیر تالیف ''الوسائق السیاسیۃ'' دیکھی جا سکتی ہے (جس کی طباعت کے بعد اوائل ١٣٦١ھ میں کتب خانہ خدا بخش مرحوم پٹنہ میں قبیلہ عبدالقیس سے کیا ہوا ایک اور معاہدہ کتاب ''وسیلۃ المتعبدین '' میں دستیاب ہوا ہے، یہاں صرف شہنشاہ ایران سے خط و کتابت پر کچھ بحث کی جائے گی جس میں متعدد گتھیاں سلجھانی ہیں۔

تمام اسلامی مورخوں محدثوں اور دیگر مولفوں نے متفقہ طور پر بیان کیا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کے نام اسلام کے تبلیغی خطوط بھیجے تو ان میں سے ایک کسرائے ایران کے نام بھی تھا، اس کا متن جس میں کچھ لفظی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں، یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

١۔ بسم الله الرحمن الرحيم

ترجمہ	متن
محمد رسول اللہ کی طرف سے سردار ایران کسریٰ کے نام	٢۔ من محمد رسول الله الى كسرى عظيم فارس
ہدایت پر چلنے اور خدا و رسول پر ایمان لانے والے کے لیے سلامتی ہو	٣۔ سلام على من اتبع الهدى و آمن بالله ورسوله
میں تجھے خدا کا بلاوا دیتا ہوں کیونکہ مجھے خدا نے تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے	٤۔ وادعوك بدعاية الله فانى انا رسول الله الى الناس كافته
تاکہ میں ہر زندہ شخص کو ڈراؤں کافروں کے متعلق خدا کی بات پوری ہوکر رہے گی	٥۔ لانذر من كان حيا و يحق القول على الكافرين
اسلام سلامت رہے گا	٦۔ فاسلم تسلم
اگر تو انکار کرے تو تمام مجوسیوں کا وبال تجھی پر پڑے گا۔	٧۔ فان ابيت فان اثم المجوس عليك

یہ متن تاریخ طبری ص ۱۵۷۱ و ص ۱۵۷۲ (دو روایتیں) صبح الاعشیٰ قلقشندی جلد نمبر ۶ ص ۲۹۶، کتاب الصناعتین لابی ہلال العسکری، نیز جلد نمبر ۶ ص ۳۷۸، اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین لابن طولون مکتوب نمبر ۳، الواہب اللدینہ للقسطانی جلد نمبر ۱، ص ۲۹۱، تاریخ الیعقوبی جلد نمبر ۲، ص ۱۸۳، نصب الرایۃ لاحادیث الہدایہ اللزیلعی، مکتوب نمبر ۹، مفید العلوم و مبید الہموم، للقزوینی مکتوب نمبر ۲، دلائل النبوۃ لابی نعیم جلد نمبر ۲، ص ۱۲۲، المنتقی لابی نعیم ورق نمبر ۳۵/ب (مخطوطہ حیدرآباد دکن) نفریدون بک جلد ۱، ص ۳۱، وسیلۃ المتعبدین العمر الموصلی جلد ۸، ورق نمبر ۲۷/ب (مخطوطہ بانکی پور) میں مکمل ملتا ہے اور طبقات ابن سعد، اموال ابی عبید، صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند ابن حنبل وغیرہ میں جستہ جستہ ملتا ہے، اس پر کائتانی نے اپنی اطالوی

تاریخ اسلام میں اور اسپرنگر نے اپنی جرمن کتاب سوانح وتعلیمات محمدی میں بحث کی ہے، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد میں میرا بھی ایک انگریزی مضمون اس خط کے متعلق ملے گا۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا یہ متن مختلف تاریخوں نے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے، اہم تر یہ ہے، بعض روایتوں میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" خذف ہو گیا ہے س کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ خذف عبارت کا عام رواج رہا ہے۔

قلقشندی نے ابو ہلال عسکری سے جو متن نقل کیا ہے صرف اسی ایک روایت یں "کسریٰ پرویز عظیم فارس" کے الفاظ ہیں اور باقی کسی نے بھی پرویز کا نام نہیں لیا ہے، میرا خیال ہے کہ پرویز کا نام بعد کا قیاسی اضافہ ہے، واللہ اعلم

ف[۳]، میں طبری کی ایک روایت میں وشهد ان لااله الا الله وحده لا شريك و ان محمد عبده ورسوله کے الفاظ زائد ہیں، جو اصل فقرے کی صرف شرح معلوم ہوتی ہے۔

ف[۴] میں دعاء اللہ اور دعایۃ اللہ کی روایتیں عام ہیں، رسالت نبویہ مولفہ عبدالمنعم خان ٹونکی نے دعا الاسلام کہیں سے نقل کیا ہے، مطلب سب کا ایک ہی ہے۔

ف[۵] میں قرآنی آیت کے لحاظ سے بعض روایتوں میں "لینذر" بھی مروی ہے جو عربی کے لحاظ سے ...... ٹھیک ہو گا۔

ف[۶] میں "فان" کی جگہ "دان" اور اسی طرح "ابیت" کی جگہ "تولیت" نیز "اثم المجوس علیک" کی جگہ "میک اثم المجوس" وغیرہ فرق بھی ملتے ہیں جو روایت بالمعنی کا نتیجہ ہیں، ان سے مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غرض یہ خط عبداللہ بن حذافہ السہمی بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے تھے۔ یہ ٹھیک طور سے نہیں معلوم ہوتا کہ آیا عبداللہ بن حذافہ ہی مداین گئے تھے یا حاکم بحرین نے اپنے کسی آدمی کے ہاتھ اسے پائے تخ ، روانہ کیا تھا، بہرحال تمام اسلامی مولف

بیان کرتے ہیں کہ کسریٰ (خسرو پرویز) نے طرز تخاطب دیکھتے ہی پورا خط پڑھے بغیر چاک کر دیا اور نامہ بر کو سامنے سے نکلوا دیا، اس کے علاوہ یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسریٰ نے یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ دو آدمی مدینہ روانہ کرے اور نبی عربیؐ کو برضا مندی ورنہ گرفتار کر کے مداین روانہ کرے۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب ﷺ نے ان سے کہا کہ آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا، اس پر وہ یمن چلے آئے اور جلد ہی مداین سے کسریٰ شیرویہ نے سرکاری اطلاع بھیجی کہ اس نے مصلحت عامہ کے تحت اپنے باپ کو قتل کر دیا اور خود تخت نشیں ہو گیا ہے اور کہتے ہیں کہ شیرویہ کی پدرکشی کی تاریخ وہی تھی جو حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمائی تھی اور اس معجزہ کو دیکھ کر باذان اور بہت سے یمنی مسلمان ہو گئے۔

یہ واقعہ سیرۃ ابن ہشام (ص ۴۶) پر مذکور ہے اور بہ ظاہر ابن اسحاق کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ ابن ہشام نے زہری کی روایت خود اضافہ کی ہے۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۷۱ میں جہاں بادشاہوں کے نام خطوط کا ذکر ہے وہاں کسریٰ کے سلسلہ میں یہ قصہ بیان نہیں ہوا ہے۔ تاریخ طبری ص ۱۵۷۲ تا ۱۵۷۴ میں جہاں اس سفارت کار کا ذکر ابن اسحٰق کے حوالہ سے نقل ہوا ہے، وہیں زہری کی روایت صرف اتنی بیان ہوئی ہے کہ کسریٰ کے نامہ مبارک کو پارہ پارہ کر ڈالنے کی اطلاع ملی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خدا اس کے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے اور طبری نے شیرویہ کی پدرکشی کا قصہ زہری کے اس قطع کلام کے بعد یزید بن حبیب کی روایت کی بنا پر نقل کیا ہے اور وہاں زہری کا اس سے تعلق نہیں ہے۔

اس اختلاف کو ہم کوئی خاص اہمیت عام حالتوں میں نہیں دیتے لیکن طبری نے جہاں یہ قصہ ۶ھ کے حالات میں حدیبیہ کے بعد بیان کیا ہے، وہیں ایران قدیم کے حالات ہیں (ص ۱۰۰۹ پر) یہ جملہ بھی عکرمہ کے حوالہ سے ایک غیر مربوط قصہ کے آخر میں لکھا ہے:

فاهلک اللہ کسری و جاء الخبر الی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یوم الحدیبیۃ نفرح و من معہ	چنانچہ خدا نے کسریٰ کو ہلاک کر دیا، اور اس کی اطلاع جناب رسالت مآب کو حدیبیہ کے دن پہنچی جس سے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو خوشی ہوئی۔

جب خسرو پرویز کے مرنے کی اطلاع حدیبیہ کے دن آ چکی تھی، تو پھر بعد میں پرویز کے نام خط لکھنا اور پدرکشی کی اطلاع بطور معجزہ دینا سب بے بنیاد قصے بن جاتے ہیں، کثیر نویسی کی وجہ سے طبری کے ہاں بلاتنقید متضاد روایات کا آ جانا اور روایات میں بھی بے احتیاطی سے قطع و برید ہو جانا ایک معروف واقعہ ہے جس سے ہر وہ شخص واقف ہے جس نے طبری کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اسی بناء پر ابونعیم کی دلائل النبوۃ (جلد نمبر ۲، ۱۲۴) کی یہ روایت خاص توجہ کی مستحق ہے کہ:

> ''رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی دن شکست ہوئی تھی جس دن حدیبیہ کی صلح ہوئی اور جب اس کی اطلاع پہنچی تو جناب رسالت مآب ﷺ کو بڑی خوشی ہوئی (کہ قرآن مجید کے سورۃ روم کی کئی سال قبل کی پیشن گوئی پوری ہو گئی)

نینوہ کی لڑائی شعبان ۶ھ (دسمبر ۶۲۷ء) میں ہوئی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، عام طور سے اسلامی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ مہم حدیبیہ کے لیے مسلمان مدینہ سے ذی قعدہ ۶ھ میں نکلے، لیکن امام یوسف نے کتاب الخراج (ص ۱۲۸) میں یہ روایت بیان کی ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ حدیبیہ کے لیے رمضان میں نکلے، تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ جلد ۴، ص ۱۶۴) میں حدیبیہ کے ذی قعدہ میں پیش آنے کا ذکر کر کے اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ عروہ کے بیان کے مطابق صلح حدیبیہ ماہ شوال میں منعقد ہوئی۔

آنحضرت ﷺ کے ہمعصر زمانہ کی تاریخیں نہ تو بیزنطینیوں کے ہاں محفوظ رہیں نہ ایرانیوں کے ہاں، اور نہ حبشیوں کے ہاں، ان حالات میں ایک واحد استثناء خاص توجہ کا محتاج ہے، وہ یہ کہ قیصر ہرقل اور کسریٰ پرویز میں جب آخری فیصلہ کن لڑائی شروع ہوئی تو قیصر میدان جنگ سے وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خط روانہ کرتا رہا۔ اتفاق سے یہ اب تک محفوظ ہیں اور انہی میں سے ایک میں قیصر نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ ''خبر آئی ہے کہ خسرو پرویز کو اس نے بیٹے شیرویہ نے ۲۷، فروری ۶۲۸ء کو قتل کر ڈالا ہے[۶] (جو وسط رمضان ۶ھ کے مطابق ہے) قرآنی شہادت قیصر کے اس خط کی صحت کی تائید کرتی ہے، شعبان میں نینوا میں فیصلہ کن شکست کھانے کے بعد وسط رمضان میں اس کا مارا جانا کوئی تعجب کا حامل نہیں اور بظاہر قیصر کو اس واقعہ کے بیان کرنے میں عمداً جھوٹ پر آمادہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، اسی وجہ سے واقدی کا یہ بیان کرنا کہ:

''شیرویہ نے اپنے باپ کسری کو منگل کی رات ۱۰، جمادی الاولی ۷ھ کو قتل کیا، جب کہ چھے گھڑی رات گزر چکی تھی''۔

(تاریخ طبری ص ۱۵۷۴)

اپنے اندر مقابلتاً کم کشش رکھتا ہے۔

غرض اس وقت جو گتھیاں نظر آتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

واقعہ	طبری فی روایہ	ابو نعیم	ابو یوسف	واقدی	ابن کثیر فی روایہ	ہرقل کا خط یونانی تاریخ میں	عام مورخین
نینوہ میں ایرانی شکست	-	-	-	-	یوم الحدیبیہ	-	شعبان ۶ھ

کسری پرویز کا قتل بیٹے کے ہاتھ	یوم الحدیبیہ			۱۰، جمادی الاول ۷ھ		وسط رمضان ۶ھ	
اس قتل کی اطلاع کا جناب رسالت مآب ؐ کو پہنچنا		یوم الخدیبیہ					حدیبیہ کے کئی ماہ بعد تقریباً ربیع الثانی یا جمادی الاول میں
حدیبیہ کے لیے روانگی			رمضان ۶ھ				ذی قعدہ ۶ھ
صلح حدیبیہ					شوال ۶ھ		تقریباً اواخر ذی قعد یا اوائل ذی حجہ ۶ھ

ان میں ممکن ہو تو باہم تطابق دینے ورنہ کسی ایک کے بیان کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے لیکن اس طرف توجہ کرنے سے قبل دو اہم امور بطور تمہید ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد نے سیرۃ نبویہ کے واقعات کو کبھی تو ہجری سن میں بیان کیا ہے اور کبھی ہجرت کے وقت سے ،اور سب جانتے ہیں کہ ہجرت ۱۲، ربیع الاول کو ہوئی اور سن ہجری اس سے کوئی دو ماہ اٹھارہ دن قبل یکم محرم سے شمار کیا جاتا ہے، اسی لیے مثلاً جنگ بدر کا ذکر کرنا ہو تو ماہ نہم (رمضان) ۲ھ یا ہجرت سے ایک سال چھ ماہ بعد کہنا پڑے گا، واقدی نے کسی ایک طریقہ شمارہ کا چونکہ شروع سے آخر تک لزوم نہیں رکھا ہے اس لیے من لہجرۃ (ہجرت کے وقت سے) اور لہجرۃ (ہجری

سنہ سے) کہنے میں بآسانی خلط ملط ہوسکتا ہے، مزید براں اگر راوی کی صرف روایت پہنچی ہو اور اس سے بالمشافہ جرح اور تعین کا موقع نہ ہو اور راوی نے ہجری سنہ مراد لیا ہو اور واقدی نے وقت ہجرت سے مدت مراد ہونی سمجھی ہو، تو نادانستہ میں ماہ کا بڑی آسانی سے فرق پیدا ہو جاتا ہے خاص کر اس لیے کہ واقدی نے مہینے کا نام لینے کے لیے اکثر مہینوں کی گنتی دی ہے کہ ہجرت کے اٹھارہ یا بیس مہینوں بعد، وغیرہ۔

ا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ ۱۰ھ میں سال کبیسہ کو عربی مہینوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا اور خطبہ حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت (انما النسئی زیادۃ فی لکفر الایتہ) کو دہرانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا،

وان الزمان قداستدار کھیتہ یوم خلق اللہ السموات والارض — زمانہ چکر کھا کر پھر وہی شکل اختیار کر چکا ہے، جیسا خلقت آسمان وزمین کے وقت تھا

(سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۸ تاریخ طبری ص ۱۷۵۴ وغیرہ)

اور متفقہ طور سے اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبیسہ دونوں لحاظ سے ذی حجہ باہم جمع ہو گئے تھے، قمری اور کبیسہ مہینوں کے متعلق عربی مورخوں نے جو بیانات چھوڑے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر تیسرے سال قبیلہ بنی فقیم کا سردار جس کا لقب قلمس ہوا کرتا تھا، حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص رسم کی انجام دہی کے ذریعہ سے اعلان کرتا تھا کہ اب جو ذی حجہ چل رہا ہے، اس کے بعد نیا چاند نظر آئے تو وہ محرم الحرام کا نہ ہوگا (بلکہ ایک گمنام اور غیر محترم مہینہ ہوگا) اور اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرام کا ہوگا، (جدید علم ہئیت بھی یہی کہتا ہے کہ قمری سال میں شمسی سال سے دس دن کم ہوتے ہیں اور ہر تیسرے سال ایک مہینہ کا فرق پڑ جاتا ہے) اس بیان کے بموجب اگر ۱۰ھ میں دونوں قسم کے مہینے یکجا ہو گئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

سنہ ۶ھ		سنہ ۷ھ		سنہ ۸ھ		سنہ ۹ھ		سنہ ۱۰ھ	
ہجری مدنی	مکی کبیسہ	ہجری مدنی	مکی کبیسہ	ہجری مدنی	مکی کبیسہ	ہجری مدنی	مکی کبیسہ	ہجری مدنی	مکی کبیسہ
محرم	ربیع ۱	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	محرم
صفر	ربیع ۲	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	صفر
ربیع ۱	جمادی ۱	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۱
ربیع ۲	جمادی ۲	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	ربیع ۲
جمادی ۱	رجب	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۱
جمادی ۲	شعبان	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	جمادی ۲
رجب	رمضان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	رجب
شعبان	شوال	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	شعبان
رمضان	ذی قعدہ	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	رمضان
شوال	ذی حجہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	شوال
ذی قعدہ	X	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ
ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	X	ذی حجہ	ذی حجہ

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ذی قعدہ ٦ ھ کمی میں جب صلح حدیبیہ ہوئی تو رمضان ٦ ھ چل رہا تھا اور اس طرح عروہ کا یہ کہنا کہ مہم حدیبیہ شوال میں ختم ہوئی یا امام ابو یوسف کا کہنا کہ حدیبیہ کے لیے مسلمان مدینہ سے رمضان میں نکلے تھے اور عام مورخین کا اس واقعہ کو ذی قعدہ میں قرار دینا، ان میں باہم کوئی تضاد نہیں، چونکہ اس وقت تک سال کبیسہ منسوخ نہیں ہوا تھا اور مکہ پر قریش ہی قابض تھے۔ اس لئے ان کے حج کا موسم ان کے ذی قعدہ سے شروع ہوا تھا حالانکہ خالص قمری حساب سے ابھی رمضان ہی کا مہینہ چل رہا تھا۔

سنہ ہجری اور وقت ہجرت کے فرق کے تین مہینے اور قمری اور کبیسہ سالوں کے ٦ ھ میں فرق کے تین مہینے جملہ چھ مہینوں کا فرق، یہ بڑی آسانی سے واقدی کی اس روایت کی توجیہ کر دیتا ہے کہ پرویز کا قتل ذی قعدہ (کمی) کی جگہ جمادی الاولیٰ میں کیوں بیان کیا گیا، دوسرے الفاظ میں راوی نے کہا ہوگا کہ سنہ ہجرت اکہترویں مہینہ میں اور واقدی نے وقت ہجرت (ربیع الاول) سے حساب کیا اور نہ تو دو کبیسہ سالوں کا خیال رکھا اور نہ ہجرت اور سنہ ہجری کے فرق کا لحاظ کیا اور نہ ہجرت کے اکہترویں مہینہ یعنی ذی قعدہ ٦ ھ کمی کی جگہ جمادی الاول ٧ ھ بیان کر دیا۔

واقدی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ خسرو پرویز کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارے جانے کی تاریخ انھیں کس ماخذ سے معلوم ہوئی، اگر اس تاریخ کے متعلق یونانی مورخ کا بیان (خود قیصر ہرقل کے خط کی بنا پر) صحیح مانا جائے تو یہ واقعہ ٢٧، فروری ٦٢٨ء (مطابق وسط رمضان ٦ ھ م وسط ذی قعدہ ٦ ھ کمی) کو ہوا ہوگا اور یہ روایت قطعاً رد کر دینی پڑے گی کہ کسریٰ کے حکم سے جب یمن میں سے دو ایرانی افسر مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا" اور یہ کہ اس پیشگوئی یا غیب گوئی کے صحیح ثابت ہونے پر گور نر یمن مع حوالی موالی مسلمان ہو گئے، آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی اپنی عظمت کی

برقراری کے لیے ایسے کسی معجزہ کی محتاج نہیں، خاص کر جب اس معجزہ کا حال کچھ بہت زیادہ مستند ذرائع سے بھی معلوم نہیں ہوتا ہے اور اس کے متعلق خود عرب مولف متضاد باتیں بیان کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر واقدی کی روایت کہ یہ قتل ۱۰/ جمادی الاول کو ہوا، صحیح بھی مانی جائے تو متعدد علمی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پرویز کے قتل کی جو تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہے اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔

اس لیے طبری کی روایت کہ کسریٰ کے قتل کی اطلاع حدیبیہ کے دن آئی، اصل میں اس روایت کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو ابونعیم نے بیان کی ہے کہ نینوا کی شکست کی خبر حدیبیہ [۷] کے دن آئی اور اس میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ حدیبیہ سے مہینہ بھر پہلے کا واقعہ تھا اور اس عرصہ میں ایران کی خبر اس زمانہ میں مکہ تک آ سکتی تھی۔

مجھے اپنے ان اخذ کردہ نتائج پر اصرار نہیں ہے اور اگر کوئی اہل علم ان کی اصلاح کر سکیں اور گتھیوں کو سلجھا سکیں تو سیرۃ نبویہ کی ایک الجھن رفع ہو سکے تھی۔

واللہ الهادی الی الصواب و هو الموفق والیه المآب۔

تتمہ:

جیسا کہ عرض کیا گیا جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کسریٰ عظیم الفرس'' کے نام خط روانہ فرمایا تھا، ابوہلال عسکری کی روایت کہ خط میں ''کسریٰ ابرویز'' لکھا ہوا تھا، ممکن ہے کہ صحیح ہو اور باوجود پرویز کے قتل ہو چکنے کے اس کی اطلاع اس وقت تک مدینہ منورہ نہ آئی ہو لیکن پرویز کے قتل کے بعد مداین میں جو شاہ گردی شروع ہوئی اس کے باعث یہ نہیں معلوم کہ وہ نامہ مبارک دراصل کس نے وصول کیا، بہرحال ایران کی پریشان صورت حال کے باعث جناب رسالت مآب ﷺ نے براہ راست ایرانی مقبوضات عرب کے افسروں سے مخاطبت شروع فرمائی،

چونکہ ان مٹھی بھر ایرانیوں کو اب مداین سے کسی کمک اور مدد کی توقع نہ رہی تھی جیسا کہ طبری نے (تاریخ ص۔۱۵۵۰ میں) بیان کیا ہے کہ کم ازکم یمن میں ایک وطینت پسند تحریک زور شور سے اٹھ چکی تھی کہ مداخلت کنندہ ایرانی غیر ملکیوں کو نکال باہر کیا جائے اس لیے علاوہ اور اسباب کے کوئی تعجب نہیں کہ اپنی جان و مال کے اس خطرہ کو دیکھ کر ان ایرانیوں نے اسلام قبول کرنے اور حکمران عربﷺ کی حفاظت حاصل کرنے کی جانب ترغیب پائی ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ یمن، عمان، بحرین وغیرہ کے ایرانی مقبوضات دیکھتے کے دیکھتے مداین سے ٹوٹ کر مدینہ سے جڑ گئے تھے اور آنحضرتﷺ کی سیاست خارجہ کچھ اتنی کامیاب ہورہی تھی کہ مابقی علاقوں کے لیے مداین کو فکر ہونے لگی، چنانچہ چند ہی دنوں بعد جب قسمت نے بوران دخت کو تخت کیانی پر پہنچایا تو اس نے جناب رسالت مآبﷺ کے پاس تحفے تحائف بھیج کر دوستی کی طرح ڈالنی چاہی (جیسا کہ تاریخ طبری ص ۳۱۶۳ میں صراحت سے اور ترمذی شریف جلد۲ ص ۲۹۶ باب قبول الهدایا میں بلاصراحت نام اس کا ذکر ملتا ہے)

ضمیمہ:

نسئ کے متعلق عرب مولفوں میں سے البیرونی وغیرہ بعض یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سال قمری کو سال کبیسہ بنانے کا نام ہے، تو بعض مولف یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اشہر حرم کی طوالت سے گھبرا کر غیر حرام مہینہ بیچ میں شامل کیا جانے کا نام تھا تاکہ اس زمانہ میں لوٹ مار کی جاسکے۔ غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''نسئ'' کی حرمت کے کئی سو سال بعد جب خالص قمری سنہ میں پلے ہوئے بعض عرب مولف اس کو سمجھ نہ سکے اور جس طرح قمری و شمسی سال میں سالانہ دس دن کا فرق قدیم زمانہ میں عام بدوؤں کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور وہ قلمس کی کبیسہ گری کو محض یہ سمجھتے تھے کہ مسلسل تین حرام مہینوں کی دل برداشتہ کرنے والی طوالت کو توڑنے کے لیے ایک غیر حرام مہینہ لایا

گیا ہے بالکل اسی طرح انہی بدوؤں کی اولاد اور ان کی کہاوتوں اور روایتوں کے حامل مسلمان علماء بعد کو زیادہ غور کئے بغیر بدویوں کی روایتوں کو اسلامی ادبیات میں شامل کرنے لگے، نسئ کے متعلق سویڈن کے پروفیسر موبرگ (Moberg) نے جرمن زبان میں ۱۹۳۱ء میں جو مقالہ لکھا ہے وہ چاہے نتائج کے لحاظ سے غیر تشفی بخش ہو لیکن مواد اور حوالوں کے اعتبار سے بہت مفید ہے، اسی کا خلاصہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں بھی دیا گیا ہے۔

(مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، نمبر ا، جلد ۵۰)

حواشی:

[ا] اس کی قدامت اور وسعت کے لیے دیکھئے میرا مقالہ ''عربوں کے تعلقات بیزنطینیوں سے'' مجلہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ سالنا مہ سوم، مختصر یہ کہ سینٹ پاول کے زمانہ میں دمشق میں ایک عرب بادشاہ حارث حکمران تھا تو حلب جیسے شمالی علاقوں تک میں عرب کی راجدھانیاں قائم ہو چکی تھیں۔

[۲] بریٹ شنائدر کا انگریزی رسالہ ''عربوں کے متعلق چینیوں کے معلومات'' (ص ۶)

[۳] تنبیہ مسعودی ص ۱۸۶

[۴] مزدک نے ملکہ ایران کے متعلق بھرے دربار میں شہنشاہ سے جس بیبا کانہ بے حمیتی کا اظہار کیا تھا، اس سے عربی خوان بے خبر نہ ہوں گے۔

[۵] دیکھئے رسالہ سیاست حیدر آباد دکن، اپریل ۱۹۴۲ء

[۶] قیصر ہرقل کی جنگوں کے متعلق بڑی پیچیدگیاں ہیں، اس موضوع پر سب سے مستند کتاب جرمن زبان میں مین گیرلانڈ (Gerland) کی ہے جس کا نام ''قیصر ہرقل کی ایرانی مہمین (Die-persishe feldzuge des Kaisers Heraklius) ہے، یہ واقعہ اس کتاب میں یونانی مورخ تیوفان کے حوالہ سے نقل ہوا ہے۔

[۷] گو ابونعیم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نینوا کی شکست ہی حدیبیہ کے دن ہوئی۔

نہر سوئز کا پراجیکٹ حضرت عمرؓ کے زمانے میں

اپنے زیر تیاری مقالے کا مواد فراہم کرتے ہوئے مختلف چیزوں سے دو چار ہونا ناگزیر تھا۔ ایسی ہی دو ایک باتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

تاریخ کبیر ذہبی (غیر مطبوعہ) جلد اول دیکھ رہا تھا۔ ۱۷ھ کے واقعات پیش نظر تھے۔ یکایک یہ عبارت نظر سے گزری:

''جاء كتاب عمرو بن العاص الى عمر فى الاستعانته ان البحر الشامى حضر لمبعث رسول الله صلى الله عليه وسلم حفيرا فصب فى البحر العذاب فافسده الروم القبط فان احببت ان يقوم سعر الطعام بالمدينته كسعره بعصر حضرت لهم نهرا وبنيت لهم قناطر. فكتب اليه عمران افعل وعجل ذلك .فقال له اهل مصر خراجك زاج وامرك زاج. هذا انكسر الخراج فكتب بذالك الى عمر فكتب اليه عمر اعمله وعجل حزب الله خراج مصر فى عمران المدينة فعاجله عمر و وهوالقلزم فكان سعر المدينة كسعر مصر ولم يزدذلك مصرالاّ رخا، حتى حبس عنهم البحر مع مقتل عثمان فذل اهل المدينة و تقاصروا..........''

ذہبی نے یہ روایت طبری کے حوالے سے لکھی ہے چنانچہ طبری (ج ۵، صفحہ ۵۷۷) طبع لائیڈن) میں لفظ بہ لفظ اس عبارت کا ہونا مجھ سے بیان کیا گیا ہے۔اس سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ بحر شام کو آنحضرت ﷺ کی بعثت (۱۳ سہ قبل ہجرت) کے زمانہ میں ایک نہر کے ذریعہ سے ملایا گیا تھا۔مگر اسے عمروؓ بن العاص فاتح مصر نے اپنے زمانہ میں ناکارہ پایا۔

۲۔ عمروؓ بن العاص نے تحریک کی کہ انہیں ایک نہر کھدانے کی اجازت دی جائے۔اس سے مدینہ منورہ کو غلہ بھیجنے میں سہولت ہوگی۔

۳۔ مصریوں نے اس بناء پر مخالفت کی کہ اس سے مصر کی مال گزاری گھٹ جائے گی مگر حضرت عمرؓ نے مفاد عامہ کو سرکاری آمدنی پر ترجیح دی اور بعد میں مصریوں کا یہ خوف بے جا بھی ثابت ہوا۔

۴۔ عمرو بن العاصؓ نے قلزم سے یہ نہر ملا دی۔

۵۔ حضرت عثمانؓ کے آخر عہد تک یہ نہر کارآمد رہی۔

دریائے نیل چونکہ بحر شام (متوسط یا میڈی ٹرے نین) میں گرتا ہے اس لیے اگر دریائے نیل کو بحیرۂ احمر سے ملا دیا جائے تو چھوٹے چھوٹے جہاز بہ آسانی بحیرۂ احمر آ جاسکتے ہیں۔راہ میں چند جھیلوں کی موجودگی نے اس کام کو آسان تر کر دیا۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ قبل اسلام بھی دریائے نیل کو بحیرۂ احمر سے کئی بار ملایا گیا ہے۔اس کے آثار اب تک موجود ہیں (دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا عنوان ''سویز کینال)

از راہ کرم مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک خط میں لکھا ہے کہ

> ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (طبری کے) راوی سے غلط فہمی ہوئی بحر روم کو سوئیز سے قلزم میں ملانے کی تجویز حضرت عمرؓ نے رد کر دی تھی۔اور بحر (؟ نہر) نیل کو دریائے (؟ بحر) قلزم سے ملانے کی

تجویز پر عمل کیا گیا جس کا نام نہر امیر المومنین پڑا تھا............''

اس کے بعد آپ نے وہی حوالے دیئے جو شبلی کی الفاروق میں مجھے ملے۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ دونوں میں کوئی تضاد یا تصادم نہیں۔ یہ دریائے نیل اور بحیرۂ احمر (جو بحیرۂ قلزم بھی کہلاتا ہے) کے مابین قابل جہاز رانی نہر بنادی جائے تو بھی دریائے نیل کے دہانے کی راہ وہی مقصد حاصل ہوسکتا ہے جو براہ راست بحیرۂ احمر اور بحیرۂ متوسط کو ملانے سے۔ مگر یہ زیادہ مصارف چاہتا ہے۔

مگر ابھی کچھ فیصلہ کرنے سے قبل مزید تحقیقات کرنی چاہیے۔ سیوطی نے ''حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر و القاہرہ'' جس میں رطب و یابس ہر قسم کی چیزیں جمع ہیں۔ ''ذکر حفر خلیج امیر المومنین'' کے عنوان کے تحت جو باتیں درج کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷ھ کے مشہور قحط کے زمانہ میں گورنر مصر عمرو بن العاص کو'' غوثاہ ثم یا یا غوثاہ'' ''مدد مدد'' کی پرجوش اپیل دربارِ خلافت سے پہنچی اس کے جواب میں عمرو بن العاص نے ''یا لبیک یا لبیک'' ''حاضر حاضر'' کہا اور لکھا کہ ''میں اتنے اونٹوں پر غلہ بھیج رہا ہوں کہ اس کی قطار کا پہلا اونٹ مدینہ منورہ پہنچے گا تو آخری اونٹ نکل رہا ہوگا حضرت عمرؓ نے اس کے بعد پھر خود ہی ایک نہر کی تجویز کی۔ اور یہ خط بھیجا۔

''یا عمرو'' ان اللہ قدفتح علی المسلمین مصر وھی کثیرہ الخیر والطعام و قدالقی فی روعی لما احببت من الرفق باھل الحرمین والتوسعتہ علیھم ،ان احفر خلیجا من نیلھا حتی یسیل فی البحر فھو اسھل لما نرید من حمل الطعام الی المدینۃ والمکۃ فان حملہ علی الظھر یبعدولانبلغ معہ مانرید فانطلق انت واصحابک فتشاوروافی ذلک حقی یعتدل فیہ

رایکم" (بحوالہ سیوطی ایضاً ص ۱۴۳، جلد اول)

عمروؓ بن العاص نے مصریوں سے تذکرہ کیا تو یہ ان پر گراں گزرا۔ انہوں نے کہا اس سے مصریوں کو نقصان ہوگا۔ آپ خلیفہ کو لکھ بھیجیے کہ یہ نامناسب اور ناقابل عمل اور ناممکن ہے۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع مل گئی تھی۔ انہوں نے قاصد سے کہہ دیا کہ کیا مصریوں نے ایسا نہیں کہا تھا؟ آخر دربار خلافت کی تاکید پر۔

"احتفر الخليج الذى فى حاشية الفسطاط الذى يقال له خليج امير المومنين........"

(فسطاط کے متعلق شبلی نے لکھا ہے کہ وہ جبل مقطم اور دریائے نیل کے درمیان واقع تھا (الفاروق) گویا قاہرہ کے قریب اور اس کے جنوب میں تھا) نیل سے قلزم کو ملایا گیا ور ایک سال کے اندر ہی کشتیاں آنے جانے لگ گئیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک یہ راستہ مستعمل رہا (سیوطی)

سیوطی نے اسی کتاب میں ایک دوسری روایت میں لکھا ہے کہ پہلے عمرو بن العاص نے خط لکھا کہ "آپ واقف ہیں کہ اسلام سے پہلے ہمارے پہلے (عربوں کے) پاس کشتیاں آتی تھیں جن میں مصری تاجر ہوتے تھے۔ جب ہم نے مصر فتح کیا تو یہ "خلیج" یعنی نہر بند ہوگئی اور تاجروں نے اسے چھوڑ دیا۔ اگر آپ چاہیں تو ایک نہر کھدوا سکتے ہیں جس میں ہماری کشتیاں چلیں اور حجاز کو غلہ بھیجا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اچھا"۔

ایک تیسری روایت اسی کتاب میں ہے کہ ایک قبطی (مصری عیسائی) نے عمروؓ بن العاص سے کہا کہ اگر اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے تو وہ بتا سکتا ہے کہ کس جگہ سے کشتیاں مصر سے حجاز تک لے جائی جا سکتی ہیں۔ انہوں نے مدینہ لکھا تو حضرت عمرؓ نے بھی اس کا جزیہ معاف کرنا منظور کر لیا۔ بعد ازاں پہلی کشتی جو مصر سے آئی اسے دیکھنے کے لیے آپ مدینہ سے ساحل سمندر تک تشریف لائے۔

انسائیکلوپیڈیا برنائیکا میں نہر سوئیز کے متعلق لکھا ہے کہ ہارون رشید بحیرۂ

متوسط اور بحیرۂ احمر کو ملانا چاہتا تھا مگر اس خیال سے رک گیا کہ (رومی) جہاز اس مخرج کو دیکھ کر فائدہ اٹھائیں گے اور وہ جنگی نقطہ نظر سے خطرے سے خالی نہیں۔

ممکن ہے ہارون رشید کے زمانے میں بھی ایسا ہوا ہو خود انگریزوں نے بھی دلاسیپس کی اسکیم کی اسی بنیاد پر مخالفت کی تھی کہ ہندوستان کو خطرہ ہے آخر انگریزوں کی مخالفت کے باوجود نہر کھد گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا بھی یہی خیال تھا اور بحیرۂ احمر اور بحیرۂ متوسط میں راست نہر کے وہ مخالف تھے۔ چنانچہ ابوالفداء نے اپنی جغرافی تصنیف تقدیم البلدان ص ۱۰۶ طبع پاریس) میں شہر فرما کے تحت لکھا ہے:۔

الفرما بلدة على شاطى بحر الرام خراب ...... وعن ابن سعيد عند الفر مايقرب بحر الروم من بحر القلزم حتى يبقى بينهما نحو سبعين ميلا . قال و كان عمرو بن العاص قدارا دان بخرق مابينهما فى مكان يعرف الى الان بذنب التمساح فنها عمر بن الخطاب رضى الله عنه وقال كانت الروم تتخطف الحُجّاجَ

خلاصہ مطلب اس کا یہ ہے کہ فرما بحر متوسط پر ایک غیر آباد شہر ہے۔ یہاں سے بحیرۂ احمر صرف ستر میل رہ جاتا ہے۔ عمرو بن العاصؓ ذنب التمساح نامی مقام سے نہر کھدوا کر دونوں سمندروں کو ملانا چاہتے تھے۔ مگر حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں شاید رومی حاجیوں کو اُچک لے جائیں''۔

نہر سوئیز کی حالیہ تاریخ، اس کا بین الاقوامی معاملات پر اثر وغیرہ کا ذکر یہاں شاید غیر متعلق ہے۔

(بشکریہ مجلّہ تحقیق، کلیہ علوم اسلامیہ وشرقیہ، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور
جلد ۲۴۔ عدد ۱ تا ۴، ۲۰۰۳ء)

زبان اور اللہ کا کلام

کلام اللہ کی وحی کے لیے زبان کی ضرورت:

کوئی ہستی، کوئی چیز اپنے آپ کی خالق ہو نہیں سکتی۔ اس لئے ہر موجود کا کوئی موجد، ہر مخلوق کا کوئی خالق ہونا ضروری ہے، لیکن یہ واجب الوجود ذات حواس سے پرے اور ہر ادراک سے بالاتر ہے۔ تفصیلوں میں گئے بغیر کہنا یہ ہے کہ ایسے ماوراء ادراک واجب الوجود کا کلام ہم تک کیسے پہنچ سکتا اگر زبان نہ ہوتی؟ اگر زبان نہ ہوتو بھی ہم اللہ کی مرضی کے مطابق عمل کریں گے لیکن یہ عمل ہوگا جبلت کا، جانوروں کی طرح کا، عقل کا نہیں، انسان کا نہیں۔ خوش بختی ہے کہ حیوان ناطق کو اس کے خالق نے جن فضیلتوں کے ذریعے سے دیگر مخلوقات سے ممتاز کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے اس تک کلام اللہ پہنچتا ہے اور یہ کسی نہ کسی زبان کے ذریعے سے۔

مسلمانوں کا عقیدہ سیدھا سادہ ہے کہ ماوراء ادراک ذات باری تعالیٰ کسی آسمانی پیام رساں کے ذریعے سے اپنا کلام اور اپنا حکم کسی چیدہ و برگزیدہ انسان تک پہنچاتا ہے اور یہ انسان اسے دوسرے انسانوں کو سناتا ہے۔ عیسائی عقیدہ یہ ہے کہ خدا کا کلام گوشت و پوست کی شکل اختیار کر گیا ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ خدا کا کلام ہیں۔ مسلمان بھی انہیں کلمۃ اللہ مانتے ہیں اور (یہ میرا موضوع نہیں، بہرحال) جہاں

تک میں جانتا ہوں ،مسلمان اس کے مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ فنا فی اللہ ہونے کی حالت ہے کہ خدا ان کی زبان سے بولتا ، ان کے پاؤں سے چلتا ،ان کے ہاتھ سے پکڑتا اور ان کے دل و دماغ سے کوئی چیز چاہتا ہے ،جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں اللہ کے محبوب بندوں کی توصیف میں بیان ہوا ہے۔ ہندوؤں کے اوتار کی بھی یہی تعبیر سمجھ میں آتی ہے ۔ جو بھی ہو مسلمانوں کے پیغمبر ،عیسائیوں کے کلمتہ اللہ اور ہندوؤں کے اوتار کے ذریعے سے خدا کا کلام انسان تک پہنچنا کسی زبان ہی کے ذریعے سے ہے۔

ماوراء ادراک خدا کا کلام آواز ہی نہیں ،زبان سے بھی بالاتر ہوتا ہے۔ مثال مناسب سمجھی جائے تو یوں بیان کریں کہ خدا کا کلام ایک برقی بیٹری تک پہنچتا ہے جو بجلی کی رو (کرنٹ) کی طرح اسے منتقل کرتی ہے ۔ پیغمبر کا دل ایک بلب سمجھئے جو اس برقی رو سے منور ہو جاتا ہے ۔ بلب کا رنگ اس پیغمبر کی مادری زبان خیال کریں تو خدا کا کلام اسی رنگ کی روشنی میں نظر آتا ہے جو اس بلب کا رنگ ہو ۔ یہ ہے زبان کی اہمیت ماوراء ادراک خدا کا کلام وحی کے ذریعے سے انسانوں تک پہنچنے کے سلسلے میں ۔

زبان کا انسانوں میں آغاز :

قرآن مجید کی ایک مشہور آیت :اور اللہ نے (حضرت) آدم کو سارے نام سکھائے پھر (موسوم چیزوں) کوفرشتوں پر پیش کر کے فرمایا ، مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم (اپنی انسان پر فضیلت کے دعوے میں) سچے ہو ۔انھوں نے کہا ہمیں اس کے سوا کسی چیز کا علم نہیں جو تو نے ہمیں سکھایا ہے ،علم و حکمت تو تجھی کو سزاوار ہے ۔اس پر (اللہ نے) فرمایا۔اے آدم ان (فرشتوں) کو ان چیزوں کے نام بتا دے اور جب (آدم نے) وہ انہیں بتا دیئے تو (اللہ نے فرشتوں سے) فرمایا کیا میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ آسمانوں اور زمین کے غیب کا مجھی کا علم ہے ،اور جو چیز تم بتاتے اور جو چیز تم

چھپاتے ہو ان کا مجھ کو علم ہے؟ (سورۃ ۲، آیت ۳۱ تا ۳۳)

صوفی ہوں کہ فلسفی یا کوئی اور، ہر متخصص ان آیتوں کا مفہوم اپنے فن اور اپنے اختصاص کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کرے گا۔ان میں کوئی تضاد نہیں، وہ باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔لسانیاتی نقطہ نظر سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان کو جانوروں بلکہ فرشتوں پر بھی فضیلت ملتی ہے تو زبان کے ذریعے سے اور زبان کا آغاز ہے ہر چیز، ہر مفہوم کو ایک نام دے کر اسے دوسری چیز سے ممتاز کرنے کے ذریعے سے۔گویا ابتدأ یہ مفردات ہوتے تھے کہ ان کے ربط سے ایک طویل اور پیچیدہ مفہوم دوسرے ہم جنس تک ہم پہنچاتے تھے۔پھر خداداد طاقتوں ہی سے ایک، یعنی تجربے سے سبق لینا اور دشواریوں کی اصلاح کرنا ہی اس زبان کو ترقی دیتا ہے۔

اگر یہ گمان درست ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی موجودہ زبانوں میں اس قدامت کی سب سے زیادہ حامل یا محافظ چینی زبان ہے ۔میں نے پینتیس سال ہوئے، اس کی کوئی دو مہینے تعلیم حاصل کی تھی ،اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ چینی زبان میں کوئی صرف ونحو نہیں ہوتی ، جتنے مفہوم ہیں (اور جو کہتے ہیں کہ چینیوں کے مطابق آٹھ لاکھ ہیں) تو ہر ایک کو لکھنے کے لیے ایک الگ شکل ہوتی ہے ۔مثلاً ایک جملہ لیں ۔پہلی شکل انسان کی دوسری شکل افق پر طلوع ہونے والے سورج کی ،تیسری شکل دوڑنے کی، چوتھی شکل درختوں کے مجموعے یا جنگل کی ، پانچویں شکل نظر سے غائب ہونے کی، جب آپ یہ پانچوں شکلیں یکجا دیکھیں تو یہ سمجھ لیں گے کہ ایک شخص صبح کے وقت بھاگتا ہوا جا کر جنگل میں چھپ گیا۔

اچھی زبانیں:

ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو، بہر حال میرا خیال ہے کہ جس طرح افراد میں صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، اسی طرح افراد کے مختلف مجموعوں یعنی قوموں میں بھی

صلاحیتوں کی حد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ان صلاحیتی اختلافوں کے باعث زبانوں میں اختلاف بھی پیدا ہوتا ہے۔ ہر مجموعہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعے سے اپنی ایک بولی بناتا ہے جو دوسروں کی بولیوں سے مختلف ہو جاتی ہے۔

کم یا زیادہ اچھے افراد، کم یا زیادہ اچھی قوموں کی طرح زبانیں بھی کم یا زیادہ اچھی ہوتی ہیں، لیکن اس کی جانچ کا معیار کیا ہو؟ خدا کے کلام کو ہر حیثیت سے شاندار ہونا چاہیے۔منجملہ اور ضرورتوں کے اسے ایسی زبان میں ادا ہونا چاہیے جو صحت اور وضاحت میں دقیق نزاکتوں کو ملحوظ رکھ سکے، سننے والوں پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھا سکے وغیرہ۔

اس لحاظ سے میرا خیال ہے کہ دنیا کی سب سے اچھی زبانیں وہ ہیں جن کو خدا کے کلام کی وحی کا حامل بننے کا شرف حاصل ہوا، حضرت موسیٰ و حضرت داؤد کی عبرانی ہو کہ حضرت عیسیٰ کی آرامی، پارسیوں کو دعویٰ ہے کہ اوستا خدا کی وحی ہے۔ ہندوؤں کو بھی اصرار ہے کہ ویدیں خدا کا کلام ہیں۔اگر ایسا ہی ہے تو پرانی ایرانی اور پرانی سنسکرت زبانیں بھی ''اچھی'' زبانوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں گی۔اس میں اصولاً کوئی امر مانع نہیں۔مسلمانوں کا عقیدہ کہ قرآن نہ صرف خدا کا کلام ہے بلکہ خدا کا آخری پیغام ہے۔آخری پیغام کو جو بھی ترجیحی خصوصیتیں حاصل ہوں گی وہ اس آخری پیغام کی حامل بننے والی زبان کو بھی حاصل ہونی ضروری ہیں تاکہ یہ وسیلہ مناسب حال ہو۔قرآن میں عربی کو ''لسان عربی مبین (یعنی ایک واضح اور خوب اچھی طرح بیان کرنے والی زبان) کا نام دیا گیا ہے، جو بے وجہ نہیں ہو سکتا۔

میں ان اچھی زبانوں کی اچھائی کی تفصیل میں جا نہیں سکتا۔اس کی مجھ میں صلاحیت بھی نہیں۔لیکن ''پدرم سلطان بود'' اچھے معنوں میں لیا جائے تو میں کہوں گا کہ جو زبانیں ان ''اچھی زبانوں'' سے پیدا ہوئی ہیں وہ شاہ نہیں تو شہزادیاں ضرور ہیں۔ شہزادی کو والدین، ایک باپ اور ایک ماں کا ہونا ضروری ہے۔خوش قسمت ہے وہ شہزادی جو نجیب الطرفین ہو۔باپ بھی کہیں کا سلطان اور ماں بھی کہیں کی حکمران رہی

ہو۔اردو کی ماں سنسکرت اور باپ عربی سمجھے جاسکتے ہیں۔

زبانی پیام رسانی:

اللہ کا پیام انسانوں تک کسی نہ کسی زبان کے ذریعے سے پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں ایک مشہور حدیث یاد آتی ہے"ایک دن پیغمبر اسلام علیہ السلام نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: حضرت عیسیٰ نے مختلف ملکوں میں تبلیغ دین چاہی تو اپنے حواریوں میں ایک ایک کو ایک ایک ملک کے لیے نامزد کیا۔ یہ حواری ہچکچائے کہ ہمیں وہاں کی زبان نہیں آتی ۔حضرت عیسیٰ نے اللہ سے دعا کی اور ہر حواری اپنی منزل مقصود کی زبان معجزانہ طور پر سیکھ کر خود بخود بولنے لگ گیا[۱]۔میں بھی تم میں سے چند لوگوں کو مختلف ممالک میں بھیجنے کے لیے چنوں گا۔تم حواریوں کی طرح نہ ہچکچاؤ اور نہ انکار کرو ۔اس کے بعد رسول اکرمؐ نے چند صحابہ کو نامزد فرمایا کہ کوئی آپ کا نامہ قیصر روم کے ہاں لے جائے ،کوئی کسرائے ایران کے ہاں، کوئی نجاشی حبش کے ہاں وغیرہ (طبقات ابن سعد وغیرہ میں اس کا ذکر ہے)

وحی تو ایک زبان میں، پیغمبر کی مادری زبان میں ہوتی ہے لیکن اس کی تبلیغ کے لیے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے ،کیونکہ دنیا کے سارے لوگ ایک زبان نہیں بولتے ۔قرآن مجید کے سورۃ روم میں (سورۃ ۳۰،آیت ۲۲) ٹھیک یاد دلایا گیا ہے "......اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا فرق بے شک اہل علم کے لیے اس میں (بھی خدا کے کمالات کی) نشانیاں پائی جاتی ہیں" ایک اور آیت ہے (سورۃ ابراہیم یعنی سورۃ ۱۴، آیت ۴) "اور ہم نے کوئی رسول بھیجا تو اس کو قوم کی زبان ہی میں تاکہ وہ ان لوگوں کو (خدا کے احکام) اچھی طرح بیان کر سکے ......" غرض تنزیل ایک زبان میں ہوتی ہے اور اس کی تبلیغ مختلف زبانوں میں کرنی پڑتی ہے۔

سیرت نبوی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جیسا مخاطب ہوتا ، رسول اکرم اس

سے اسی کی زبان میں بات کرتے ۔آپ نے نبوت سے پہلے کافی سفر فرمایا تھا۔دو بار بیزنطینی (یونانی) فلسطین تشریف لے گئے تھے ۔مسند احمد بن حنبل کے مطابق ایک بار قبیلہ عبدالقیس کے علاقے (یعنی ایرانی مسقط وعمان) کو،اور نجاشی کے نام مکتوب نبوی کے انداز بیان سے گمان ہوتا ہے کہ اس سے آپ کی شخصی واقفیت تھی ،گویا ایک بار حبش بھی تشریف لے گئے ہوں گے ۔کئی بار حباشہ (یمن) بھی جانے کا ذکر ملتا ہے۔ حدیث میں رسول اکرمؐ کی زبان سے چند حبشی اور چند فارسی الفاظ بھی سنے جانے کا بیان ہوئے ہیں،لیکن زیر بحث حدیث کو زیادہ تر اس معنے میں لینا چاہیے کہ عرب کی مختلف مقامی بولیوں سے آپ کو اچھی واقفیت تھی ۔زبانوں کا سیکھنا پیغمبر پر واجب نہیں ہوتا لیکن تبلیغ کا انتظام کرنا اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

کتب سیرت میں صراحت ہے کہ دربار نبوی میں مختلف زبانیں جاننے والے صحابہ موجود تھے۔ فارسی، حبشی، قبرسی، رومی، عبرانی، وغیرہ مختلف زبانوں کا اس سلسلے میں ذکر ہے۔حتیٰ کہ قرآن مجید کے جزئی ترجمے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ شمس الائمہ سرخسی جو حنفی فقہ کے سب سے بڑے ماہروں میں سے ہیں اور جن کو امام ابو حنیفہ اوران کے دونوں شاگردوں (امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی) کے بعد ہی تیسرے نمبر پر جگہ دی جاتی ہے،اپنی کتاب المبسوط میں نماز کے باب میں ایک واقعہ لکھتے ہیں: ''امام ابو حنیفہ کا خیال تھا (جس سے بعد میں انہوں نے رجوع کرلیا) کہ نماز میں قرآن مجید کا فارسی ترجمہ پڑھنا جائز ہے اور انہوں نے استدلال اس واقعے سے کیا تھا کہ حضرت سلمان فارسیؓ سے جب چند نو مسلم ایرانیوں نے خواہش کی تو حضرت سلمانؓ نے سورۃ فاتحہ کا ترجمہ فارسی میں کیا اور (رسول اکرمﷺ کی اجازت سے) وہ ان لوگوں کو بھیجا۔ اسے وہ لوگ اس وقت تک نماز میں پڑھتے رہے تا آنکہ ان کی زبانیں عربی متن سے (حفظ کے ذریعے سے) مانوس نہ ہوگئیں''۔ گویا نو مسلم کو ابتدائی چند گھنٹے یا چند دن، عربی دعائیں اور عبارتیں حفظ ہونے تک، اپنی زبان میں عبادت

کرنے کی اجازت ہے۔

اس واقعے ہی کا نتیجہ ہوگا کہ ہر ملک میں ہر زمانے میں قرآن مجید کے ترجمے ہوتے رہے تا کہ خدا کے کلام اور خدا کے احکام سے وہ انسان بھی استفادہ کرسکیں جن کی زبان کو وحی کی حامل و محافظ بننے کا شرف حاصل نہ ہو سکا اور آج مسلمان کی نااہلی اور تقصیر کے باوجود ایک سو سے زیادہ زبانوں میں قرآن مجید کا کامل یا جزئی ترجمہ موجود ہے اور بڑی زبانوں میں ایک سے زائد لوگوں نے ترجمے کئے ہیں اور کئے جارہے ہیں۔ اردو، ترکی اور فارسی میں سے ہر ایک میں ایک ایک سو سے زائد ترجموں کا مجھے پتہ چلا ہے۔ اس کی تفصیل کا موقع الگ ہوگا۔

قرآن مجید کا سب سے پہلا حکم:

رسول اکرم ﷺ امی تھے۔ لکھنا پڑھنا سیکھنے کا بچپن میں کوئی موقع نہ ملا تھا۔ اس کے باوجود کتنا ولولہ انگیز واقعہ ہے کہ سب سے پہلی وحی، سب سے پہلا خدائی پیغام جو آپ اپنی امت کو پہنچاتے ہیں وہ لکھنے پڑھنے کے حکم اور اس بیان پر مشتمل ہوتا ہے کہ سارا انسانی تمدن قلم کا رہین منت ہے کہ قلم ہی سے انسان وہ سیکھتا ہے جو اسے معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ سورۃ قلم (سورہ ۹۶، آیت ۱ تا ۵) میں جو اولین وحی سے عبارت ہے، یوں ارشاد ہوا ہے۔

''پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے (ہر چیز) پیدا کی، جس نے انسان کو ایک جمع ہوئے قطرہ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ، اور یہ تیرا نہایت محترم و فیاض پروردگار ہی ہے جس نے قلم کے ذریعے سے سکھایا۔ جس نے انسان کو وہ چیز سکھائی جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

اس حکم کی تعمیل جس جوش و خروش سے کی گئی اس کی ایک اثر انداز مثال یہ ہے کہ جنگ بدر میں جب دشمن کے بہت سے آدمی قید ہوئے تو رسول اکرمؐ نے ان

میں سے پڑھے لکھے لوگوں کا فدیہ رہائی یہ مقرر کیا کہ ہر ایسا شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ دوسرے قیدیوں کو چار چار ہزار درہم (روپے) کی خطیر رقم ادا کرنی پڑی۔ اس کے نتائج پر مورخ ششدر رہ جاتا ہے کہ کیونکہ قرآن مجید عربی زبان کی پہلی کتاب ہے (اس سے پہلے اس زبان میں کوئی کتاب لکھی نہ گئی تھی کہ وہ ان پڑھ لوگوں کی زبان تھی) اور اس پر بہ مشکل دو سال گزرے تھے کہ عربی زبان نہ صرف دنیا کی متمول ترین علمی زبانوں میں سے ایک ہوگئی بلکہ اس کے کچھ ہی بعد بین المما لک علمی زبان بن گئی اور مشرق ہی نہیں سارے یورپ سے طلبہ اسلامی درسگاہوں میں آتے اور (اندلس واٹلی) میں ہر علم وفن خاص کر طب، ہیئت، ریاضی وغیرہ کی تعلیم پاتے۔

قرآن کا اثر مسلمانوں کی علمی ترقی پر:

قرآن ہی نے ان پڑھ امی لوگوں کو حکم دیا کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر وہ تمام علوم حاصل کریں جو وہ نہیں جانتے ہیں۔ ان ابتدائی مسلمانوں کے پاس سوائے قرآن مجید کے اور تھا بھی کیا جس کی وہ تعلیم حاصل کرتے؟ وہ قرآن ہی کا غور وخوض سے مطالعہ کرتے رہے۔ اس نے ناگزیر سب سے پہلے علم تفسیر پیدا کیا۔ لیکن قرآن کی تفسیر کرنے کے لئے سیکڑوں علموں کی ضرورت تھی اور خواہی نخواہی ان علوم کو بھی پیدا کرنا پڑا۔ قرآنی الفاظ نے علم لغت، قرآنی زبان نے صرف نحو اور بلاغت، قرآن کے تاریخی اشاروں نے علم تاریخ، قرآن کے جغرافی اشاروں نے مبادیات جغرافیہ، قرآن کے احکام نے فقہ (قانون) عقائد اور علم کلام وعلی ھذا القیاس، پھر ذیلی ضرورتیں پیدا ہوئیں۔ قرآن نے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا تو اوقات نماز وروزہ نے علم ہیئت کو ترقی دینے پر مجبور کیا تاکہ صحیح وقت پر نماز پڑھیں اور سحری وافطار کریں۔ قرآن نے نماز کے سلسلے میں حکم دیا کہ دنیا میں جہاں بھی رہو کعبے کی طرف منہ کرو۔ اس نے جغرافیہ اور علم ہیئت کو مزید ترقی دی۔ حج فرض کیا تو مکہ جانے کے راستے معلوم کرنے پڑے، جس سے

جغرافیہ کی روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ زکوۃ (ٹیکس) فرض کیا تو ادا طلب رقم کے لئے حساب سیکھنا پڑا۔ تقسیم ترکہ کے لئے بھی حساب کی ضرورت ہوئی۔ قرآن کو فنی نقطہ نظر سے صحیح پڑھنے کے لئے تجوید کی ضروت پڑی جو علم موسقی کی ایک شاخ ہے۔ قرآن کو صحیح پڑھنے کے لئے عربی خطاطی اور خط میں نقاط و اعراب کو ترقی دینی پڑی۔ ادب اور احترام کا تقاضہ تھا کہ قرآن خوبصورت ہو۔ اس نے جلد سازی، تذہیب اور دیگر آرائشی فنون پیدا کئے اور اس میں قطعی کوئی مبالغہ نہیں کہ مسلمانوں میں دنیوی اور دینی سارے علوم کا آغاز قرآن کے باعث ہوا اور پھر یہ علوم رفتہ رفتہ مستقل علم بنتے چلے گئے۔ تاریخ قدیم کا بھی مطالعہ ہوا، تقابلی ادیان کا بھی، لغوی شواہد کے لئے پرانی عربی شاعری کا بھی اور دیگر ان گنت علوم وفنون کا بھی۔

جب مسلمانوں میں ہر جہتی علمی ترقی ہوئی تو جو بھی غیر عرب مسلمان ہوتا یا اسلامی درسگاہوں میں شریک ہوتا وہ ان علوم کو سیکھنے کے بعد اپنی مادری زبان میں ان کو مکرر لکھ بھی سکتا اور پھیلا بھی سکتا اور اس طرح مسلمان بالواسطہ ساری انسانیت کی علمی سطح بلند کرنے کا باعث بنے۔ وہ کیا باعث بنے، اصل میں قرآن اس کا باعث تھا۔

بعض لطیفے بھی پیش آتے رہے۔ چند سال قبل ایک انگریز ڈاکٹر نے صرف اس بنا پر اسلام قبول کیا کہ قرآن میں نطفے کی بہ تدریج ترقی اور جنین کی پیدائش کا جو صحیح اور تفصیلی ذکر ہے وہ خود پرانے یونان کے شہرہ آفاق طبیبوں کو معلوم نہ تھا۔ ایسی نامعلوم چیز اب سے چودہ سو برس پہلے کے ایک اُمی عرب نے بیان کی تو وہ خدا کا پیغمبر ہی ہوسکتا ہے۔ خود پاریس کے ایک ڈاکٹر نے جو ابھی زندہ ہے، یہ بیان شائع کیا ہے کہ اس کا آبائی مذہب (کیتھلک) گندہ رہنے کو خشوع وخضوع اور تواضع قرار دیتا ہے، اس کے برخلاف اسلام صفائی اور طہارت کو ''آدھا دین'' قرار دیتا ہے جو طبی نقطہ نظر سے بالکل صحیح اور معقول ہے۔

یہی نہیں، قرآن اسلام اور مسلمانوں کی بقا کا باعث بنا۔ ملکوں کی فتح آسان

چیز ہے۔ فتح کو برقرار رکھنا ہزار گنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اگر چہ اسلامی فتوح بھی، جو قرآنی تعلیم کے زیر اثر مسلمانوں نے کیں، تاریخ میں لاثانی ہیں (رسول اکرم ﷺ کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عثمان کے زمانے میں مسلمان فوجیں ایک طرف اندلس (یورپ) میں پہنچ گئیں تو دوسری طرف ماوراالنہر میں چین کے اندر گھس گئیں۔ جنوب میں مغربی ہند اور مغربی پاکستان کے ساحلی رقبے بھی ان کے زیر اقتدار آ گئے اور تین براعظموں، ایشیا، یورپ اور افریقہ پر وہ حکومت کرنے لگے)۔ لیکن اس سے بڑھ کر حیرت اس پر ہوتی ہے کہ مفتوحوں نے ان مسلمان فاتحوں کا ظالموں نہیں بلکہ نجات دہندہ کی حیثیت سے استقبال کیا اور ان کی حکومت اتنی دیر پا رہی کہ اندلس کو چھوڑ کر یہ سارے علاقے عملاً آج بھی مسلمان ہی ہیں۔ پائدار اور پرامن حکومت کرنے کے لئے صرف فوج کافی نہیں ہوتی، قانون اور نظم ونسق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے اپنا سارا قانون (دستوری، دیوانی، فوجداری، قانون بین الممالک، تجارت، غیر مسلم سے رعیت سے برتاؤ کے قواعد وغیرہ وغیرہ) سارے ہی قواعد وقوانین قرآن سے نکالے اور ایسے نکالے کہ وہ قانون روما سے بھی زیادہ منصفانہ اور متمدن تسلیم کئے گئے اور اب مغرب میں یہ مسلم ہوگیا ہے کہ اسلامی قانون کی پیدائش وترقی پر رومی قانون کا کوئی اثر نہیں پڑا (جیسا کہ اٹلی کے پروفیسر نالیند اور فرانس کے پروفیسر بوسکے نے صراحت سے لکھا ہے) ان کی جنگوں کے متعلق کیمبرج کے پروفیسر واکر نے تاریخ قانون بین الممالک میں لکھا ہے کہ ''ابتدائی مسلمانوں سے پہلے آج تک تاریخ نے یہ کبھی نہ دیکھا تھا کہ وحشی فاتح اپنے متمدن مفتوحوں سے زیادہ متمدن ہوں''۔ قرآن نے مذہبی رواداری کو ترقی دی، اسلام نے علوم فنون میں، تجارت وصنعت میں، غرض ہر شعبہ حیات میں انسانیت کی جو خدمت کی اس پر مسلمانوں کو کسی کے سامنے شرمانے کی ضرورت نہیں۔

اس قرآن سے اردو ترجمے کے ذریعے سے ہم بھی عربی نہ جاننے کے

باوجود استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس ضرورت کو ہمارے اجداد نے صدیوں قبل محسوس کیا۔
جب سے اردو پیدا ہوئی، اردو میں اور دینی و دنیوی علوم کے ساتھ قرآن کے ترجمے
اور تفسیریں بھی لکھی جانے لگی اور ان کا سلسلہ ختم ہونے کے اب بھی کوئی آثار نہیں۔
مجھے چند ایک زبانوں سے واقفیت ہے اس لئے تقابلی مطالعے کے بعد میں پورے
اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو تراجم قرآن، دنیا کے بہترین تراجم کی صف اول میں
ہیں۔ ترجمے کی صحت میں شاہ عبدالقادر، زبان کی سلاست میں ابوالاعلیٰ مودودی قابل
ذکر ہیں۔ اسرار و غوامض کی بلند پایہ اور دل کو لگتی ہوئی تشریحوں کی بھی اردو تفسیروں
میں کمی نہیں حق تو یہ ہے کہ اعلیٰ ترین یورپی مستشرقوں کے تراجم قرآن بھی اردو کے
اچھے تراجم کے سامنے گرد ہیں۔ ایک اور بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ ایک ہی کام اگر
مختلف زمانے میں بار بار ہوتا رہے تو تقابل کرنا اور ارتقا کا مطالعہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔
قرآن مجید کے اردو تراجم اس کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اب ایک سو سے زائد اردو ترجمے
موجود ہیں اور کئی سو سال میں پیدا ہوئے ہیں۔ اردو کے ارتقا کا بھی مطالعہ کرنے کے
لئے اس سے بہتر کوئی اور مواد میرے علم میں نہیں ہے۔

شمشیر یا قلم؟

تاریخ بتاتی ہے تلوار ہمیشہ کام نہیں دیتی اور نہ حق کو ہمیشہ فتح ہونی ضروری
ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی جب اجمیر آئے تو نہ ان کے پاس شمشیر تھی اور نہ شمشیر زن
نہ محافظ و معاون۔ ہمالیہ تلے کے براعظم میں آج جو پندرہ بیس کروڑ مسلمان ہیں وہ
محمود غزنوی یا تیمور کے باعث نہیں، خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے ہم مسلک
درویشوں کا صدقہ ہیں۔ ان صوفیہ کرام نے ان پتھر کے دلوں کو موہ لیا جنہیں نہ تلوار
ڈرا سکتی تھی اور نہ پیسہ رام کر سکتا تھا۔ یہ تو ہمارے ملک کی بات ہے۔ ایک ہمسایوں کا
بھی قصہ یاد دلاؤں۔ ہلاکو خان نے باجبروت خلافت عباسیہ کے دارالخلافت بغداد کو

اس طرح زیر کیا کہ گویا وہ محض ہوا بھرا ہوا لفافہ ہو۔ سارے ترکستان و ایران کو تباہ و برباد کرتے ہوئے اس کی جبار و قہار فوجیں کچھ اس طرح زمین کو روند رہی تھیں کہ اس کا کوئی انسانی علاج مسلمانوں کے پاس نہ تھا۔ اس وقت چند درویش اٹھے اور ہلاکو کے پوتے کا زمانہ تھا کہ یہ سارے تاتاری مسلمان ہونے پر فخر کرنے لگے اور پھر صدیوں تک مسلمانوں کے فوجی محافظ بنے رہے۔

ان صوفیہ کو جو کامیابی ہوئی اس کا پہلا وسیلہ یہ تھا کہ وہ اپنے محافظوں سے ان کی اپنی زبان میں اسلام کی دلپذیر باتیں کرتے تھے۔ بزرگ بن شہریار کے مشہور سفرنامہ ''عجائب الہند'' میں لکھا ہے کہ ۲۷۰ھ کے لگ بھگ (ملتان، کشمیر یا سندھ کے) کسی راجہ کی فرمائش پر قرآن مجید کا کامل ترجمہ وتفسیر لکھی گئی اور راجہ مسلمان ہوگیا۔ یہ زبانیں اردو کی جدات تھیں۔ آج یورپ اور امریکہ کو ہم نہ اپنے علم سے مرعوب کر سکتے ہیں اور نہ ہماری کمانوں کے تکلوں سے۔ اس کے باوجود ہر روز کثرت سے فرنگی مسلمان ہو رہے ہیں۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، سوئٹزر لینڈ، ہالینڈ، بیلجیم، ڈنمارک، شمالی وجنوبی امریکہ کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے پتہ چلایا کہ ان کا ننانوے فی صد حصہ تصوف اور صوفیہ کی تعلیم کے باعث اسلام قبول کر رہا ہے، عقل پرستوں کی لایعنی تفسیروں اور تحریروں کے باعث نہیں۔ مسلمان صوفیہ کی چیزیں اب آہستہ آہستہ فرنگی زبانوں میں ترجمہ یا تالیف ہو رہی ہیں۔ میں خود عقلیت کا دلدادہ تھا۔ یہاں آ کر اپنی ہار ماننی پڑی۔ اسلام دل کے راستے سے ہی پھیل سکتا ہے۔ دل را بدل رہیست ۔ دل کی زبان میں جو تاثیر ہے، جو سحر ہے، وہ کسی اور چیز میں نہیں۔ یہ کام اردو علاقے کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے بھی اتنا ہی واجب اور اتنا ہی مفید ہے جتنا تجربے نے دوسری زبانوں کے متعلق ثابت کیا ہے۔ ہم جس کی نقالی کرنا چاہتے ہیں وہ خود اپنے آپ سے اب بیزار ہوگیا ہے۔

(مطبوعہ: جشن نامہ، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، دسمبر ۱۹۷۲ء)

روزہ کیوں؟

تمہید:

قدیم زمانے کے سارے تمدنوں اور سارے مذاہب نے اپنے ماننے والوں پر ہر سال چند دن روزے فرض کئے ہیں۔ ایسا کیوں کیا گیا؟ کیا یہ صرف ایک توہم ہے یا اس میں کچھ فائدہ بھی ہے؟ ہم اب ایک ایسے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جبکہ ہر شہری خواہ غریب ہو یا امیر علم حاصل کر سکتا ہے اور ہماری حکومتیں ہم کو مجبور نہیں کرتیں کہ ہم اپنے روحانی فرائض بجالائیں اس لئے اب یہ معلوم کرنا مناسب ہوگا کہ روزہ رکھنے کا یہ قدیم فرض اب بھی لوگوں کے لئے مفید ہے یا نہیں؟ اس پر غور کرنا خاص طور پر مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کیونکہ نہ صرف عقل اس کی ضرورت محسوس کرتی ہے بلکہ قرآن بھی جو اسلام کی بنیاد ہے، اس کا حکم دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے کوئی روحانی فریضہ ایسا نہیں عائد کیا ہے جس میں عقل سے اپیل نہ کی گئی ہو کہ غور کرو، سوچو اور سمجھنے کی کوشش کرو تا کہ یہ یقین حاصل ہو جائے کہ اس حکم کے بجالانے سے ہمارا ہی فائدہ ہے۔ بار بار قرآن تنبیہ کرتا ہے کہ باپ دادا کی اندھی تقلید نہ کریں بلکہ آزادانہ طور پر غور کریں تا کہ ہم انفرادی اور شخصی طور پر اس قابل ہو سکیں کہ ہمارے اعمال کے ذمہ دار ہوں۔ آدمی کو چاہیے کہ جانوروں کی طرح جو دل میں آئے نہ کرے بلکہ عقل اور سمجھ سے بھی کام لے جو اللہ نے اس کو عطا کئے ہیں۔

جانوروں کو یہ چیزیں اللہ نے عطا نہیں کی ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ کسی مذہبی کام کو ناقابل فہم اسرار قرار دے کر عقل کو علیحدہ چیز اور مذہب کو علیحدہ چیز نہ بنالے اور صرف اعتقاد کی خاطر کسی چیز کا اعتقاد نہ رکھے بلکہ جو اعتقاد رکھے اس کے متعلق پوری طرح مطمئن ہو جائے کہ یہ اعتقاد صحیح ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لوگوں کے مزاج اور طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اور تمام لوگ ایک ہی چیز کی طلب نہیں رکھتے۔ دنیا دار معاملہ فہم لوگ کسی کام کرنے سے پہلے اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس کام میں ان کو کوئی مادی نفع ہوگا یا نہیں۔ ایک مقدس راہب، عابد یا جوگی کسی دنیا دار کے برخلاف، صرف روحانی فائدے اور آخرت کی نجات تلاش کرتا ہے اور دنیاوی فائدوں کو کسی کے جبر اور دباؤ کے بغیر اپنی خوشی سے چھوڑ دیتا ہے۔ خالص دنیا دار اور خالص تارک الدنیا دونوں قسم کے انتہا پسندوں کی تعداد بالکل محدود ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں انسانوں کی بہت زیادہ غالب اکثریت یہ چاہتی ہے کہ آخرت میں اور موجودہ دینوی زندگی میں دونوں جگہ اچھے رہیں۔ اسلام کا امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور قرآن (۲۔۱۔۲) ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے جو اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ ''ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخراۃِ حسنة'' اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر''۔ یہ ہے وہ مطمعِ نظر جو اسلام پیش کرتا ہے۔ چونکہ روزہ بھی اسی قرآن کے ذریعہ سے فرض کیا گیا ہے۔ پس ہمارے لئے یہ مناسب ہوگا کہ یہ معلوم کریں کہ روزے میں دنیا کی بھلائی کیا ہے اور آخرت کی بھلائی کیا ہے؟ خاص کر اس لئے بھی کہ انسان صرف جسم سے نہیں بنا ہے اور صرف روح سے بھی نہیں بلکہ بہ یک وقت دونوں سے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کی طلب میں مشغول ہو جائیں اور دوسرے سے غفلت کریں تو توازن باقی نہیں رہتا حالانکہ انسان کا بہترین مفاد اس امر میں ہے کہ جسم اور روح دونوں کو متوازن ترقی دے اور دونوں کی

ضرورتیں اس طرح پوری کرے کہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہو۔ اگر ہم پوری طرح سے صرف روح کے فائدے کے لئے کام کریں۔ تو ہم فرشتہ بن جائیں گے بلکہ فرشتوں سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔ لیکن اللہ فرشتوں کو پیدا کر چکا ہے اور اللہ کو ضرورت نہیں کہ ان کی تعداد میں اور اضافہ کرے۔ اسی طرح اگر ہماری پوری قوت مادی بھلائی اور خودغرضانہ ذاتی مفاد میں صرف ہوتو ہم درندے اور شیطان بن سکتے۔ بلکہ ان سے بھی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اللہ نے اس مقصد کے لئے دوسری مخلوقات پیدا کی ہیں۔ اگر ہم درندہ اور شیطان بن جائیں تو انسان کی پیدائش کی جو غرض ہے وہ پوری نہ کرسکیں گے۔ انسان کو روحانی کمال اور مادی کمال دونوں کے اکتساب کی قوتیں عطا کی گئی ہیں۔ اور عقل سمجھ بھی دی گئی ہے تاکہ بھلائی اور برائی کے درمیان امتیاز کریں اور معلوم کریں کہ کونسی چیز بری ہے اور کونسی چیز اچھی ہے پس انسان کو چاہیے کہ اللہ نے اس کو جو قابلیتیں عطا کی ہیں۔ ان کوترقی دے اور ہرایک قابلیت کے درمیان توازن قائم رکھے۔

روزے کے اندر جو باتیں چھپی ہوئی ہیں ان کو معلوم کرنے کی کوشش کرنے سے پہلے ہم قرآن شریف کی وہ آیتیں دیکھیں جن میں روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

روزہ اور قرآن:

روزے کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے۔

یاایھا الذین امنو اکتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم ....(الایۃ) (سورۃ ۲ آیت ۱۸۳ تا ۱۸۵)

''اے ایمان والوں! روزہ تم پر فرض کیا گیا ہے جس طرح سے ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ شائد کہ تم متقی بنو۔ اور یہ گنتی کے چند دن کے لئے ہے، اور تم میں جو بیمار ہے یا سفر میں ہے تو وہ اتنے ہی دن دوسرے زمانے

میں روزہ رکھے اور جو لوگ (سفر یا بیماری کے باوجود) اس کی طاقت رکھتے ہیں (اور روزہ نہیں رکھتے) تو وہ فدیہ دیں یعنی ایک مسکین کو کھانا کھلائیں اور جو شخص اپنی خوشی سے نیک کام کرے تو اس کے لئے ہی بہتر ہے اور یہ کہ تمہار روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر تم جانتے ...... رمضان کے مہینے میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور ہدایت کا واضح ثبوت ہے اور (صحیح اور غلط کے درمیان) امتیاز کرنے والا ہے۔ تم میں جو شخص اسے پائے تو اس کو چاہیے کہ وہ (پورا) مہینہ روزے رکھے۔ اور تم میں جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اس کو چاہیے کہ اتنے ہی دن دوسرے زمانے میں روزہ رکھے اللہ تم پر آسانی کا ارادہ رکھتا ہے، وہ تم پر سختی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا اور چاہیے کہ تم اس مدت کو پورا کرو اور اللہ کی بڑائی کرو کیونکہ اس نے تم کو ہدایت دی اس طرح شائد تم شکر گزر بن سکو گے۔

(قرآن سورہ ۲۔ آیت ۱۸۳ تا ۱۸۵)

اس آیت کے شروع میں ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ دوسرے مذہبوں میں بھی روزہ پایا جاتا ہے۔ ہم کو دیکھنا چاہیے کہ دوسرے مذہب اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں البتہ ایک بات شروع ہی سے واضح کردیں کہ اسلامی روزے میں فجر (یعنی طلوعِ آفتاب سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ قبل) سے لے کر غروبِ آفتاب تک ہر قسم کا کھانا، پینا، چٹا، سگریٹ پینا، ٹیکہ یا انجکشن لینا حرام ہوتا ہے۔ برے خیالات کو بھی روکنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔ بھول چوک البتہ معاف ہے اور خدا سے کوئی چیز ہم چھپا نہیں سکتے۔

روزہ دوسرے مذہبوں میں:

اسلام کا عویٰ ہے کہ وہ وہی الہامی مذہب ہے جو بار بار ایک کے بعد دوسرے آنے والے پیغمبروں کے ذریعے سے انسان کو بتلایا گیا۔ اسلام کا سب سے

زیادہ اہم فرض یہ ہے کہ اس ابدی صداقت کو دوبارہ زندہ کرے اور ان تبدیلیوں سے پاک کرے جو پرانے پیغمبروں کے جانے کے بعد ان کے پیروؤں نے من مانے پیدا کر دیں۔

صابی مذہب:

ابراہیم علیہ اسلام عراق کے صابی مذہب کے لئے بحیثیت پیغمبر بھیجے گئے۔ حران کے صابی (۳۰) دن سالانہ روزہ رکھتے تھے اور روزے میں صبح صادق سے آفتاب غروب ہونے تک کچھ کھاتے پیتے نہ تھے، اور یہ چاند کے اعزاز کے لئے ہوتا تھا جس کی وہ پوجا کرتے تھے۔

(CF. Encyclopadia of Religions and Ethies, Vol, V P 764 under "HARRONIAUD'' CITING CHWOLSON; DIESSABIERUND DER SSABISMUS 11711, 2261

قرآن (سورہ ۴۱ آیت ۳۷) نے حکم دیا ہے کہ نہ تو سورج کی اور نہ چاند کی پرستش کریں بلکہ اس خدائے واحد کی عبادت کریں جس نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے اور کامل ایک مہینے کے روزہ فرض کیا ہے جو مذہب حنیف یعنی پیغمبر ابراہیم کے اصلی مذہب کو زندہ کرتا ہے۔

یہودی مذہب:

یہودیوں میں جو متقی اور پرہیزگار لوگ ہیں وہ ہر جمعرات اور پیر کو روزہ رکھتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ موسیٰ طور سینا پر جمعرات کے دن گئے اور پورے چالیس دن بعد پیر کو واپس آئے۔ **(CF-ENCYDL. REL. ETHIES v 765)**

اسلام نے بھی ان دنوں کے روزہ کو نفل اور اچھا کام قرار دیا ہے (لیکن ہر

شخص پر فرض نہیں کیا ہے) اس کے علاوہ یہودی ۲۴ گھنٹوں کا روزہ دس ماہ تھشری (Tishri) کو فرعون سے نجات پانے کی یادگار میں بطور کفارہ (پراشچیت) رکھتے ہیں۔ ۱۰، محرم کا روزہ جس کو مسلمان عاشورہ کہتے ہیں وہ مکہ معظمہ میں زمانہ جاہلیت میں بھی تھا اور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بطور نفل اسے برقرار رکھا۔ (اس کا تعلق حضرت امام حسینؓ کی شہادت سے بالکل نہیں) یقیناً ۲۴ گھنٹے کا روزہ بڑی سختی ہے۔ اسلام میں اعتدال پیدا کیا گیا۔ صبح صادق سے آفتاب کے غروب ہونے تک تا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد روزہ رکھ سکے، اس طرح نظر آئے گا کہ یہودیوں کا صحیح مذہب بھی اسلام میں ضمناً برقرار ہے۔

عیسائی مذہب:

ابتدائی زمانے کے عیسائی چھ ہفتے روزہ رکھتے تھے لیکن اتوار کا دن اس سے مستثنیٰ تھا، اتوار کے دن روزہ نہیں رکھتے تھے۔ آغاز ایک چہار شنبہ سے ہوتا ہے اور اختتام اتوار پر یعنی LENT کا روزہ۔ اس لحاظ سے وہ (۳۴) دن روزہ رکھتے تھے اور یہ روزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحرا میں پناہ گزینی کے زمانے کی یادگار میں تھا۔ (CF-THE SAME ENDYEL-REL-ETH V 769) اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ (۳۴) دن پورے سال کا دسواں حصہ ہیں) مذہبی ٹیکس کے طور پر وہ جائیداد کا دسواں حصہ TITHE ادا کرتے تھے اور اپنے کھانے اور پینے پر بھی خدا کے نام پر اتنا ہی مذہبی ٹیکس لگانا چاہا یعنی اتنے دن نہ کھائیں نہ پئیں بلکہ خدا کے لیے بھوکے پیاسے رہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ جو شخص رمضان کا پورا مہینہ روزہ رکھے اور اس کے ساتھ اس کے بعد کے مہینے شوال میں بھی چھ روزے رکھے تو ایسا ہے گویا کہ اس نے سال بھر روزہ رکھا۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ)

ایک اور حدیث ہے...... ہر چیز پر ٹیکس ہے بدن کا ٹیکس روزہ ہے (جیسا کہ

سنن ابن ماجہ میں مروی ہے) قرآن سورۃ ٦ آیت ١٦١ کا کہنا ہے کہ ''جو شخص ایک نیکی کرتا ہے تو اس کو اس سے دس گنا زیادہ ثواب دیا جاتا ہے۔'' چاند کا مہینہ کبھی (٢٩) کا کبھی (٣٠) دن کا ہوتا ہے اور چاند کا سال تقریباً ٣٥٥ دن کا ہوتا ہے۔ اگر ہم کسی سال رمضان کے ٢٩ اور شوال کے چھ جملہ (٣٥) روزے رکھیں اور دوسرے سال رمضان کے ٣٠ اور شوال کے چھ جملہ (٣٦) روزے رکھیں تو دس گنا اضافہ ٣٥٠ اور ٣٦٠ دن ہوتا ہے اور اوسط ٣٥٥ جو مسلمانوں کے چاند کے سال کے پورے دن ہوتے ہیں لیکن عیسائی مذہب میں پورا سال نہیں ہوتا کیونکہ وہ اب اپنی جنتری میں شمسی سال کا حساب کرتے ہیں جو ہمیشہ ٣٦٥ دن سے زیادہ کا ہوتا ہے۔ عیسائی (٤٠) دن کی مدت میں (٢٤) دن روزہ رکھتے تھے۔ اس کا دس گنا (٤٠٠) یا (٣٤٠) ہوگا۔ (٣٦٥) کسی صورت سے نہیں۔ یہ وضاحت اس لیے کی گئی ہے کہ روزہ فی الحقیقت ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن میں بیان کیا گیا اور اسلام میں حضرت عیسیٰ کا روزہ بھی برقرار ہے۔ البتہ عیسائی اب اپنے روزے میں بھوک پیاس کے پابند نہیں کیونکہ پوپ نے انہیں روزے کے دوران میں صبح دوپہر شام تین مرتبہ کھانے کی اجازت دے کر یہ حکم دیا ہے کہ روزہ صرف خیالات کی حد تک رکھو۔

ہندو، بدھ اور دوسرے مذہبوں میں بھی روزہ رکھنے کا حکم ہے لیکن کسی مذہب کے لوگ اتنی بڑی تعداد میں روزہ نہیں رکھتے جتنا کہ مسلمان رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت روزہ رکھتی ہے، دنیا کے ہر ملک میں بے حساب مسلمان روزہ رکھتے ہیں (ماشاء اللہ) بہرحال یہ مسلم ہے کہ ہر دین میں روزے کا حکم رہا ہے اور قرآن نے بھی بیان کیا ہے۔

قرآن شریف کی اس آیت میں ایک اور عجیب بات یہ بیان کی گئی ہے کہ روزہ رکھو، شاید کہ تم متقی بنو، اس اسلوب میں یقین کے ساتھ نہیں بیان کیا گیا ہے بلکہ شک سا ہے یقین کے ساتھ کیوں نہیں بیان کیا گیا ''تم متقی بن جاؤ گے؟''

اصل میں یہ قرآن کے طرز بیان کی ایک خصوصیت ہے اور قرآن شریف میں بیسیوں مرتبہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ 'شاید کہ'' فلاں بات ہو سکے۔ اس سے کم ازکم دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) خدا کی قدرت وہ جو چاہے کرتا ہے اس کو ہر بات کی قدرت حاصل ہے اور مجبور نہیں ہے کہ ہماری عبادت سے بھی ہم کو وہ چیز عطا کرے جو ہم چاہتے ہیں۔ دینا یا نہ دینا بالکل اس کے اختیار اور مرضی پر منحصر ہے۔

(۲) انسان کا اختیار:

قرآن کے ذریعہ اللہ بیان فرماتا ہے مگر سیکھنا یا نہ سیکھنا انفرادی آدمی پر منحصر ہے۔ آیت مندرجہ بالا میں روزہ رکھنے سے متعلق جو حکم دیا گیا ہے اور جو دلیل پیش کی گئی ہے وہ بعض سننے والوں، بعض پڑھنے والوں کو خدا سے ڈرنے پر آمادہ کرتی ہے اور دوسرے لوگوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور وہ پہلے جیسے تھے ویسے ہی رہتے ہیں۔ اسی آیت کے آخر میں اللہ کا شکر کرنے سے متعلق 'شاید' کے لفظ کے ساتھ جو ذکر ہے، اس سے بھی کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں یہ کہ حقیقی شکر روزے کی صرف بیرونی شکل یعنی کھانے پینے سے رک جانے پر منحصر نہیں ہے بلکہ روزہ میں ریا اور دوسری برائیوں سے بھی رکنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح صرف روزہ ہی نہیں ہے جس سے اللہ ہم کو آزماتا ہے کہ ہم اس کا شکر کرتے ہیں یا نہیں بلکہ اور بھی احکام ہیں اور ان تمام کی بھی اچھی طرح سے تعمیل کرنی چاہیے تاکہ حقیقی طور پر اللہ کے شکر گزار بندے بنیں اور اللہ کا شکر کرنے کا جو فرض ہے وہ ادا کریں۔

اس آیت میں اور ایک اہم چیز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ قانونِ اسلام لوگوں کو سہولت بہم پہنچانے کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتا ہے۔ نہ صرف بیماروں کے لیے، بلکہ جو لوگ سفر میں ہوں ان کے لیے بھی رعایت ہے ایسے لوگوں کو رمضان میں روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ کسی دوسرے موزوں موقع پر وہ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے

روزے سے اللہ کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ صرف ہمارا ہی فائدہ ہے۔اگر کسی بیمار کو روزہ رکھنے کے لیے مجبور کریں تو وہ قبل از وقت نہ بھی مرجائے تو اس کی بیماری میں اضافہ ہو جائے گا۔اسلام سختی کرنے والا مذہب نہیں ہے بلکہ نرمی پسند ہے اسی لیے پیروان اسلام کی ایک بڑی تعداد اسلام کے احکام کی تعمیل کسی دوسرے مذہب کے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ کرتی ہے۔

روزے کے اقسام

بعض وقت روزہ ہر ایک بالغ پر، مرد ہو کہ عورت فرض ہے۔جیسے رمضان کے مہینے کے روزے۔بعض وقت صرف گناہ گاروں پر بطور کفارہ فرض ہے۔جیسے قسم توڑنے پر۔بعض وقت صرف نفل اور اپنی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔اگر کوئی شخص روزہ نہ رکھے تو اس کو گناہ نہیں ہوتا۔مثلاً شوال کے چھ دن کے روزے، ہر جمعرات اور پیر کے روزے۔ہر ماہ کامل چاند کے زمانے یعنی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کے روزے کہ وہ بھی مہینے کا دسواں حصہ ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض خاص موقعوں پر روزہ رکھنے سے منع بھی فرمایا ہے مثلاً دونوں سالانہ عیدوں کے دن (یکم شوال اور ۱۰، ذی الحجہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ مسلمان طول طویل عرصہ تک بطور نفلی روزہ نہ رکھیں۔اور یہ ارشاد فرمایا کہ تم کو اپنی ذات کا حق بھی ادا کرنا ہے۔ہماری ذات ہماری نہیں ہے بلکہ اللہ کی ملکیت ہے اور ہماری ذات ہمارے پاس بطور ایک امانت کے ہے اور ہم اس کی حفاظت اور نگہداشت کے ذمہ دار ہیں۔اس لیے حد سے زیادہ ریاضت اور تپسیا سے اس کو برباد یا نکما نہیں کر دینا چاہیے۔

عیسائیوں میں پادریوں اور عام آدمیوں میں امتیاز ہے پادری اور راہب

اب بھی ایک حد تک روزہ رکھتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا۔لیکن عام لوگ روزہ رکھنے سے بالکل مستثنیٰ ہیں کہ جو لوگ کام کرتے ہیں ان کو روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں خواہ وہ ایک طالب علم ہو یا استاد یا تاجر یا پیشہ ور یا مزدور۔یہودیوں میں شاذ و نادر مذہب کے کٹر ہی سالانہ روزہ رکھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کو ۲۴ گھنٹے روزہ رہنے کا حکم ہے۔ (اگرچہ وہ سال میں صرف ایک دن کے لیے فرض ہے)

روزے کا زمانہ

یہودی ،عیسائی اور ہندو یا تو خالص شمسی سال کا حساب کرتے ہیں یا قمری سال میں وقت بہ وقت کبیسہ **Intercalation** کر کے ایک مہینہ کا اضافہ کرتے ہیں تا کہ قمری سال کی مدت بھی اتنی ہی طویل ہوا کرے جتنی شمسی سال کی ہے اس لحاظ سے ان کے روزے ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتے ہیں۔مسلمان قمری سال کا حساب کرتے ہیں ان کی جنتری چاند کے مہینوں کے لحاظ سے ہوتی ہے جس میں کبیسہ **Intercalation** نہیں کیا جاتا۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزہ رکھنے کا مہینہ رمضان بتدریج باری باری سے سال کے ہر موسم میں آتا ہے۔

قمری سال کے مہینوں سے حساب کرنا بہتر ہے یا شمسی سال کے مہینوں سے؟ جس کرّہ زمین پر ہم بستے ہیں اس کا موسم ہر جگہ یکساں نہیں ہے لوگ ہر موسم کی شدت سے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔خواہ گرمی کی شدت ہو یا سردی کی۔اسی طرح کسی علاقہ کی گرمی اور سردی کے موسم محض اضافی امر ہیں۔مثلاً جاڑے کا موسم مکہ میں بڑا خوشگوار ہوتا ہے اور وہ قطبوں کے قریب (کناڈا،شمالی یورپ میں) ایسا نہیں ہوتا۔گرما قطب شمالی اور جنوبی کے قریب بہترین موسم ہے۔لیکن خط استواء کے پاس اور ریتیلے صحرا میں ایسا نہیں ہے۔موسمِ بہار ہر جگہ ایک متعدل موسم ہوسکتا ہے،لیکن خطِ استواء

کے قریب بہت سے ملکوں میں (مثلاً جنوبی ہندوستان میں) موسم بہار ہوتا ہی نہیں۔ یہاں کے لوگ موسم بہار جانتے ہی نہیں۔ اور ان ملکوں میں صرف تین موسم ہوتے ہیں۔ سردی، گرمی اور بارش۔ ایک ایسے مذہب کے لئے جو تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اگر ہم روزہ رکھنے کے لئے کوئی خاص موسم مقرر کردیں تو بعض لوگوں کے لئے مدامی طور پر آسانی ہوگی اور بعض لوگوں کے لئے مدامی سختی اور تکلیف یا کسی اور طرح زمین کے بعض علاقوں کے باشندوں کے لئے سہولت بخش نہ ہوگا۔ لیکن اگر روزہ رکھنے کے زمانے میں موسم باقاعدگی کے ساتھ بدلتے رہیں تو آسانی اور سختی باری باری سے آتے رہیں گے اور کوئی شخص روزہ کا قانون بنانے والے پر خفا نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ روزہ رکھنے کے لئے موسموں کی اس تبدیلی کا یہ مطلب بھی ہے کہ لوگ ہر قسم کے موسم میں روزہ رکھنے کے عادی ہوجائیں۔ اور یہ عادت کاٹ کھانے والے جاڑے میں اور جھلسانے والے گرما میں کھانے اور پینے سے رک جانے کی یہ قابلیت، مومن کو صبر کرنے کی قوت عطا کرتی ہے مثلاً جنگ کے محاصرہ کے وقت، غذا اور غلہ کے تاجروں اور آب رسانی کے عملے کی ہڑتال کے وقت جبکہ کھانا پانی مشکل سے ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں۔

مزید برآں جو لوگ اپنے وطن سے تھوڑی دور باہر گئے ہوں وہ جانتے ہیں موسم ہر جگہ ایک ہی وقت میں یکساں نہیں ہوتے۔ جنوری میں اس مضمون کو لکھتے وقت ریڈیو سے نشر ہو رہا ہے کہ پیرس کے بعض حصوں میں (-۴۰) ڈگری سنٹی گریڈ سردی ہے، اور اسی وقت (+۴۰) ڈگری گرمی ارجنٹائن میں۔ خط استوا کے اوپر اور نیچے موسم مختلف ہوتے ہیں۔ شمال نصف کرہ زمین پر جب سردی ہوتی ہے تو جنوبی نصف کرہ زمین پر گرمی۔ اگر اسلام نے یہ حکم دیا ہوتا کہ ہر سال مثلاً جنوری میں روزہ رکھا جائے تو بعض مسلمانوں یعنی خطِ استواء کے شمال والوں کے لئے خالص سردی کا موسم ہوتا اور بعض مسلمانوں یعنی خط استواء کے جنوب والوں کے لئے گرمی کا۔ یا اسلام نے اگر یہ حکم دیا ہوتا کہ مثلاً سردی میں روزہ رکھا جائے تو بعض لوگ جنوری میں روزہ

رکھتے اور دوسرے جولائی میں۔ اس لئے مستقل اور مدامی سختی ہوتی یا یکسانی باقی نہ رہتی۔ مثلاً کوئی شخص پیرس میں جنوری میں ۲۹ دن کا روزہ رکھے اور چند گھنٹے ہوائی جہاز میں سفر کر کے جنوبی افریقہ میں اتر جائے تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہو جائے گا کہ وہاں کی مسجد میں عید کی نماز کا انتظام نہ ہو رہا ہوگا۔ کیونکہ جنوبی افریقہ میں یہ روزہ رکھنے کا زمانہ ہی نہ ہوگا۔ مزید برآں یہ بھی ممکن ہوگا کہ میں روزہ رکھنے سے بڑی آسانی سے بچ جاؤں۔ مثلاً دسمبر کے ختم پر میں پیرس کو چھوڑ دوں اور ایک مہینہ جنوبی افریقہ میں گزار دوں (جہاں جنوری میں روزہ رکھنے کا مہینہ نہیں ہوگا) اور فروری کے مہینے میں میں پیرس سے واپس آ جاؤں تو پھر مجھے روزہ رکھنے کا مہینہ ملے گا ہی نہیں۔ جولائی کے مہینے میں بھی میں روزہ نہ رکھ سکوں گا کیونکہ یہ موسم جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ کے لوگوں کے لئے روزہ رکھنے کا موسم ہوگا، پیرس کے لوگوں کے لئے نہیں۔

دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہوا کہ دنیا میں پھیلا ہوا مذہب بغیر زحمت کے شمسی مہینوں کے حساب سے روزہ نہیں رکھ سکتا۔ شمسی مہینوں کے لحاظ سے روزہ رکھنا ان لوگوں کے لئے موزوں ہے جن کا مذہب صرف کسی ایک علاقہ میں پایا جاتا ہو، اگرچہ وہ ان فوائد سے بہرحال محروم رہ جائینگے جو روزے کو وقتاً فوقتاً الگ الگ موسموں میں رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح معلوم ہوگا کہ خالص قمری جنتری ہی انسانی سماج کے لئے مناسب تر ہے۔ کسی عالمگیر مذہب کے افراد کے لئے تو ان کے مسائل کا واحد حل اسی میں ہے۔ (زراعت کو چاند کے نہیں بلکہ موسم کے تابع رکھنے میں کوئی دشواری نہیں۔ زرعی جنتری ہر ملک کی الگ ہوتی ہے اور ہر ملک کے موسم کے تابع)۔

روزہ کا مفہوم

جیسا کہ بیان ہوا اسلام تمام کاموں میں انسان کی دونوں جہاں اور اس کے

مضمرات کی بھلائی چاہتا ہے۔ اسلام یہ بتلاتا ہے کہ آخرت میں ہر شخص کا حساب اس دنیا میں اس کے کئے ہوئے کاموں کے لحاظ سے لیا جائے گا۔ وہ لوگ کامیاب اور خوش نصیب ہونگے جو وہاں اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کریں۔ اس دنیا کی حد تک چونکہ انسان جسم اور روح دونوں سے بنا ہے، اس لئے یہاں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ روزہ رکھنے سے روحانی فائدے کیا ہیں اور مادی فائدے کیا۔

ا۔ نیت اور ارادے کی اہمیت:

ہر شخص جانتا ہے کہ ناحق کسی کو قتل کرڈالنا تمام تمدنوں میں برا سمجھا جاتا ہے۔ اور تمام مذاہب ایسے قاتل کو دوزخی قرار دیتے ہیں۔ اور بے گناہ مقتول شہادت کا مرتبہ پاکر جنت کا مستحق ہوتا ہے۔ ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ کسی اقدام کے خلاف حق اور صداقت کی مدافعت ایک فرض ہے اور جو شخص کسی اقدام کرنے والے کو قتل کرڈالتا ہے تو اس کو ایک ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ دنیا اور آخرت کے تمام انعاموں کے مستحق سمجھا جاتا ہے۔ ان دو قسموں کے قتلوں میں کیا صرف نیت کا فرق نہیں؟ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی ڈاکٹر کے مشورہ کی بناء پر کھانے پینے سے باز رہے تو کیا وہ اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو اللہ کے حکم اور اللہ کے لئے کھانا پینا چھوڑدے؟ اللہ ہمارا خالق (پیدا کرنے والا) اور شارع (قانون بنانے والا) ہے جو ہم کو مرنے کے بعد پھر زندہ کرنے والا اور اسی دنیا کے ہمارے کاموں کا حساب طلب کرنے والا ہے۔ جس کسی نے اس کی اطاعت کی ہوگی اس کی خوشنودی حاصل کرے گا۔ اگرچہ یہ کہ ہم اس کے احکام کے اندرونی راز کو نہ سمجھے ہوں۔ جو روزہ وحی کے ذریعہ سے فرض کیا گیا۔ اس کی تعمیل سے اللہ کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔ کونسا روحانی اور اخروی فائدہ اللہ کی ابدی رضامندی کے برابر ہوسکتا ہے؟ نیت اگر مادی فائدے کی ہو، نیز ریا اور اسی قسم کی چیزیں نیت کی صفائی میں خرابی پیدا کرتی ہیں۔ ہمارا روزہ پورے کا

پورا اللہ کی رضا مندی اور اس کے احکام کی تعمیل کے تحت ہونا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کا مشہور ارشاد ہے کہ انما الاعمالُ بالنیات عمل صرف نیتوں سے (جانچے جاتے) ہیں۔ (بخاری)

۲۔ روحانی پہلو:

تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عام طور پر ایک اندھے آدمی کا حافظہ زیادہ اچھا ہوتا ہے اور اس کے بعض حواس آنکھ رکھنے والے لوگوں کے حواس سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی ملکہ یا قابلیت سے کام نہ لیا جائے تو دوسرا ملکہ زیادہ قوی ہوجاتا ہے۔ جسم اور روح کے باہمی تعلقات بھی ایسے ہی ہیں۔ جسم کو کمزور کردینے سے روح طاقتور ہوجاتی ہے۔ جس طرح سے کہ درخت کی بعض شاخوں کو کاٹ دینے سے پھول اور پھل زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔

جب کوئی شخص روزہ رکھتا ہے تو اس کا ضمیر برے کام کے وقت اس کو ملامت کرتا ہے اور وہ بری ترغیبات کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ قابل ہوجاتا ہے۔ پھر روزے سے اللہ کی یاد زیادہ ہوجاتی ہے۔ نیک کاموں کی طرف طبیعت زیادہ مائل ہوتی ہے۔ اللہ کی عبادت کی مٹھاس کا مزہ آنے لگتا ہے۔

''خدا کے مماثل کوئی چیز نہیں'' (قرآن سورت ۴۲، آیت ۱۱)

اس کے باوجود بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ ''خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے''۔ (یعنی اللہ دیکھتا، سنتا، بولتا ہے تو انسان میں بھی یہ صفتیں ہیں۔ اللہ خالق ہے تو انسان بھی صنعت گری کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشابہت خدا کی بعض صفات کی حد تک ہی ہے، نیز یہ کہ اصلی چیز اور اس کے عکس یا فوٹو میں جو فرق ہوگا وہ یہاں بھی ہے)۔ بہر حال قرآن شریف (سورہ ۲، آیت ۱۳۸) میں ہے کہ ''اللہ کا

رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون ہے"۔ اصبغتہ اللہ و من احسن من اللہ صبغتہ) "پس انسان کو چاہیے کے اللہ کے رنگ میں رنگ جائے"۔ اللہ کی ایک صفت، جس کا قرآن میں ذکر ہے پر بہت سی قیمتی کتابیں لکھی ہیں، اپنی ایک بہت مشہور عربی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ میں (جلد۲ ، صفحہ ۳۶) روزہ کے روحانی پہلو سے متعلق انہوں نے بعض دقیقہ رس باتیں بیان کی ہیں، یہاں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

چونکہ حیوانیت کی زیادتی ملکوتی صفات کے ابھرنے میں مانع ہوتی ہے اس لئے یہ ضروری تھا کہ لوگ حیوانیت پر غالب آنے کی کوشش کریں۔ چونکہ حیوانیت کی زیادتی اور اس کے مواد کی کثرت کی جڑ، کھانے پینے اور جنسی لذتوں میں ہے اس لئے روزہ حیوانیت کی زیادیت کو روکنے میں شاندار حصہ لیتا ہے۔ جو کام خوب کھانے سے نہیں ہوتا وہ روزے سے ہوتا ہے۔ پس حیوانیت پر غالب آنے کا طریقہ یہ ہے کہ جن اسباب سے حیوانیت میں اضافہ ہوتا ہے ان اسباب پر قابو حاصل کیا جائے جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انسان میں ملکوتی صفات (فرشتوں جیسی صفتیں) پیدا ہوں وہ تمام اس بات پر متفق ہیں کہ اس (کھانے پینے وغیرہ) میں کمی کی جائے۔ لوگوں میں اس تدبیر کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اگر چہ ان کے مذہبوں میں آپس میں کتنا ہی اختلاف اور ان کے ملکوں میں باہم کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو۔ مزید برآں اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان میں جو حیوانیت ہے وہ انسان کی ملکوتی صفت کے تابع اور ماتحت ہو جائے تا کہ حیوانیت اس ملکوتی صفت کے مشورہ اور حکم کے موجب عمل کرنے لگے۔ اور اسی کے رنگ میں رنگے جائے ۔ یہ ملکوتی صفت اس کی حیوانیت کو ذلیل اور پست رنگ اور برا اثر قبول کرنے سے (جس طرح سے کہ لاکھ مہر کا اثر قبول کرتی ہے) بچاتی ہے (لاکھ گرم ہو کر پگھل جائے اور اس پر مہر کی جائے تو مہر میں جو الفاظ کھدے ہوئے ہوتے ہیں وہی لاکھ پر نقش ہو جاتے ہیں)۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے کہ انسان کی ملکوتی صفت اپنی طبیعت کے موافق کوئی

ایک اچھی چیز کا انتخاب کر کے اس کا انسان کے حیوانی پہلو کو القاء و الہام کیا کرے، یہ نہیں کہ ضد اور ہٹ دھرمی کر کے اس سے بغاوت کرے۔ ملکوتی صفت کو چاہیے کہ اپنے اقتضاء کے موافق امور کا مسلسل اور بار بار حیوانی پہلو کو القاء و الہام کرتی رہے اور حیوانی پہلو ان القاؤں کو قبول بھی کرتا رہے تا آں کہ وہ اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جائے اور اس میں راسخ ہو جائے۔ مذکورہ بالا مقتضیات، جن کا ملکوتی پہلو حکم دیتا ہے اور جن کا حیوانی پہلو خواہی نخواہی نفاذ کرتا ہے، وہ کئی قسم کی ہیں:

۱) یا تو ان کا تعلق اس زمرے سے ہے جس کا باعث ملکوتی پہلو کو انبساط اور مسرت حاصل ہوتی ہے اور حیوانی پہلو کو انقباض اور غم پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کوشش جو کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی ملکوت **Superkingdom** کے ہم آہنگ بننے اور خدا کی جبروت **Super Domination** کے مشاہدے میں غرق رہنے کے لئے ہو۔ یہ بات فرشتہ صفتی سے مخصوص ہے اور حیوانیت اس سے دور، بہت دور رہتی ہے۔

یا

۲) ان کا تعلق اس آمر سے ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں کو چھوڑ دے جو حیوانیت کا اقتضاء ہمیں یا جن سے حیوانیت کو انبساط حاصل ہوتا اور جن کی حیوانیت حد سے زیادہ رغبت کرتی ہے۔ اس آخر الذکر زمرے کی کوشش ہی کا نام ہے روزہ۔ (شاہ ولی اللہؒ کا اقتباس ختم ہوا)

روزے کی خوبیاں بہت ساری ہیں اور نبی کریم ﷺ کی بہت سی حدیثیں بھی ان کا ذکر کرتی ہیں۔ یہاں ان کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، صرف اس قدر بیان کرنا کافی ہے کہ روزہ کا سب سے کم اور سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کھانے، پینے، تمباکو نوشی اور شہوانی خواہشوں سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک رک جائیں۔ اس سے زیادہ اعلیٰ و بلند درجہ کا روزہ یہ ہے کہ تمام شہوانی اور برے قسم کے کام اور خیالات سے بھی رک جائیں۔ ورنہ روزے اور فاقے کے درمیان کوئی فرق

نہ ہوگا۔ فاقہ کشی کی کوئی روحانی اہمیت نہیں ہے روزے اور فاقے کے فرق کا کیا کہنا۔

مادی پہلو:

طالب علم کئی ماہ مسلسل پڑھتے ہیں پھر ان کو موسم گرما کی تعطیل مل جاتی ہے۔ ملازمین ہفتہ میں چھ دن کام کرتے ہیں اور ساتویں دن ان کو آرام اور فرصت کے لئے چھٹی ملتی ہے۔ لوگ تمام دن دماغی اور جسمانی قوت خرچ کرتے ہیں اس کے بعد نیند کا آرام دوسرے دن کے لئے ان کو تازہ دم بنا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ مشین اور اوزار بھی آرام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موٹر کار، ہوائی جہاز، ریل گاڑی وغیرہ کو بھی بہت دور چلنے کے بعد مشین گرم ہو جانے سے مشین ٹھنڈا ہونے تک ٹھہرا دیتے ہیں۔ کیا یہ خیال کرنا معقول نہ ہوگا کہ معدہ اور ہضم کرنے والے اعضا کو بھی آرام لینے کی ضرورت ہے؟ اگر سارا دن داڑھ چلتا رہے تو معدہ بھی چلتا رہے گا اور ہاضمے کے اعضاء کمزور ہو جائیں گے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ موجودہ ڈاکٹر بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ فرانس، سوئزرلینڈ، جرمنی وغیرہ کے ڈاکٹروں کی ایک بڑی تعداد مختلف بیماریوں کا نسخہ بیمار کی بیماری یا جسمانی قوت کے لحاظ سے طویل یا مختصر مدت کے لئے بھوک اور پیاس تجویز کرتی ہے۔ ڈاکٹروں نے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ انسان کے مختلف غدود میں بھوک اور پیاس سے ایک خاص قسم کا لعابی مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مادہ بہت سے جراثم کو مار ڈالتا ہے۔ جو مختلف بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ اعداد و شمار بھی یہ بتلاتے ہیں کہ متعدد قسم کی بیماریاں ان لوگوں میں کم ہوتی ہیں جو ہر سال روزہ رکھتے ہیں۔ بلکہ روزہ درازی عمر کا بھی باعث سمجھا جانے لگا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آدمی کو آب و ہوا اور مقام کی تبدیلی کی بھی وقتاً فوقتاً ضرورت پڑتی ہے۔ جو شخص بیماری سے صحت یاب ہوتا ہے تو اس کو آرام کے لئے ڈاکٹر ایسے مقام پر جانے کا مشورہ دیتے ہیں جو اس کے لئے مستقل رہنے کے مقام

سے جدا ہو۔ زیادہ خوش قسمت لوگ گرمیوں کا مہینہ اپنے وطن کے باہر سرد مقام پر گزارتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہوا کہ اپنے معمول کو وقتاً فوقتاً بدلتے رہنا ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا آرام لینا ہی ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کاشت کار اپنے کھیتوں کو ایک سال آڑ کام میں لاتے ہیں اور زمین کو بھی آرام لینے دیتے ہیں۔ مسلسل کاشت کرتے رہنے سے زمین کو نقصان پہنچتا ہے اسلام سال بھر روزہ رکھنے سے منع کرتا ہے حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی اس کی ممانعت ہے جو روزہ سے روحانی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تجربہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص ہمیشہ روزہ رکھے تو یہ ایک عادت اور ایک فطرت ثانیہ بن جاتی ہے اور ایسا شخص روزہ سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جو وقفے وقفے سے روزہ رکھنے والا شخص حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اگر کوئی شخص چالیس دن سے زیادہ مسلسل روزہ رکھے تو وہ اس کی عادت بن جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص ایک مہینے سے کم روزہ رکھے تو وہ زیادہ اثر نہیں کرتا۔

روزہ رکھنے کی عادت ڈالنے سے بہت سے فوجی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ بعض وقت سپاہی کو غذا اور پانی نہیں ملتا، پھر بھی اس کو دن بھر اور دیر گئے تک رات کو بھی لڑنا پڑتا ہے۔ جس سپاہی کو رمضان کے مہینے کے پورے روزے رکھنے کی عادت ہو اس کے ساتھ ہی ساتھ رات میں تراویح پڑھنے کی، تو ایسا سپاہی ایسے اتفاقاً پیش آنے والے کاموں کے لئے اس سپاہی سے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے جو ایسی مشق کا عادی نہیں ہوتا۔ غیر فوجی (Civil) روزمرہ کی زندگی میں بھی روزہ رکھنے کی عادت سے بے شمار فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ آج کل ہڑتالیں عام ہیں۔ جب آبرسانی کے محکمہ کے ملازم یا روٹی غلہ اور بھاجی ترکاری بیچنے والے ہڑتال کریں تو روزہ رکھنے کا عادی شخص آسانی سے نمٹ لیتا ہے۔

درختوں اور جنگلی جانوروں کا روزہ:

مشاہدہ فطرت پر ہر کسی کو نظر آ سکتا ہے کہ روزہ رکھنے سے جسم کمزور نہیں ہوتا بلکہ اس میں نئی قوت اور نئی جوانی آ جاتی ہے۔ مثلاً خزاں (پت جھڑ کے موسم) میں درخت بھی روزہ رکھتے ہیں اور ان کی ڈالیاں بالکل ننگی ہو جاتی ہیں۔ اس زمانے میں کھانے پینے اور پھلنے پھولنے کی جگہ وہ سو جاتے ہیں، پھر جب بہار کا موسم آتا ہے تو انہیں بہ ظاہر مردہ ٹہنیوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی اور پھول نکلتے ہیں اور کہنہ درخت بھی تراوٹ اور سرسبزی کے باعث شباب کی رعنائی حاصل کر لیتے ہیں۔

یہی بات جنگلی جانوروں پر بھی صادق آتی ہے۔ جن ملکوں میں برفباری ہوتی ہے اور زمین مہینوں تک برف سے ڈھک جاتی ہے تو جانوروں، پرندوں کو چرنے چگنے کے لئے قطعاً کوئی چیز نہیں ملتی۔ جو جانور، چونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح ذخیرہ نہیں کرتے، انہیں روزہ رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں وہ سرما زدہ (Hibernation) ہو کر کئی مہینے تک نہ کھاتے ہیں نہ پیتے بلکہ سو سے جاتے ہیں۔ سردی ختم ہو کر جب بہار کا موسم آتا ہے تو ان جانوروں کے پرانے بال، پر یا کھال جھڑ جاتے ہیں اور نئے نکل آتے ہیں جن کی تراوٹ اور تازگی کے باعث پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وہی روزے کے قبل کے پرانے جانور ہیں، ان کا اعادہ شباب ان کی جنسی رغبت میں بھی نظر آنے لگتا ہے۔

یہ ہیں روزہ کی کرامات:

اس بیان کو اس بات کے اظہار پر ختم کیا جاتا ہے کہ جو لوگ ڈاکٹر کے مشورے پر طبی وجوہ سے یا کسی اور مجبوری کی بناء پر روزہ رکھتے ہیں تو ان کو روزہ کا مادی فائدہ تو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ان کی نیت چونکہ روحانی تلاش کی نہیں ہوتی اس لئے ان کو کوئی روحانی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ مسلمان اللہ کے حکم کی تعمیل کی نیت سے

روزہ رکھتے ہیں۔اس لئے ان کا روزہ عبادت و طاعت بنتا اور انہیں اس کا ثواب بھی ملتا ہے۔ اور مزید برآں وہ روزہ کے جسمانی اور مادی فائدوں سے بھی محروم نہیں رہتے۔مختصر یہ کہ کسی بھی نقطہ نظر سے مسلمان کے روزہ رکھنے کے طریقہ پر غور کریں تو وہ دوسرے تمدنوں کے روزہ رکھنے کے طریقے سے فوقیت رکھتا نظر آتا ہے۔

اسلامی روزے کے بعض علمی تفصیلات

روزہ کا زمانہ:

اس امر کا اظہار کیا جا چکا ہے کہ رمضان کے پورے مہینے میں روزہ رکھنے کا قرآن حکم دیتا ہے۔یہ ہجری جنتری کا مہینہ ہے اور مسلمان نبی کریم ﷺ کے زمانے سے ہجری تقویم پر عمل کرتے ہیں۔یہ سال کا نواں مہینہ ہے۔ ہجری سال کی بنیاد قمری مہینوں پر ہے۔ ہر مہینہ مغربی افق پر غروب آفتاب کے وقت نئے چاند کے نظر آنے سے شروع ہوتا ہے اور بہ صورت ہر انتیسویں یا تیسویں دن پیش آتی ہے اس سے بحذف کسور ۳۵۵ دن کا سال بنتا ہے۔عیسوی سنہ آفتاب کے مہینوں کا سنہ ہے اور گریگوری کی جنتری پر عمل کرنے سے عام طور پر سال ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رمضان کا مہینہ ہر سال گزشتہ مہینے سے کوئی گیارہ دن پہلے آتا ہے۔فرض کیجیے کہ:

یکم رمضان سنہ ۱۳۹۱ھ کو ۲۲/ اکتوبر سنہ ۱۹۷۱ء

سنہ ۱۳۹۲ھ کو ۱۰/ اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء

سنہ ۱۳۹۳ھ کو ۲۹/ ستمبر سنہ ۱۹۷۳ء

سنہ ۱۳۹۴ھ کو ۱۹/ ستمبر سنہ ۱۹۷۴ء

سنہ ۱۳۹۵ھ کو ۸/ ستمبر سنہ ۱۹۷۵ء ...... ہوگا اور اسی طرح آگے

بعض وقت مشرق اور مغرب کے ملکوں کے درمیان ایک دن کا فرق ہوسکتا ہے۔ کیونکہ تمام چیزوں کا دارومدار غروبِ آفتاب کے وقت کسی ملک کے افق پر چاند کے بننے اور پیدا ہونے یعنی نظر آنے پر منحصر ہے۔ چاند زمین کے اطراف اپنی گردش کے وقت بنتا ہے۔ اگر وقت مقررہ یعنی غروب آفتاب تک چاند کی پیدائش نہ ہو بلکہ چند گھنٹے یا چند منٹ بعد بھی ہو تو اس دن نیا چاند نظر نہیں آتا، اسی لیے نیا مہینہ ایک دن دیر سے شروع ہوتا ہے۔ چونکہ خود قدرت یکسانیت نہیں چاہتی، اس لیے اسلام یہ نہیں چاہتا کہ دنیا کہ تمام مسلمان اسی دن روزہ رکھیں اس سے کم اسلام یہ چاہتا ہے کہ روزہ ایک ہی وقت شروع کریں۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر سوئٹزرلینڈ میں دن ہو تو مغربی امریکہ میں رات۔ ہر ہزار میل کے فاصلے پر ایک گھنٹے کا فرق ہو جاتا ہے۔ ان ہی وجوہ سے رمضان کا مہینہ باری باری سے سال کے تمام موسموں میں آتا ہے اس سے ایک اور پیچیدگی پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ زمین کے گول ہونے اور زمین کے جھکے ہوئے محور کی وجہ سے وقت واحد میں دو موسم ہوتے ہیں۔ (۱) اگر خط استوا کے اوپر کے ملکوں میں جاڑہ ہو تو ٹھیک اسی وقت خط استواء کے نیچے جو ملک ہیں وہاں گرمی کا موسم ہوگا۔ (۲) اگر خط استواء اور اس کے قریب کے ملکوں میں دن اور رات سال بھر عملی طور پر برابر ہوتے ہیں تو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے قریب ایسا نہیں ہوتا خط استواء سے جتنا قطب کی طرف بڑھتے جائیں، گرمیوں میں دن لمبا اور رات چھوٹی ہوگی اور سردیوں میں رات لمبی اور دن چھوٹا ہوگا اور عین قطب پر دو ایام تعادل (Equinox) کو چھوڑ کر مسلسل چھ مہینے دن رہتا ہے پھر مسلسل چھ مہینے رات آتی ہے، اس سے بہت نیچے فن لینڈ، ناروے، شمالی کینیڈا میں۔

۷۲ درجے عرض بلد (Latitude) پر مسلسل ۸۸ دن

۷۰ درجے.............................۶۲ دن

۶۸ درجے.............................۵۲ دن

۶۶ درجے.......................۱۷ دن

آفتاب نہیں ڈوبتا۔ وہاں روزہ کس طرح رکھنا چاہئے؟ وہاں رمضان ہر ۳۵۵ دن کے بعد شمار کریں، حتیٰ کہ جمعہ پھر ہر ساتوں دن شمار کریں تو باقی دنیا سے فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ وہاں رہنے والے زکوٰۃ اور ٹیکس کس طرح دیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ ناروے، فنلینڈ کے مسلمان قطب شمالی کے چھ مہینے تو کیا، خود اپنے ہاں کے مسلسل سترہ دن بھی روزہ نہیں رکھ سکتے۔

تقریباً ہزار برس سے مسلمان فقہاء نے اس کا جواب دے رکھا ہے وہ یہ کہ دنیا کو معتدل اور غیر معتدل دو حصوں میں تقسیم کیا جائے اور غیر معتدل علاقے کی آخری حد کے اوقات کو ملحوظ رکھیں۔ پرانے علماء کے ہاں تفصیل نہیں ملی، لیکن کوئی چالیس پچاس سال قبل مجلس علمائے دکن نے ۴۵ درجہ عرض بلد کو حد فاصل قرار دیا شمال میں موکڈن، ارمچی، بکارسٹ، بورڈو، ہالیفاکس اور پورٹلینڈ سے گزرتا ہے اور جنوب میں چلی کے شہر بالماسیڈا سے (اس کی ضرورت ہندوستان والوں کو نہیں، اس لئے مزید تفصیلیں یہاں حذف کی جاتی ہیں.....خواہشمند Introduction to Islam نامی کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔

روزہ کا طریقہ:

روزہ کا مطلب یہ ہے کہ روزے کی نیت کریں اور کھانے پینے سے صبح صادق (یعنی طلوع آفتاب سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے) سے غروب آفتاب تک باز رہیں۔

غروب آفتاب سے صبح صادق تک کے درمیانی عرصہ میں ہماری معمولی ضروریات اور خواہشات پر کوئی روک نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ازدواجی زندگی بھی منع نہیں ہے۔ غذا کے متعلق ہمارے مقدس پیغمبر کا حکم ہے کہ ہر شخص غروب آفتاب کے وقت افطار کرے اور پھر دوبارہ صبح صادق سے پہلے سحری کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جس

طرح روزہ شروع کرتے وقت روزے کی نیت ضروری ہے اسی طرح غروب آفتاب کے وقت روزہ کھولنے کی نیت بھی ضروری ہے جو یہ ہے۔ "اے خدا میں نے تیرے لئے روزہ رکھا۔ میں تجھ پر ایمان لایا۔ تجھ پر توکل کرتا ہوں۔ اور تیرے رزق سے روزہ کھولتا ہوں۔ یا اللہ میری طرف سے اس کو قبول کر۔"

یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص بھول کر کچھ کھا یا پی لے۔ اس سے اس دن کے روزے پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ روزہ صحیح ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی اس کو یاد آ جائے کہ آج روزے کا دن ہے تو کھانا پینا وغیرہ چھوڑ دے۔ روزہ رکھ کر نہانے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ جمعے کی نماز کے لیے نہانے کی تاکید کی گئی ہے۔ وضو کرتے وقت پانی سے منہ بھی دھونا پڑتا ہے کلی کرنے سے منہ میں جو تری آ جاتی ہے اس سے بھی روزہ خراب نہیں ہوتا۔ نابالغ روزے سے مستثنیٰ ہیں۔ ضعیف اور کمزور بوڑھے اگر مالدار ہوں تو ہر ایک دن کے روزے کے معاوضے میں ایک غریب کو کھانا کھلائیں ان کے علاوہ ہر مسلمان پر، مرد ہو کہ عورت رمضان کے پورے مہینے میں روزہ رکھنا مذہبی فرض ہے۔ بیمار اور مسافر کو اجازت دی گئی ہے کہ سہولت بخش وقت آنے تک روزہ ملتوی رکھیں۔ بعد میں قضا کریں۔ عورتوں کو بھی انکے ماہواری ایام میں روزہ نہ رکھنا چاہئے۔ البتہ ان دنوں کے روزوں کو قضاء کرنا چاہئے۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ نفل روزہ صرف ایک دن کے لئے نہ رکھیں۔ کم سے کم دو دن ہو۔ صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنے کی بھی ممانعت ہے۔ عام طور پر روزمرہ کے کاروبار کو متاثر نہیں کرتا۔ روزے کو کاہلی اور کام چوری کا بہانہ نہ بنانا چاہئے۔ اسلام یہ بات پسند نہیں کرتا اور مطالبہ بھی نہیں کرتا کہ تمام رات جاگتے رہیں اور صبح کو سوتے رہیں یا بیکاری میں گزاریں۔ روزہ کا مطلب یہ ہے کہ پہلے سے زیادہ محنت کریں۔ روزمرہ کے تمام کام اور فرائض انجام دیں اور یہ تمام کام غذا، کھانے پینے کی عدم موجودگی میں بھوکے پیاسے رہ کر کرنا ہوگا جتنا زیادہ نیکی کریں اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔

متفرقات:

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ قرآن شریف کی سب سے پہلی وحی پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر رمضان کے مہینے میں آئی اس لیے یہ بات بڑی موزوں ہوگی کہ روزہ کی حالت میں زیادہ وقت قرآن کریم کی تلاوت میں صرف کریں۔ جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کے لیے دنیا کی ہر ایک اہم زبان میں قرآن کریم کے ترجمے موجود ہیں۔ کسی سچے اور متقی مسلمان کا ترجمہ ہی صحیح ہوسکتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس مہینے میں پورے قرآن کا ایک ختم کرنا چاہیے۔ روزآنہ ایک پارہ پڑھنے سے پورا قرآن ختم ہوسکتا ہے۔

روزے کے مہینے کے ختم پر شوال کے مہینے کے پہلے دن عظیم الشان عید ہوتی ہے۔ صبح میں باجماعت نماز عید پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد امام خطبہ پڑھتے ہیں۔ چونکہ یہ روزے کے مہینے کا اختتام ہے اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارش کی ہے کہ لوگ اس مقام کو جہاں باجماعت نماز پڑھی جاتی ہے جانے سے پہلے ناشتہ کرلیں، ناشتہ کرکے عیدگاہ جانا چاہیے۔

یہ بھی مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ ہر شخص اس دن فطرہ یعنی غریبوں کے لیے غذا مہیا کرے۔ ابتدائے اسلام میں نہ صرف کھجور، کشمش اور ایسی ہی چیزیں اس مقصد کے لیے تقسیم کی جاتی تھیں بلکہ گیہوں چاول وغیرہ بھی دیئے جاتے تھے۔ غرض یہ کہ خیرات دینے کی ہمت افزائی کی جائے جو کسی طرح دکھاوے کے لیے اور ریا کے لیے نہ ہو۔

حدیث میں ہے کہ خداوند ذوالجلال فرماتا ہے، میں نے ہر ایک نیکی کا بدلہ دس سے سات سو گنا تک مقرر کیا ہے۔ (خلوص نیت کے لحاظ سے) لیکن روزہ اس سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔ (روزہ رکھنے سے صرف دس گنا یا سات سو گنا ثواب نہیں ملتا بلکہ) روزہ میرے لیے ہے اور میں روزہ کی جزا دیتا ہوں کیونکہ بندہ میرے لیے اپنی خواہش اور اپنی غذا چھوڑ دیتا ہے۔ (روزہ رکھنے سے اللہ کی قربت ملتی ہے اور اس کے مقابل ثواب اور بہشت کچھ حقیقت نہیں رکھتے)

محترمہ زیبا افتخار، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی میں گزشتہ دو سالوں سے معاون لیکچرار کے طور پر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ان کے ایم۔فل/پی ایچ۔ڈی کے مقالہ کا عنوان "ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی فن تاریخ نویسی: ایک فنی اور تجزیاتی جائزہ" ہے۔ وہ اپنا یہ مقالہ سابق صدر شعبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر صاحب کی نگرانی میں لکھ رہی ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے مرتب کردہ، ڈاکٹر حمید اللہ کے ان پُر مغز مقالات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اسلامی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے لکھے اور جو ہندوستان کے مؤقر جرائد میں شائع ہوئے اور پاکستان میں عام دستیاب نہیں ہیں۔ اسلامی تاریخ و ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے طلباء و اساتذہ اور دیگر قارئین اسے ایک مفید مجموعہ مقالات پائیں گے۔

ادارہ

ISBN 969-8448-56-X

مقالاتِ حمید اللہ

اسلامی تاریخ وثقافت پر ڈاکٹر حمید اللہ کے

پُرمغز مقالات کا مجموعہ

مرتبہ

زیبا افتخار

قرطاس